V.5 Kashmir

ریاست کا ساٹھ سالہ سیاسی دور

کشمیر کا
سیاسی انقلاب



تحریر

شبنم قیوم

Shabnam Qaiyum

V.5

کشمیر کا

سیاسی انقلاب

جلد پنجم

v.5

از ابتدائے جنوری ۱۹۷۵ء تا ستمبر ۱۹۸۲ء

ایک تاریخ

ایک تحریک

ایک دستاویز

شبنم قیوم

Shabnam Qaiyum

کاشانۂ ادب بوچھوارہ ڈلگیٹ سرینگر کشمیر

بار اوّل : ۱۹۸۹ء

کتابت : وجیہہ رقم رامپوری

طباعت : جے، کے، آفسیٹ پرنٹرز دہلی

سرورق : سجود سیلانی

قیمت: -/50 روپے

ناشر :

کشمیر بک سینٹر امیراکدل سرینگر کشمیر

انتساب!

اُن کشمیری عوام کے نام!

جنھوں نے اندھی عقیدت میں مبتلا ہوکر اپنی جہالت کا مظاہرہ کرکے اُن ہاتھوں کو مضبوط کیا جن کے بارے میں اقبالؔ نے کہا تھا:-

تُوڑ اُس دستِ جفا کیش کو یارب جس نے
رُوحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

(شبنم قیّوم)

حرفِ اول

سنو اے ساکنانِ ارضِ کشمیر　　صدا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا ایک لمحہ ہے بہتر　　غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

غلامی سے آزادی تک کا راستہ دشوار، سنگلاخ اور پیچدار بھی ہے لیکن آسان بھی ——! کہا گیا ہے۔

دشوار گذار راہوں سے گزرنے والی قومیں غلامی کے بندھن توڑ کر جب آزادی کی سانس لیتی ہیں تو اُن کا مستقبل تابناک ہوتا ہے بلکہ ان کی قربانیاں ان کے گرد ایسا حصار کھینچتی ہیں کہ پہاڑ بھی سرنگوں ہو کر ان کے قدموں میں آجاتے ہیں۔ ایسی قوم جب کبھی اور جہاں کہیں اپنے کسی ارادے کا عزم کر لیتی ہے تو اُس کا جوش جنون عمل کی راہ اختیار کر لیتا ہے لیکن دوسروں پر نگاہیں رکھنے اور ساحل پر کھڑے موجوں پر تکیہ کرنے والے آزادی کی طلبگار قوم کی جھولی میں اگر آزادی ڈال بھی دی جائے تو یہ آزادی دوسروں کے ہاتھوں کی محتاج رہتی ہے

سال ہوں، دن ہوں یا مہینے، قوموں کی تاریخ میں ان کی اہمیت مؤرّخ کے لیے ہمیشہ سنگ میل کی طرح نمایاں رہتی ہے۔ آئندہ نسلیں اسی آئینے میں آبا و اجداد کے نقش و نگار تلاش کرتی ہیں اور اپنے مقصود کے انہی لکیروں پر سفر کرتی ہیں۔ اگر ماضی کے سن و سال تاریخ کے سپرد کرتے وقت احتیاط کا دامن چھوڑ جائیں تو پھر یہ اوراق قوموں کے مقدر کو پریشان کر دیتے ہیں اور ایسی ایک ٹھوکر سے مستقبل کی ساری عمارت ڈھیر ہو جاتی ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی آزادی موسم کے ساتھ بدلتی ہے، جس طرح کشمیر کا

موسم بے اعتبار رہے اسی طرح یہاں کی آزادی بھی اپنا اعتبار کھو چکی ہے۔ یوں تو ہم بھی برصغیر کے ساتھ آزاد ہوئے اور تحریکِ حریت میں جس ڈوگرہ شاہی سے ہم برسرِ پیکار تھے، وہ برصغیر کی تقسیم کے بعد غلامی کا دفتر بند کر کے چلی گئی ۱۹۴۷ء میں عوامی راج کے ساتھ ہم سے کہا گیا کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک ہم بالکل آزاد تھے۔ لیکن پھر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ہم سے کہا گیا نہیں تم آزاد نہیں بلکہ غلام ہو، غلامی کا جو نیا احساس دلایا گیا اس نے ہمیں ایک بار پھر اسی ڈگر پر لا کھڑا کیا جہاں پر پہلے تھے، غلامی کا تقاضا ہے کہ اس کے خلاف لڑو، اور تب تک لڑو جب تک کہ تم اسے شکست نہ دو۔ چنانچہ غلامی کے خلاف لڑنے کے لیے ہم میدان کارزار میں اُتر آئے، برسوں بیت گئے، کافی مالی اور جانی نقصان اٹھانے کے بعد ہم سے کہا گیا تمہاری قربانی بار آور ثابت ہوئی اور تم آزاد ہو گئے۔

آزادی کی اس لڑائی میں کون جیتا اور کون ہارا ــــ ؟ یہ الگ بات ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے؟ کیا ہم واقعی آزاد ہیں، اگر ہم ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوئے تھے تو ۱۹۵۳ء میں ہمیں غلام کس نے بنا دیا۔ اگر آج ۱۹۵۳ء سے بھی بدتر سیاسی صورتحال ہے تو ہم کیسے آزاد ہیں

کشمیر کی سیاست کا سیمابی مزاج آزادی کے مزاج سے ہم آہنگ لگتا ہے اور جموں و کشمیر کی سیاست اتنی تیزی سے بدلتی رہتی ہے کہ یہ کہنا کہ ہم کس گھڑی آزاد اور کس گھڑی غلام ہیں وثوق سے کہنا مشکل ہے۔

جو لوگ جس قسم کے ماحول میں رہتے ہیں اسی قسم کے اثرات ان کے خیالات اور جذبات پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ سائینسی ایجادات اور مواصلات کی ترقی نے ملکوں اور قوموں کے درمیان جو فاصلے مٹا دیئے اس کی اثر پذیری سے اور تو اور سیاست بھی بچ نہ سکی، دہلی اور سرینگر کے درمیان زمینی سفر دو دن کا اور ہوائی سفر ایک گھنٹہ کا ہے۔ لیکن دہلی اور سرینگر کے درمیان مسافر چاہے زمینی ہو یا ہوائی وہ اپنے کپڑے بدل دیتا ہے۔ سرینگر سے دہلی جائے گا تو گرم کپڑے اتار دے گا اور اگر دہلی سے سرینگر آئے گا تو سرد کپڑے اتار دے گا۔ چونکہ یہاں کا موسم چولے بدلتا رہتا ہے۔ لہذا سیاست نے بہت حد تک اس کا اثر قبول کر لیا ہے۔

اس رائے سے سبھی متفق ہیں کہ انسان پیدائش سے ہی آزاد رہنے کا متمنی ہے اور وہ کسی کا غلام بن کر اپنی آزادی سے محروم ہونا نہیں چاہتا ہے انسان کی فطرت میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے وہ زندگی میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل

کرنے کی تمنا رکھتا ہے۔ انسان کی جبلت میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ و بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لیے اپنی عقل و شعور سے کام لیتا ہے،

- چونکہ حیوان عقل اور شعور سے عاری ہے لہٰذا مرتبہ حاصل کرنے یا غلامی و آزادی کی تمیز کرنے کی اُسے نہ کوئی ضرورت ہے نہ مجبوری۔

غلامی ایک ایسی گٹھڑی ہے جس میں بے شرمی، بے حرمتی اور بے عزتی باندھی گئی ہوتی ہے۔ اور غلام شخص اس گٹھری کو اثاثہ سمجھ کر اپنے ساتھ لیے رہتا ہے۔ غلامی ایک ایسا بوجھ ہے جس کے تلے انسان کا دم گھٹتا رہتا ہے۔ غلامی میں احساس سو جاتا ہے ضمیر مر جاتا ہے، اور ایمان کمزور ہو جاتا ہے۔ آزادی میں انسان اپنا حق پہچان لیتا ہے اور اپنے حقوق کی استطاعت رکھتا ہے، آزادی انسان کے اندر سے ڈر اور خوف نکال دیتی ہے جبکہ غلامی ایک فرد کا ہی نہیں بلکہ قوموں کا کردار مایوسی کی حد تک متاثر کر دیتا ہے، غلامی کا ربط محکومیت سے ہے اور محکومیت انسانی قدر و منزلت کو مٹا کر رکھ دیتی ہے۔ مفکروں کا کہنا ہے آزاد زندگی کے چند لمحات غلامانہ زندگی کے سالہا سال سے بہتر اور افضل ہیں۔

غلامی کی زنجیر کو لعنت بھی کہا جاتا ہے جبکہ آزادی ایک عظیم نعمت سے تعبیر کی جاتی ہے لعنت اور نعمت کے درمیان جو تفاوت ہے وہ غلامی اور آزادی کو منقسم کرتا ہے۔

غلامی میں آزادی کے حصول کی تڑپ احساس بیداری کی نشانی ہے، جو فرد یا افراد اس احساس سے سرشار ہیں وہ غلامی کا جوا اتار پھینکتے ہیں، دنیا میں آزادی کی جنگ ایک زمانہ سے جاری ہے اور اب تک بے شمار قومیں آزاد ہو بھی چکی ہیں۔

انسان جو فطرتاً آزادی کا متلاشی ہے۔ اس کے پیچھے اس کا یہ مقصد کارفرما ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی متعین کر سکے۔ اور زندگی کے بال و پر کھول کر اپنے لیے وہی مقام حاصل کر سکے جو اللہ نے اس کے لیے ودیعت کیا ہے۔

جس کسی انسان میں آزادی اور غلامی میں فرق کرنے کی تمیز نہ ہو۔ اس کو انسانوں کے زمرے میں شامل کرنا یقیناً انسان کی توہین کے مترادف ہے، غلامی پر وہی شخص رضامند ہو سکتا ہے جس کا احساس مر چکا ہو جس کے ضمیر پر مردنی چھائی ہوئی ہو اور جس کے ایمان میں لغزش آ چکی ہو، بے شک آزادی حاصل کرنے کی شئے ہے۔ اور جو اس

شئے کو حاصل کر کے پاتا ہے وہ اس کی قدر و قیمت جان جاتا ہے آزادی کی خاطر عزیز جانیں قربان کرنا پڑتی ہیں۔ تختہ دار پر چڑھنا پڑتا ہے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں، اور تب کہیں جا کر آزادی کی وہ نعمت حاصل کی جاتی ہے جس کے سامنے تمام نعمتیں ہیچ ہیں۔

غلامی اور آزادی کے بارے میں یہ تفاوت ریاست کے عوام میں اُجاگر کرنے کے لیے عوامی رہنما میدان کارزار میں اُتر آئے اور عوام کو حصولِ آزادی کے لیے للکارنے لگے۔ عوام نے آزادی کے معنی و مطلب سمجھ کر اس کے حصول کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا، عوام نے مالی اور جانی قربانی بھی دی، وہ تختۂ دار پر بھی چڑھے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کر گئے۔ عوام نے یہ سب کچھ برداشت کیا، تب جا کر ان کی آزادی کا سورج طلوع ہوا، آزادی کے سورج کی اس روشنی اور تمازت سے ابھی ہم بارآور بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ بادلوں نے اس سورج کو ڈھانپ لیا۔ ان بادلوں کے ہٹنے کے انتظار میں برسوں بیتے ان برسوں میں انتظار کی لذّت میں ہم ایسے محو ہو گئے کہ ہمارے سامنے آزادی اور غلامی کا تصور ہی مٹ گیا۔

ہم سے کہا جا رہا ہے کہ بادل چھٹ گئے ہیں اور سورج پھر نمودار ہوا ہے، لیکن جن لوگوں کے نزدیک آزادی اور غلامی کا تصوّر ہی مٹ گیا ہو، ان کے سامنے آزادی کا ڈھنڈورا پیٹنا بھینس کے آگے بین بجانے کے برابر ہے۔

ریاست جموں و کشمیر واحد ریاست ہے جہاں کرسی بدلنے کے ساتھ آزادی بھی بدل جاتی ہے۔ اور آزادی کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اگر رہنمایانِ قوم کرسی پر براجمان ہیں تو کہا جا رہا ہے اس کی حفاظت کرو کیونکہ بڑی قربانیوں کے بعد یہ آزادی حاصل کی گئی ہے ہاں اگر وہ کرسی پر نہیں ہیں تو کہا جاتا ہے ہم غلام بن کر نہیں رہیں گے آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے، اور یہ آزادی حاصل کر کے ہی ہم رہیں گے۔ ان حالات میں یہاں کے باشندے حتمی طور پر یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں کہ ہم آزاد ہیں یا غلام ــــ ؟

برصغیر کی تقسیم کے بعد آج تک یہاں کے عوام کو آزادی اور غلامی کے مخمصے میں اس قدر اُلجھایا گیا کہ یہ فیصلہ کرنا بہت ہی مشکل ہے کہ آزادی کب آئی اور غلامی کب گئی۔

ریاست میں جب سیاسی بیداری کا آغاز ہوا تو اس وقت یہاں کی زبوں حالی پسماندگی اور غربت کا سارا الزام اسی غلامی پر ڈالا گیا جس غلامی کا طوق ہماری گردنوں میں اس وقت ڈالا گیا جب یہاں کے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ڈوگروں کے ہاتھوں بیچ دیا گیا۔ ڈوگرہ رجواڑوں نے یہاں کی اکثریت کو انسان کے بجائے ڈھور ڈنگر سمجھ لیا، اس صورتِ حال کے خلاف آخر کار ایک احتجاج ہوا جس نے تصادم کی صورت اختیار کر لی، عوام نے بے شمار قربانیوں کے بعد غلامی کا چولا اُتار پھینکا۔ آزادی کا جامہ اوڑھنا چاہا تو آواز آئی ٹھہرو ــــ! ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ تم آزاد ہو یا غلام ؟ قبل اس کے کہ کوئی حتمی فیصلہ ہو جاتا، ایک بار اور اس قوم کا سودا ہوا ایک بار اور اس کا بھاؤ مقرر کیا گیا۔

پہلے بیعنامۂ امرتسر کے تحت ہماری خرید و فروخت ہوئی، پھر بیعنامہ دہلی ہوا۔ پہلے سودے میں بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں غیر تھے۔ دوسرے سودے میں اپنے ہی اپنے تھے ایک وہ تھا جس نے عوام کے اندر آزادی کا احساس جگایا اور دوسرا وہ جو طویل جدوجہد کے بعد آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوا تھا۔

خرید و فروخت کا یہ سودا کچھ اس انداز سے ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی سب لوگ اس انتظار میں رہے کہ کوئی ہم سے کہہ دے۔ ہم آزاد ہیں یا غلام ! اس انتظار کے دوران صبح کو کہا گیا تم آزاد ہو اور شام کو کہا گیا نہیں ابھی تم غلام ہو، شام کو آزادی کا مژدہ سُنایا گیا تو صبح کو غلامی کی خبر دی گئی۔ اس صبح و شام کے تضاد نے ہمیں اتنا بے بہرہ کر دیا ہے کہ ہم آزادی اور غلامی کی تمیز ہی کھو بیٹھے۔ اور یہ تمیز کھونا ایسی بدقسمتی ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں

شبنم قیوم



کشمیر ایکارڈ کے بانی

مسز اندرا گاندھی - شیخ محمد عبداللہ

باب (۱)

دہلی اور کشمیر کے درمیان بات چیت

کشمیر ایکارڈ کے لیے مختلف پڑاؤ

آبروئے ضبط و خودداری فنا کرنی پڑی

ہم کو جینے کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی

جُز :-　　　　صفحہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ہندوستان کے ساتھ کشمیر ایکارڈ کی تکمیل

پاکستان کا مخالفانہ ردِّعمل

مسئلہ کشمیر کے بارے میں ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک شیخ محمد عبداللہ نے اتنے متضاد بیانات دیئے کہ اگر کسی کمپیوٹر پہ اس کا حساب رکھدیا گیا ہوتا تو وہ کمپیوٹر بھی پریشان ہوگیا ہوتا اور پریشانی سے تنگ آکر اس نے بھی اپنا سر کسی دیوار کے ساتھ ٹکرا کر پھوڑ لیا ہوتا، چونکہ عام کشمیری مسلمان کمپیوٹر کے مقابلے میں ذرہ بھر بھی حساس نہیں، اس لیے نہ ہی پریشان ہوا اور نہ ہی اس نے اپنا سر پھوڑا۔

کشمیری قوم کے ہر دل عزیز لیڈر سرینگر میں جو بیان دیتے جموں جاکر اس کو بدل دیتے اور دہلی میں اس کی تردید کرتے، دہلی میں جو بیان دیتے وہ جموں میں بدلتے اور سرینگر آکر اس کا حلیہ ہی بدل جاتا۔

شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی زندگی کا تضاد اور ان کے متضاد بیانات نے کشمیری عوام کو اتنا الجھا دیا کہ آج اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی بیشتر لوگ نہیں سلجھتے نہ جانے کبھی یہ سلجھیں گے بھی کہ نہیں۔

ایک جگہ مسئلہ کشمیر میں پاکستان کو فریق بنا دیا تو دوسری جگہ اس کی ٹانگیں کھینچ لیں تیسری جگہ اسے اُٹھا کر دور پھینک دیا، حد تو یہ ہے کہ دور پھینک دینے کے بعد مصلحتاً اسے پھر اٹھا کر اپنے پاس لاکر رکھدیا۔

کشمیری عوام کے ساتھ ساتھ جب انھوں نے پاکستان کو بھی پریشان کر دیا تو ۲۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے کیمبل پور کے جلسہ عام میں



(ذوالفقار علی بھٹو تقریر کرتے ہوئے)

عوام سے خطاب کے دوران فر...

"شیخ محمد عبداللہ اب تک دو بار غلطی کر چکے ہیں اور اگر انھوں نے تیسری غلطی کی تو یہ اُن کی آخری غلطی ہوگی ......!"

اس کے بعد ۲۹ رجنوری کو گجرات کے دورے کے دوران ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے جموں و کشمیر کے دونوں طرف رہنے والے عوام اور پاکستان کے عوام سے اپیل کی کہ وہ اندرا عبداللہ معاہدے کا اعلان ہو جانے کے بعد آنے والے پہلے جمعہ کو ایک دن کی احتجاجی ہڑتال کریں۔

انھوں نے مزید کہا اس سمجھوتہ سے مسئلہ کشمیر حل نہیں ہوگا اور پاکستان اپنے اس موقف سے دستبردار نہیں ہوگا، مسئلہ کشمیر حق خودارادیت کی بنیاد پر انجمن اقوام متحدہ کی پاس شدہ قراردادوں کے مطابق حل ہونا چاہیے، اندرا عبداللہ معاہدے سے بین الاقوامی عہد و پیمان اور فیصلے متاثر نہیں ہوں گے یہ ایک گٹھ جوڑ ہے۔ شیخ عبداللہ نے اب تک دو غلطیاں کی ہیں اور یہ اُن کی تیسری آخری اور سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ شیخ صاحب قدرتی راستہ کھولنے کی باتیں کر رہے ہیں

وہ قدرتی راستہ پر آجائیں تو قدرتی راستہ بھی کھل سکتا ہے۔



"میرا ہڑتال کرانے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ معاہدہ ہمیں منظور نہیں۔"

شیخ عبداللہ نے ذوالفقار علی بھٹو کے اس بیان سے سیخ پا ہو کر جہاں اُسے فضا کو زہر آلود بنانے والا بیان قرار دے کر پاکستانی لیڈروں پر سخت ترین الفاظ میں تنقید کی وہاں عوامی مجلسِ عمل کے سربراہ مولوی فاروق نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے رائے شماری کے موقف کو دہرایا۔

۱۴ رفروری کو انھوں نے جامع مسجد کے اجلاس میں فرمایا:

"کسی جماعت یا لیڈر کے موقف بدلنے یا رائے شماری کے نصب العین سے دست بردار ہونے سے عوامی حقوق سلب نہیں ہو سکتے۔ وزارتی تبدیلی مسئلہ کشمیر کا حل نہیں ہو سکتا۔"

مولوی فاروق نے وزیر اعظم پاکستان کی ہڑتال کی کال کو حق بجانب قرار دے کر اس پر عمل کرنے کا اِعادہ کیا، جماعتِ اسلامی نے بھی اندرا عبداللہ سمجھوتے کو گٹھ جوڑ کہہ کر اسے مسترد کیا اور واضح کر دیا کہ:

"اگر بھارت نے اس مسئلہ کو سلامتی کونسل کی قراردوں اور شملہ سمجھوتہ کے تحت متنازعہ مان لیا ہے تو اُسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی فرد واحد کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اُسے دفنانے کی کوشش کرے، اس مسئلہ کو ہندوستان پاکستان اور کشمیری عوام باہمی مشورے سے حل کر سکتے ہیں۔"

جموں و کشمیر کی پیوپلز لیگ جس کا قیام یکم اکتوبر ۱۹۷۴ء عمل میں آیا تھا اس نے اس گٹھ جوڑ کے بارے میں شدید ردّ عمل دکھایا۔ پیوپلز لیگ کے جوشیلے جوان فضل الحق قریشی، نذیر احمد وانی، اسلم وانی، عبدالحمید سٹھان، شبیر احمد شاہ، فاروق احمد بٹ، محمد مصدق عادل، محمد اعظم انقلابی محمد فاروق رحمانی اور حمید اللہ بٹ وغیرہ نے پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل پر ہڑتال پر نہ صرف لبیک کہا بلکہ عوام سے اس میں بھرپور حصہ لینے کی اپیل کی۔

محاذ رائے شماری کی طرف سے مجاہد منزل میں آئے دن اس معاہدے کے بارے میں بیانات جاری ہوتے رہے، کبھی یہ بیانات مرزا افضل بیگ اور کبھی شیخ عبداللہ کی طرف سے داغے جاتے، ان بیانات میں عوام کا ذہن پراگندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے ہڑتال کی کال ناکام بنانے اور شیخ عبداللہ کو وزارت کی منتقلی کے دوران عوام کی طرف سے محاذ رائے شماری کے لیڈروں کے خلاف مظاہروں کو توڑ کرنے کے لیے چند مقامی اخباروں کو خرید لیا گیا اور ان کی طرف سے خبروں کے ذریعے یہ پروپیگنڈا کرایا گیا:

"شیخ صاحب کے بیشتر مطالبات تسلیم کر لیے گئے

صدر ریاست اور وزیر اعظم کے عہدے بحال ہو رہے ہیں۔ کشمیر کو داخلی خود مختاری دی جا رہی ہے۔ ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال ہو رہی ہے۔"

کشمیری عوام کو دھوکا اور فریب دینے کے لیے مجاہد منزل کے یہ PAID پریس نوٹ کارگر ثابت ہوئے۔

۱۵ر فروری کو محاذ رائے شماری کی مجلس عاملہ نے کشمیر سمجھوتہ کی توثیق کر دی اور ۲۱ر فروری کو لاڑکانہ میں وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے ۲۸ر فروری ۱۹۷۵ء کو احتجاجی ہڑتال کرنے کی کال دے کر فرمایا:

"ہم دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی معاہدہ کشمیری عوام سے ان کا حق، حقِ خود ارادیت چھین نہیں سکتا، یہ معاہدہ اہلِ کشمیر کو اپنے پیدائشی حق، حقِ خود ارادیت سے محروم نہیں کر سکتا، کشمیر کی موجودہ متنازعہ حیثیت ہندوستان اور پاکستان نے اقوام متحدہ کی منظور شدہ قراردادوں کے مطابق تسلیم کر لی ہے۔"

۲۲ر فروری ۱۹۷۵ء کو جموں میں سید میر قاسم نے گورنر کو اپنا استعفیٰ پیش کیا ۲۴ر فروری کو وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے معاہدہ دہلی یعنی اندرا عبداللہ ایکارڈ کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے فرمایا:-



(سید میر قاسم)

"ہند یونین اور ریاست جموں و کشمیر کے آئینی تعلقات بدستور دفعہ ۳۷۰ کے تحت قائم رہیں گے اور دونوں کے درمیان موجودہ تعلقات میں کوئی کمزوری نہیں آئے گی معاہدہ دہلی میں اس بات کی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ اگر ریاستی حکومت ۱۹۵۳ء کے بعد نافذ شدہ متفقہ فہرست میں شامل بعض قوانین مثلاً سوشل ویلفیئر اقدامات، کلچر معاملات، سوشل سکیورٹی پروویجز قوانین اور ان سے ملتے جلتے دوسرے قوانین تبدیل کرنا چاہتے تو مرکز اس پر ہمدردانہ

غور کرے گا، الیکشن کمیشن کے کنٹرول اور ریاستی گورنر کے اختیارات جیسے معاملات میں اس معاہدے میں اقرار کیا گیا ہے کہ ریاستی آئین میں لائی گئی کوئی تبدیلی اسی صورت میں نافذ العمل ہوگی جب ایسے مسودۂ قانون پر صدر ہند منظوری دے کر دستخط ثبت کر دیں گے۔

مرکزی سرکار نے مرزا محمد افضل بیگ کی یہ تجویز مسترد کر دی کہ ریاست جموں و کشمیر پر سپریم کورٹ کا دائرۂ اختیار گھٹا دیا جائے، بنیادی حقوق سے متعلق دفعات کو ریاستی آئین کی طرف منتقل کیا جائے، ریاستی قانون کے انتخابات پر مرکزی الیکشن کمیشن کی نگرانی اور کنٹرول اٹھایا جائے اور دفعہ ۳۵۶ میں ترمیم کر کے ریاست پر صدر راج نافذ کرنے سے پہلے ریاستی حکومت کی منظوری حاصل کرنا ضروری قرار دیا جائے۔

ہم نے ان میں سے کوئی بھی بات قبول نہیں کی۔ البتہ "وزیر اعظم" کا لقب اختیار کرنے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، اگر ریاستی قانون سازیہ اپنے دستور میں اس نوعیت کی ترمیم پاس کرے لیکن وزیر اعظم کا لقب صرف جموں و کشمیر کی ریاست کے حدود کے اندر استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔ معاہدے میں یہ قول و قرار بھی موجود ہے کہ مرکز کے پاس ریاست میں قوم دشمن و علیحدگی پسند عناصر کی سرگرمیوں کی روک تھام کرنے کے لیے اختیارات بدستور موجود رہیں گے۔

بہر حال اندرا عبداللہ معاہدہ کے ذریعے نئی دہلی کے اس موقف کہ مملکت ہند و جموں کشمیر کے بارے میں اپنے اختیارات سے انحراف نہیں کرے گی، اور شیخ عبداللہ کے اس اصرار کے درمیان کہ اُسے اپنے پیروکاروں کے سامنے کچھ حاصل کرنے کے لائق رکھا جائے ایک راستہ دریافت کرنا ہی تھا۔ یہ معاہدہ اسی بات کی تکمیل کی غرض پوری کر رہا ہے، لیکن واضح کیا گیا ہے کہ ریاست اگست ۱۹۵۳ء کی پوزیشن پر واپس نہیں جا سکے گی۔ ہم نے کہہ دیا ہے کہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف نہیں جاتی ہیں۔ البتہ ریاستی قانون سازیہ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ

ایسے قوانین پر نظر ثانی کرے جن کے بارے میں قانون سازیہ کے اختیارات مرکز اور ریاست دونوں کو حاصل ہیں۔ گورنر کے اختیارات و مراعات، الیکشن کمیشن کی حدِ اختیار اور الیکٹورل رولز کی ضابطہ بندی کے بارے میں ریاستی آئین میں ترمیم اس وقت تک موثر اور نافذ العمل نہیں ہو سکے گی، جب تک نہ صدر کی منظوری حاصل کی جائے، اس کو تسلیم کر لیا گیا ہے ایسا ریاست کے مفاد میں نہیں ہوگا۔

اسی طرح وہ ریاست کی طرف سپریم کورٹ کے دائرۂ اختیار کی توسیع کے بھی مخالف تھے اور ان میں انقلابی ترمیمات چاہتے تھے، یہ ناممکن دکھائی دیا۔

ریاست کے اندر آئینی مشنری کے ناکام ہونے کی صورت میں ریاست پر مرکز کی حکمرانی کا نفاذ عمل میں لانے کے لیے دفعہ ۳۵۶ شامل ہے، اُس میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی۔

شیخ عبداللہ اس بات پر بھی اصرار کرتے رہے کہ جموں وکشمیر میں مملکت کے سربراہ اور انتظامیہ کے سربراہ کے لیے قبل ۱۹۵۳ء کی اصلاحات بحال کر دی جائیں لیکن یہ مانگ بھی تسلیم نہیں کی گئی، اس طرح ریاست کے سربراہ کا پرانا نام بھی بحال نہ ہوگا، اسے صدر ریاست کے نام سے نہیں بلکہ گورنر کے نام سے ہی پکارا جاتا رہے گا، اس طرح انتظامی سربراہ کے نام میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی طرف سے معاہدۂ دہلی کی پارلیمنٹ اور پھر راجیہ سبھا میں وضاحت کے دوران شیخ عبداللہ نے اپنی طرف سے ایک بیان جاری کیا۔

"قانونی اور آئینی انتظامات بنیادی افہام وتفہیم کے اظہار کا ایک ذریعہ ہیں، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور خان عبدالغفار خاں کے ساتھ میں نے جو کام کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ اسی مشترکہ اصولوں پر ایمان

کا نتیجہ ہے کہ جس نے ہمیں ہند یونین کے ساتھ شامل ہونے میں رہبری کی اور اُن کے ایک خادم کی حیثیت سے میں نے الحاق کی تصدیق کی، بعد میں بھارتی دستور ساز اسمبلی کے ایک رُکن کی حیثیت سے میں نے ہندوستانی آئین کے بنانے میں اپنی خدمات ادا کیں اور میں بھی آئین پر دستخط کرنے والوں میں شامل تھا۔

۱۹۵۳ء کی میری معزولی اور نظر بندی کے بعد مذاکرات کا آغاز پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ بدقسمتی سے ان کی موت نے اس میں رکاوٹ ڈالی، مجھے ایکبار پھر بلکہ بھرپور طریقے پر ملک اور ریاست کی سیاسی زندگی میں شامل کرنے کا سہرا پنڈت نہرو کی صاحبزادی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے سر ہے۔

میں نے انہیں بتا دیا کہ میری خدمات ہندوستان کے لیے وقف ہیں اور میری ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کر دی جائے تو میں بہتر طور پر کام کر سکتا ہوں لیکن مسز اندرا گاندھی نے مجھ پر وہ مشکلات واضح کر دیں جو گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف موڑنے سے پیدا ہوں گی، ہمیں حقیقت پسندی کے ساتھ وہ سب تبدیلیاں زیر نظر رکھنا ہوں گی۔

وزیر اعظم کے ساتھ مذاکرات کے اختتام پر جو خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ہے اُس کی بدولت وہ بدلا ہوا منظر سامنے آتا ہے جس میں پارٹی کا نصب العین حاصل کرنے کے لیے رائے شماری کا راستہ بے محل اور غیر متعلقہ بن گیا ہے۔

ہماری پارٹی کو امتیازات سے بالاتر رہ کر ریاست کی سیکولر اور جمہوری قوتوں کی تنظیم نو کرنے کی کوشش میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔"

دوسرے الفاظ میں شیخ محمد عبداللہ نے آخر پر یہ بتایا کہ ۲۲ سال تک ہم نے "رائے شماری" کا جو راستہ اختیار کر رکھا تھا وہ راستہ ہم نے چھوڑ دیا لیکن اگر کسی نے یہ راستہ اپنایا تو اس کو ہم کچل کر رکھ دیں گے۔ ہم کسی کو بھی یہاں "رائے شماری" کا نام لینے کا اختیار نہیں دیں گے۔ یہ منافع بخش دوکان اب ہم نے بند کر دی اس دوکان

سے ہمیں صرف دولت مل گئی، جاہ وحشمت نہیں۔ چونکہ ہمیں جاہ وحشمت کی بھی ضرورت ہے لہٰذا کوئی اس میں خلل ڈالنے کی کوشش نہ کرے، جو کوئی ایسا کرے گا وہ پاکستانی ہوگا۔ اور ایسے پاکستانی کے ساتھ سختی سے نپٹ لیا جائے گا۔

کشمیر سمجھوتہ پر دستخط کرنے کے دوران اندرا عبداللہ کے درمیان دفعہ ۳۷۰ اور ایکارڈ کو کسی وقت تک کے لیے پوشیدہ رکھنے کا بھی ایک سمجھوتہ ہوا تھا، چونکہ اس سمجھوتہ پر دستخط نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ دونوں کے درمیان زبانی طے پایا تھا، لیکن ہندوستانی عوام کو اپنی فتح اور اپوزیشن کو اپنے بڑے کارنامے سے واقف کرانے کے لیے مسز اندرا گاندھی اتاؤلی ثابت ہوئیں۔ انھوں نے پارلیمنٹ کے بعد راجیہ سبھا میں جاکر جب کشمیر کے لیڈرانِ قوم کے ایمان، اصول اور ان کے موقف کا بھانڈا پھوڑ دیا تو شیخ عبداللہ مسز اندرا گاندھی کی اس حرکت پر ناراض ہوگئے اور انہوں نے حلف کی کاروائی میں شامل ہونے سے انکار کردیا، کیونکہ ان کے عقیدت مند نشہ مسار تھے عوام دم بخود تھے خود ان کا قد بہت گھٹ گیا تھا۔

شیخ عبداللہ کی یہ گھڑی ایک امتحان سے کچھ کم نہ تھی۔ انھوں نے ۲۲ سال کی جدوجہد آزادی کو اقتدار کی بھینٹ چڑھا کر ایک سمجھوتہ کیا تو مسز اندرا گاندھی سے ۲۲ منٹ تک بھی اسے پوشیدہ نہ رکھوا سکے۔ اس موقع پر شیخ عبداللہ کو اس بات کا خدشہ لاحق ہوگیا کہ مسز اندرا گاندھی دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں ان سے کیا گیا عہد آشکارا نہ کریں۔ کیونکہ جو ایکارڈ کا راز پوشیدہ نہ رکھ سکی، وہ دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں کہاں خاموش رہے گی۔

یاد رہے اقتدار کی منتقلی کی بات چیت کے دوران شیخ محمد عبداللہ نے مسز اندرا گاندھی سے کہا تھا —— آپ نے مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے دوبارہ ریاست کا حکمران بنا دیا، میں آپ کے اس بھروسے کی کسوٹی پر کھرا اترنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو مستقبل قریب میں دکھاؤں گا جس پر آپ نے اتنا بڑا بھروسہ کیا وہ دفعہ ۳۷۰ ختم کر کے ہندوستان اور کشمیر کا رشتہ مضبوط کر کے دے گا۔"

(دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں شیخ صاحب کی اس یقین دہانی کا اعتراف مسز اندرا گاندھی نے کیا ہے، اس کی تفصیل اگلے باب میں آئے گی)

"چونکہ دوران گفتگو دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں شیخ عبداللہ یہ یقین دہانی کرا چکے تھے اس لیے

انھیں خدشہ ہوا۔ ہو نہ ہو ایکارڈ کی تفصیلات کے بعد وہ اس کا انکشاف نہ کر بیٹھے؟ شیخ صاحب شش و پنج میں پڑ گئے۔ وہ آگے جانا چاہتے تھے تو آگے کھائی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے تو پیچھے چاہ (کنواں) تھا۔ وہ درمیان میں کچھ دیر تک لٹکے رہے۔

جب گورنر ہاؤس جموں سے مسز اندرا گاندھی کو ہارٹ لائن پر بتا دیا گیا کہ شیخ صاحب آپ کے پارلیمنٹ میں بیان پر روٹھ گئے ہیں اور وہ حلف کی کاروائی میں شامل نہیں ہو رہے ہیں تو انہوں نے غصّہ ہو کر ٹیلیفون پر گورنر ایل، کے، جھا کو بتایا:-

"میر قاسم کو کہا جائے کہ وہ CONTINUE کریں۔ اور نیڈوز[1] ہوٹل کے بارے میں جو میں نے ہدایات دیں۔ اس پر عمل کریں۔"


(گورنر ایل، کے، جھا)

نوٹ:- نیڈوز ہوٹل کا چالیس سالہ لیز اسی دہائی میں ختم ہو رہا تھا۔ اور مدّت میعاد سے چند سال قبل اس ہوٹل کو گورنمنٹ نے نیلام پر چڑھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور مسز اندرا گاندھی نے ایسا کرنے کی منظوری دی تھی، بشرطیکہ شیخ صاحب ایکارڈ میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالیں —— مرکزی سرکار کے ساتھ ریاستی سرکار اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ نیڈوز ہوٹل سے جو منافع خوری کی نہر نکلتی ہے وہ سیدھی شیر کشمیر ہاؤس تک جاتی ہے۔ شیخ خاندان اس ہوٹل کا سالانہ ہزاروں روپے کا معاوضہ گورنمنٹ کو ادا کرتی ہے اور لاکھوں روپے سالانہ بطور کرایہ وصول کرتی ہے۔

---

[1] نیڈوز ہوٹل کے نام پر کشمیر ایکارڈ کے دوران مرکزی سرکار کی طرف سے شیخ محمد عبداللہ کو بلیک میل کیا گیا، یہ بات طے پا چکی تھی اگر شیخ صاحب مسز اندرا گاندھی کی مرضی کے ایکارڈ پر دستخط نہیں کریں گے تو نیڈوز ہوٹل ان سے چھین لیا جائے گا۔



اندرا گاندھی

گورنر ایل، کے، جھا سے مسز اندرا گاندھی کا آڈر سن کر سید میر قاسم نے شیخ صاحب کو حلف کی کارروائی میں شامل ہونے کا مشورہ دے کر ایک بہت بڑی قربانی دی۔ انھوں نے واقعی اس وقت اقتدار کو تیاگ دیا جب وہ ان کے قدموں میں تھا۔ میر قاسم نے اپنی کھوئی ہوئی وزارت جواب بھی اُن کے قدم چُوم رہی تھی، شیخ صاحب کے حوالے کر کے بڑی فراخدلی دکھائی۔ شیخ صاحب نے سید میر قاسم کا مشورہ قبول کر کے کھائی کو پار کر لیا۔ اور حلف برداری کے بعد اخباری نمائندوں کے سامنے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

"معاہدے کی اشاعت اور اس کی کچھ تشریحات غلط اور بے محل ہیں میں معاہدے کے حقایق بہت جلد عوام کے سامنے رکھوں گا۔ معاہدے کے دوران جو میرے اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان خط و کتابت ہوئی اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔"

اس موقع پر شیخ صاحب نے خطوط کا جو ذکر کیا وہ شاید ایک معرکہ تھا جو انھوں نے سر کر لیا تھا۔ "کشمیر ایکارڈ" کے نام سے جو قلعہ شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ نے فتح کر لیا تھا۔ اس قلعہ کو کانگریس پارٹی نے اس وقت مسمار کر دیا جب انھوں نے شیخ عبداللہ کو نیچا دکھانے کے لیے اس ایکارڈ کی ہزاروں کاپیاں چھاپ دیں۔ کیونکہ یہ دستاویزات خود شیخ صاحب کے تمام زبانی جمع خرچ کا مُسکت جواب تھیں۔

شیخ صاحب اس بے خطا ہتھیار سے اس قدر سہم گئے کہ انھوں نے کانگریس کے صدر شری دیو کانت بروا کے پاس دُہائی دی، جنھوں نے اپنی خسروانہ عنایت سے پردیش کانگریس سے سفارش کر دی کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب جیسے بزرگوں کی نمایاں خدمات کا لحاظ کر کے انہیں اس آزمائش سے نجات دلائی جائے، چنانچہ ان کتابچوں کی تقسیم روک کر ان رہنماؤں کو وسیع پیمانے پر شرمندگی کا سامنا کرنے سے محفوظ بنا دیا گیا۔

شیخ صاحب نے ان خطوط کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا گویا محاذِ جنگ میں انھوں

نے اپنی فتح کا جھنڈا گاڑ دیا تھا۔ اور جس کا ذکر مسز اندرا گاندھی نے شاید جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔

خطوط حسبِ ذیل ہیں :۔

" ۳ کوٹلہ لین

نئی دہلی ۱۱ر فروری ۱۹۷۵ء

محترمہ پردھان منتری

میں نے ریاست جموں و کشمیر اور انڈین یونین کے درمیان مرکز اور ریاست کے تعلقات سے متعلق آئینی امور کے بارے میں اِن نتائج کے متن کو دیکھا ہے جن پر شری پارتھا سارتھی اور مرزا افضل بیگ متفق ہوئے ہیں میں نے اُس دستاویز کا مطالعہ کیا ہے اور آپ کے ساتھ تبادلہ خیال بھی کیا ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میرا یہ خیال ہے کہ مرکز اور ریاست جموں و کشمیر کے بیچ وہی آئینی رشتہ ہونا چاہیے جو ۱۹۵۳ء میں تھا۔ پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ یہ متفقہ نتیجے سیاسی سطح پر میرے تعاون اور مرکز اور ریاست کے تعلقات کے لیے ایک اچھی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ بات چیت کا بڑا مقصد دونوں طرف کی غلط فہمی کو دُور کرنا اور اس امر کو یقینی بنانا تھا کہ مرکز اور ریاست کے بیچ کی کڑی کو زیادہ مضبوط بنایا جائے اور ریاست کے لوگوں کو سماجی بہبود اور ترقی کے کام کرنے کا پورا موقع دیا جائے۔

ریاست جموں و کشمیر کا بھارت سے الحاق بحث کا موضوع نہیں ہے میرا یہ پختہ یقین ہے کہ جموں و کشمیر کا مستقبل بھارت کے ساتھ ہے، کیونکہ دونوں کے نظریئے مشترکہ ہیں مجھے امید ہے کہ آپ اس بات کو سمجھتی ہیں کہ سیاسی اور سرکاری سطح پر میرے تعاون کرنے کی واحد وجہ یہ ہے کہ ریاستی سرکار ریاست کے لوگوں کی بھلائی کے کام شروع کر سکے جسے میں نے ہمیشہ اپنا متبرک فرض سمجھا ہے میری یہ لگاتار کوشش ہوگی کہ ریاست جموں و کشمیر ملک کی خود مختاری یک جہتی اور ترقی میں

اپا پنا پارٹ ادا کرتی رہے اسی طرح مجھے یہ یقین ہے کہ مرکزی سرکار ریاست کے بھارت کا ایک اٹوٹ جزو ہونے کی حیثیت سے ریاست کے لوگوں کی بھلائی کے کام کو فروغ دینے میں ریاستی سرکار کی طرف سے اُٹھائے گئے اقدامات میں پورا تعاون دے گی۔

ملک ایک نازک دور سے گزر رہا ہے اور ہم سب کے لیے جو جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے آدرشوں میں یقین رکھتے ہیں یہ اور بھی ضروری ہے کہ قوم کا رہنما ہونے کی حیثیت میں ہم آپ کے ہاتھوں کو اور بھی مضبوط کریں اور اس اسپرٹ سے میں اپنا پورا تعاون پیش کرتا ہوں۔



آپ کا مخلص :

(دستخط) ایس۔ ایم، عبداللہ

شیخ عبداللہ کو مسز اندرا گاندھی کا جوابی خط

نئی دہلی

۱۲ر فروری ۱۹۷۵ء

مجھے آپ کا خط پاکر خوشی ہوئی جس میں آپ نے مرکز کے ساتھ جموں وکشمیر کے تعلقات کے کچھ آئینی پہلوؤں پر مرزا محمد افضل بیگ اور فتری پارتھا سارتھی کی بات چیت کے نتائج پر اپنی رضا مندی کا اظہار کیا ہے اور جموں وکشمیر کے لوگوں کی مزید بھلائی کے لیے سیاسی اور سرکاری سطح پر اپنا پورا تعاون پیش کیا ہے، میں ریاست جموں وکشمیر کے بارے میں مرکز اور ریاست کے تعلقات پر آپ کے خیالات سے آگاہ ہوں میں پہلے بھی آپ پر یہ بات واضح کر چکی ہوں کہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے نہیں گھمائی جا سکتیں اور ہمیں حالات کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے، جس اسپرٹ سے آپ نے متفقہ نتیجوں پر غور کیا ہے اور میں آپ کو یہ اطلاع دینے کی پوزیشن میں ہوں کہ

انہیں لاگو کرنے کے لیے ضروری ایگزیکٹیو کارروائی کی جائے گی میں نے ریاست کے وزیر اعلیٰ سے بھی اس معاملے میں پورا رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ اور وہ آپ کے ساتھ سیاسی تعاون کر لے اور ریاست کے ساتھ انڈین یونین کے تعلقات کے بارے میں سمجھوتہ کی کارروائی سے اتفاق رکھتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ مرکزی سرکار جموں وکشمیر کے لوگوں کی ترقی اور بھلائی کے کاموں کو بڑھاوا دینے کے لیے ریاستی سرکار کی طرف سے اٹھائے جانے والے تمام اقدامات میں پورا تعاون دیتی رہے گی۔ مرکزی سرکار کو بھی ایسے اقدامات سے برابر کی دل چسپی ہے۔



جیسا کہ آپ نے کہا ہے ملک ایک نازک دور سے گزر رہا ہے اور میرے لیے یہ اطمینان کی بات ہے کہ آپ ایسی اہم شخصیت جس نے آزادی کی جدوجہد میں اہم پارٹ ادا کیا ہے وہ ملک کو مضبوط بنانے اور اس کے آدرشوں کو قائم رکھنے کے لیے ایک بار پھر آگے آئے۔"

آپ کی مخلص :

(دستخط) اندرا گاندھی

اس قسم کے درجن بھر خطوط اور جوابی خطوط جن کا شیخ صاحب نے بڑی ڈھٹائی سے اظہار کیا تھا۔ اگر ان کے بارے میں یہ کہا جائے کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا تو غلط نہیں ہوگا۔ پوچھا جا سکتا ہے۔

آپ نے بائیس سال تک "رائے شماری"، 'حقِ خود ارادیت' اور 'آزادی' کے نام پر سینکڑوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتروا دیا۔ سینکڑوں بچّوں کو یتیم کروا دیا، درجنوں عورتوں کو بیوہ بنوا دیا۔ ہزاروں لوگوں کو سزائیں دلوائیں بے شمار لوگوں کو زخمی کروا دیا، اس کے بعد ایک وہ اقتدار حاصل کیا جس کے بارے میں آپ نے ۹ر اگست ۱۹۶۶ء کو کہا تھا:۔

" جس شخص کو حکومت ہند کا اعتماد حاصل ہو وہی کشمیر کا چیف منسٹر

بن سکتا ہے چیف منسٹر اور پرائم منسٹر بجائے خود کوئی مقصد نہیں مسائل عہدے قبول کرنے سے حل نہیں ہوتے ... میں نے کشمیری قوم سے کچھ وعدے کیے ہیں جن کو مجھے پورا کرنا ہے۔ کشمیر کا چیف منسٹر وہی بن سکتا ہے جو الحاق کو اٹوٹ مانے گا اور میرا موقف یہ ہے کہ ہم نے بھارت کے ساتھ عارضی الحاق کیا ہے اور یہ الحاق تابع رائے شماری ہے۔ میں رائے شماری کے مطالبے سے دست بردار ہو کر قوم سے غداری نہیں کر سکتا۔ جو ایسا کر چکے وہ اس کی سزا پائیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں عوام میں ان کی کوئی ساکھ نہیں ہے، اور وہ اپنے کرتوت پر پچھتا رہے ہیں ۔"

عہدہ وزارت کے بارے میں یہ شیخ عبداللہ کے وہ خیالات تھے جو انہوں نے ایکبار نہیں، بلکہ ۲۲ سالہ سیاسی زندگی میں بار بار دہرائے آج وہ سب کچھ بھول کر بھارت کے ساتھ ایک معاہدہ کر چکے اور اس معاہدے کے بارے میں انھوں نے ۹ اگست ۷۰ء کو مجاہد منزل کے ایک بڑے عوامی اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے کہا تھا۔

"..... ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو بھارت نے ہماری وزارت پر شب خون مارا۔ اس کارروائی سے بھارت نہ صرف ہمارے بلکہ دُنیا کے سامنے ننگا ہو گیا کیونکہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں اس نے دُنیا کے سامنے کچھ وعدے کیے تھے۔ ۹ اگست کے واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملا ہے کہ بڑی طاقت اور چھوٹی طاقت ۔ طاقتور انسان اور کمزور انسان کے درمیان جو عہد و پیمان یا معاہدہ طے پاتا ہے وہ قائم نہیں رہتا۔ ہم نے ہندوستان کے ساتھ جو معاہدے طے کیے تھے۔ اندازے کی غلطی کی وجہ سے کیے تھے۔ ۹ اگست کے واقعہ نے یہ بات ثابت کر دی کہ دو غیر متوازن جماعتوں جن میں ایک طاقتور اور دوسرا کمزور ہو کوئی معاہدہ قائم نہیں رہ سکتا۔ پنڈت نہرو نے ہم سے ایک وعدہ کیا تھا اور بین الاقوامی اداروں میں اس وعدے کو دُہرایا۔ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ طاقت اور دولت کے بل بوتے پر وعدے سے انحراف کریں گے۔

بہر حال ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں اور ہمیں ایک تجربہ بھی حاصل

ہو چکا ہے، آئندہ ہم اس قسم کی غلطی کو نہیں دُہرائیں گے ۔"

شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک مسئلہ کشمیر کی آڑ میں 'رائے شماری'، 'حقِ خود ارادیت'، اور 'آزادی' کے جو بلند بانگ دعوے کیے، اور ان کے لیے اپنے ایمان اصول اور ضمیر کی جو دہائی دی شاید دُنیا کی کسی سیاسی تاریخ میں ہمیں اس کی مثال نہیں ملے گی سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ان کا ثانی نہیں ملے گا جنہوں نے اقتدار کے لیے ۲۲ سالہ جد وجہد کو بھول کر اس طرح ذلّت آمیز سمجھوتہ کیا ہو، جس سمجھوتہ کو سننے کی انھوں نے خود تاب نہ لائی اور انہیں حلف کی کارروائی کے دوران کچھ دیر کے لیے ہی سہی رُوٹھنا پڑا۔

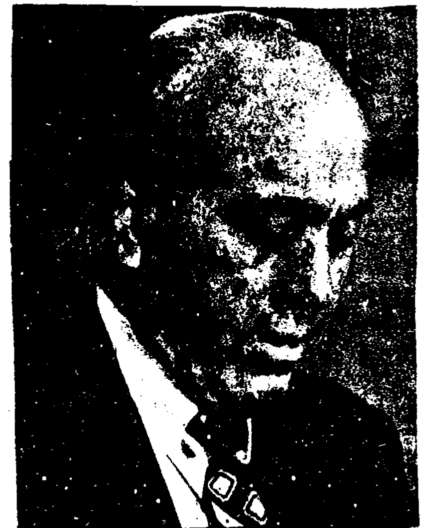
شیخ محمد عبداللہ کے دست راست مرزا محمد افضل بیگ جو "محاذ رائے شماری" کے بانی اور صدر تھے، جو پاکستان کی دہائی دے کر ہندوستان کو قطعاً مسترد کر کے کشمیری عوام کو راولپنڈی روڈ دکھا رہے تھے۔ اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر بولنے لگے:

"برصغیر کے مجموعی حالات بدلنے سے ہم نے رائے شماری کا نعرہ ترک کرنے میں ہی ریاست جموں وکشمیر کے ساٹھ لاکھ لوگوں کی عافیت سمجھی، کشمیر میں پاکستان کہنے والے کشمیر اور پاکستان دونوں کے دشمن ہیں۔ میں ریاست جمّوں وکشمیر کے لوگوں پر زور دیتا ہوں کہ وہ قومی دھارے میں داخل ہو کر شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھ مضبوط کریں۔

شیخ عبداللہ کی سربراہی میں کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ بہت پہلے ہو چکا ہے —— ہمیں محسوس ہو رہا ہے، ہم نے ۲۲ سال کا طویل عرصہ ضایع کر دیا۔ اور اسے آوارہ گردی میں گزارا ۔"

اس سمجھونے کے خلاف ریاستی عوام نے ۲۸ فروری ۱۹۷۵ء کو جو ہڑتال کر کے دن کو رات بنا دیا یہ یقیناً عوام کی طرف سے سمجھوتہ مسترد کیے جانے کا فتویٰ تھا لیکن ۲ مارچ کو جب شیخ محمد عبداللہ کا بحیثیتِ وزیر اعلیٰ سرینگر میں استقبال کیا گیا اس نے یقیناً اِس سمجھوتہ پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

کشمیری عوام نے کشمیر ایکارڈ کو مسترد کیا یا اُسے منظور کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جسکا جواب اُن لوگوں کے پاس بھی نہیں جنھوں نے ہڑتال میں بھرپور حصّہ لینے کے بعد استقبال میں بھی حصّہ لیا۔ کشمیری عوام کا یہ تضاد انکی بے غیرتی اور بے شعوری کا کُھلّم کُھلّا اظہار تھا۔ جس کا انھوں نے بار بار اعادہ کیا ہے۔





اوپر :۔ شیخ صاحب مسز اندرا گاندھی کی طرف سے کشمیر ایکارڈ کی تفصیل بتانے سے ناراض ہیں۔
نیچے :۔ گورنر ایل۔ کے جھا انہیں عہدے اور رازداری کا حلف دلا رہے ہیں۔



سیّد میر قاسم کی کرسی پانے کے لیے
”کبھی خم نہ ہوسکی میری گردن“ کہنے والے گردن کے ساتھ کمر کو خم دے رہے ہیں



[illegible] — [illegible] مرزا محمد افضل بیگ
شیخ محمد عبداللہ اور [illegible]

شکوہ نہیں یہ سادہ دلی کا ہے تجربہ
ہوتا ہے دشمنی سے سوا دوستی کا زہر

وزارت کی تشکیل اور ضمنی انتخابات

محاذ رائے شماری کا کفن دفن

وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھال کر شیخ صاحب نے کابینہ میں اپنے علاوہ مرزا محمد افضل بیگ دیوی داس ٹھاکر اور صونم نربو کو لیا، کابینہ میں کسی کانگریسی وزیر کو نہ لے کر ایک طرح سے شیخ عبداللہ نے پردیش کانگریس کی دشمنی مول لے لی۔

'کشمیر ایکارڈ' کے تحت جب شیخ صاحب دوبارہ برسر اقتدار آگئے تو وزیر اعظم کے بجائے انھوں نے وزیر اعلیٰ کے عہدے کو غنیمت جان کر اسی پر قناعت کرنا مان لیا۔

پچھلے ۲۲ برسوں میں شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کی 'آزادی، حق خود ارادیت اور رائے شماری پر کتنا خون خرابہ ہوا، کتنے لوگ مر گئے اور کتنے گھر اجڑ گئے۔ تاریخ جب کبھی اس کو دہرائے گی تو سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ ہمارے لیڈران قوم اور محاذ رائے شماری کے ساتھ وابستہ دیگر عہدیداروں اور نامزد کارکنوں نے ان بائیس برسوں کا معاوضہ اٹھّادن لاکھ باسٹھ ہزار اور سات سو روپے خزانۂ عامرہ سے وصول کر کے حاصل کر لیے اور جو لوگ ان بائیس برسوں میں مر گئے۔ وہ عورتیں جن کا سہاگ اجڑ گیا اور وہ بچے جو اس دوران یتیم ہو گئے ان کو پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی، حالانکہ پاکستان سے آئے ہوئے ۵ کروڑ جن کا حکومت پاکستان کے ترجمان نے وہائٹ پیپر میں ذکر کیا ہے اور جس پر ان مصیبت زدہ لوگوں کا حق بنتا تھا۔ محاذ کے لیڈروں نے انہیں اس حق سے بھی محروم کر دیا۔

سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ محاذِ رائے شماری کے ساتھ وابستہ لیڈر اور عہدیدار جو ہندوستان کے خلاف کشمیر کی آزادی کے لیے لڑے اور جیل گئے، وہ وزارت ملتے ہی ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے کا معاوضہ فریڈم فائٹر کے نام سے وصول کرنے لگے۔

۲۹ جنوری ۱۹۶۵ء کی وہ تقریر جو یومِ احتجاج کے سلسلے میں مجاہد منزل میں محاذِ رائے شماری کے عہدیداروں اور ورکروں کے سامنے قائد کارواں نے کی، آج بھی 'محاذِ رائے شماری' کے کتابچے میں اس طرح محفوظ ہے:

"..... جو لوگ قومی مفاد کے خلاف کام کرتے ہوں اور ہماری آزادی کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کے پاس جا کر ان کو اخلاق اور دلائل سے سمجھاؤ کہ وہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں جس سے نہ صرف وہ اپنے لیے نقصان کا باعث بن رہے ہیں۔ بلکہ اپنے اہل و عیال اور ساری قوم کے لیے باعثِ عذاب بن رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ اب بھی وقت ہے باز آؤ اور محاذ کے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ جو اس جدوجہد کا نشان ہے جس کا مقصد کشمیری قوم کو آزاد کروانا ہے، ان سے کہو کہ تمہاری ماضی کی غلطیاں معاف کی جائیں گی، اگر تم اپنی حرکات سے باز آجاؤ گے......"

کشمیر کو ہندوستان سے آزادی دلانے والی قائدِ قوم کی یہ تقریر کتابچے کی صورت میں عوام کے پاس پہنچانے والے وہ صدرالدین مجاہد ہیں، جو آج فریڈم فائٹر ایسوسی ایشن کے صدر ہیں اور آئے دن فریڈم فائٹر کا معاوضہ بڑھانے کا حکومت ہند سے مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔

بائیس ۲۲ سال تک ہندوستان کے خلاف لڑنے کے بعد ملک کی آزادی کا معاوضہ وصول کر کے محاذ رائے شماری کے لیڈروں اور عہدیداروں نے غیرت شرم، اخلاق و آداب کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ایمان اور ضمیر کی بھی کوئی پرواہ نہیں کی نہ کر رہے ہیں۔

بائیس ۲۲ سال تک ہندوستان کے ساتھ لڑ کر ۲۲ سال کے بعد ہندوستانی ہونے کا ثبوت انھوں نے ۲۲ سال کا معاوضہ وصول کر کے دیا، اور یہ معاوضہ مختلف مدوں سے ایسا وصول کیا جیسے کہ یہ جنم جنم کے بھوکے تھے۔ دولت وصول کرنے کے معاملے میں یہ لوگ ایسے ہاتھ پاؤں

مارنے لگے گویا صحرا نوردی کرتے ہوئے اچانک راستے میں انہیں خزانہ مل گیا تھا۔

۲۲ برسوں کی اس جدوجہد جس میں کئی قومیں آزاد ہو گئیں اور دُنیا کے نقشے میں کئی تبدیلیاں آگئیں ہمارے لیڈرانِ قوم نے اس ساری جدوجہد کو آوارہ گردی سے تعبیر کر کے کشمیری قوم کے ساتھ ایسا مذاق کیا جس کی ساری دُنیا میں کہیں کوئی مثال نہیں ملتی اور جب تک یہ دُنیا قائم ہے اس قسم کا مذاق شاید ہی کوئی رہنما اپنی قوم سے کر سکے گا، اور شاید ہی کوئی قوم اس قسم کا مذاق قبول کرے گی۔

حق تو یہ ہے کہ اس قسم کا مذاق غیر مہذب لوگ بھی برداشت نہیں کر سکتے مہذب لوگوں کی تو بات ہی نہیں۔

دُنیا میں آج بھی کئی ممالک ایسے ہیں جہاں کے لوگ دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ وہ آج بھی ننگے ہیں، جانوروں کی کھالیں اوڑھتے ہیں، غاروں میں رہتے ہیں اور جنگلی جانوروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں، ایسے لوگ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے اپنے سردار کے ماتحت نظامِ حیات چلا رہے ہیں۔



(مولوی یوسف شاہ - فاروق)

ان جنگلی لوگوں کے ساتھ ان کا سردار اگر اس قسم کا مذاق کرے تو کیا وہ سردار اُن پر حکمرانی کر سکے گا؟

نہیں — ہرگز نہیں —!

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کشمیری عوام نے ایسا کیوں کیا —؟





شیخ عبداللہ۔ شیخ فاروق

میں نے جب اس سوال پر غور کیا تو مجھے یہ جواب ملا کہ ہم تو جنگلی انسان بھی نہیں بلکہ بھیڑ اور بکریاں ہیں، ان بھیڑ بکریوں پر حقِ ملکیت جتا کر شیخ خاندان اور مولوی خاندان آپس میں کبھی لڑ پڑے تو اس لڑائی میں بے شمار بھیڑیں اور بکریاں ذبح ہو گئیں، آخر ایک سمجھوتے کے تحت بھیڑیں شیخ خاندان کے حصّے میں آگئیں اور بکریاں مولوی خاندان کو "پٹے" پر دیدی گئیں۔

۱۹۳۱ء سے جب سے ان بھیڑوں اور بکریوں کا بٹوارہ ہوا یہ دونوں اپنے اپنے ریوڑ کو جہاں چاہتے ہیں لے جاتے ہیں جب چاہتے ہیں ان کو آپس میں لڑاتے ہیں یہ دونوں خاندان ضرورت کے وقت نہ صرف انہیں بیچ کھاتے ہیں بلکہ ان کا خون بھی چوستے ہیں اور ان سے اُون بھی لیتے ہیں، اگر یہ کچھ گڑبڑ کریں تو ان کی کھال بھی کھینچ لیتے ہیں۔

شیخ خاندان اور مولوی خاندان نے کشمیری عوام کو بھیڑ بکریاں سمجھ کر ان کا جو استحصال کیا اس کی مکمل تفصیل کے بیان کے لیے الگ کتاب کی ضرورت ہے۔

کشمیری عوام کو "محاذ رائے شماری" کے جھنڈے تلے جمع ہو کر ہندوستان سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بلند بانگ دعوے کرنے والے جب دوبارہ اقتدار حاصل کر چکے تو اس محاذ رائے شماری کا وجود ان قومی رہنماؤں کو بُری طرح کھٹکنے لگا۔

چنانچہ ۵ر جولائی ۱۹۷۵ء کو مجاہد منزل میں جنرل کونسل کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ محاذ رائے شماری کے صدر نے بدلے ہوئے حالات کا ذکر کرتے ہوئے جب محاذ رائے شماری کو ہمیشہ کے لیے سپرد خاک کرنے کی تجویز پیش کی تو مجاہد منزل میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔ جہاں کئی ممبران نے ایسا سُن کر خاموشی اختیار کر لی، وہاں کئی ممبروں نے زوردار الفاظ میں اس تجویز کی مخالفت کی، کئی ممبران جذباتی ہو کر واویلا کرنے لگے۔ کئی ممبران کو محاذ رائے شماری کی لاش پر روتے ہوئے دیکھا گیا۔

صوفی محمد اکبر جو محاذ رائے شماری کی اس تجہیز و تدفین میں شامل نہیں تھے انھوں نے ایک خط کے ذریعے محاذ کے صدر سے کہا تھا۔

"یہ کارروائی ۹ر اگست کے شہیدوں کے ساتھ صاف غدّاری ہے
کل جب اس دُنیا سے جانا پڑے گا۔ ان شہیدوں کو اپنا مُنہ کیسے دکھاؤ گے؟"

مجاہد منزل کی نشست میں عبدالرشید شاہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا:

"جب ہم خدا کے سامنے حاضر ہوں گے تو اُنھیں کیا جواب دیں گے؟"

اجتماع میں غلام نبی ہاگرو نے کہا۔

"ہم سینکڑوں شہیدوں کو کیسے مطمئن کریں گے۔
کیا ہماری ساری جدوجہد کا ماحصل صرف ایک کرسی تھی؟
اور وہ بھی میر قاسم کی جھوٹی کرسی جسے محاذ رائے شماری کے "کوڈ ورڈ" میں

رکینہ نام رکھا گیا تھا۔"

اس شور و شرابہ اِن آہوں اور کراہوں سے لاپرواہ ہو کر مرزا محمد افضل بیگ نے فرمایا:

"یہ شیخ صاحب کا فرمان ہے اور اسے آپ کو قبول کرنا ہے۔ جو اسے قبول نہیں کرے گا تنظیم میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

محاذ رائے شماری کا کفن دفن کرنے کے چند روز بعد صوفی محمد اکبر سرینگر آئے تو مجاہد منزل سے اپنا بوریہ بستر باندھ کر ہمیشہ کے لیے اس مجاہد منزل کو خیرباد کہہ کر روانہ ہو گئے۔ جس مجاہد منزل میں انھوں نے رہنمایانِ قوم کے ساتھ قوم سے کچھ وعدے کئے تھے۔ غلام نبی ہاگرو نے اس تنظیم کو خیرباد کہہ دیا جس کے لیے انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں صوفی محمد اکبر مجاہد منزل سے جب بوریا بستر لے کر باہر آئے تو اپنے آبائی گھر سوپور جانے کے لیے انھوں نے "مرحوم محاذ رائے شماری" کی جیپ گاڑی میں سوار ہونا قبول نہیں کیا بلکہ وہ ایک ٹیکسی لے کر بس اڈے تک گئے اور پھر سوپور روانہ ہو گئے۔ صوفی صاحب نے مرتے دم تک مڑ کر اس مجاہد منزل کی طرف نہیں دیکھا جو ان کی نظر میں کھنڈر بن گئی تھی۔

کشمیر کی جدوجہد آزادی میں کئی کردار آئے اور گئے لیکن اس میں صوفی محمد اکبر واحد شخصیت کے مالک تھے، جنہوں نے ۱۹۷۵ء کے دلی ایکارڈ پر شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ پر اقتدار کے عوض کشمیری قوم کی آزادی کا سودا کرنے کا الزام لگایا اور ان سے علیحدہ ہو کر 'مسئلہ کشمیر' کو زندہ رکھنے کے لیے 'محاذ آزادی' کی بنیاد ڈالی۔ صوفی محمد اکبر نے ریاست کی شمع آزادی کو فروزاں رکھنے میں ایک ناقابل فراموش کردار ادا کیا، ایک مثالی کردار پیش کیا، لیکن سوائے اعظم انقلابی کے اور کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

صوفی محمد اکبر سے فریڈم فائٹرز وظیفہ لینے کو کہا گیا تو انھوں نے کہا۔ کیسی جدوجہد اور کہاں ہے آزادی جس کا آپ مجھے وظیفہ دے رہے ہیں؟

لین دین کے معاملے میں صوفی صاحب دیگر لیڈروں کے مقابلے میں بالکل پاک و صاف رہے، انہوں نے کبھی روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا۔ انھوں نے قوم سے غدّاری کی دولت پر غُربت کی زندگی کو ترجیح دی۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جس کے اتّباع کی ضرورت ہے۔

محاذِ رائے شماری کو توڑنے کے سلسلے میں محاذ کے لیڈروں نے مختلف اوقات میں مختلف بیانات دیئے ۔ اس سلسلے کا حتمی بیان ۱۱ر جولائی کو اُوڑی کے مقام پر مرزا محمد افضل بیگ نے دیا :

"کشمیر ایکارڈ نے کشمیر کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کر دیا ۔ مرکز اور شیخ عبداللہ کے درمیان ایکارڈ کشمیر کے عوام کی خوش حالی اور وقار کا ضامن ہے ، اور یہ کسی کے خلاف نہیں ہے ۔"

شیخ صاحب اور بیگ صاحب نے وزارت کی گدّی تو سنبھالی تھی لیکن یہ دونوں نہ اسمبلی اور نہ ہی کونسل کے ممبر تھے، اس کے لیے انھوں نے ضمنی انتخاب کے تحت اپنے عہدوں کو قانونی اور اخلاقی حیثیت دینے کا فیصلہ کر لیا۔



شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ

شیخ عبداللہ نے حلقۂ انتخاب گاندربل اور مرزا افضل بیگ کے لیے دیوسر اسلام آباد کی سیٹیں خالی کروائیں ، ان دونوں حلقوں میں جماعتِ اسلامی نے اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گاندربل حلقے میں شیخ عبداللہ کے مقابلے میں اشرف صحرائی اور دیوسر میں مرزا افضل بیگ کے مقابلے میں حکیم غلام نبی کو کھڑا کیا گیا ۔

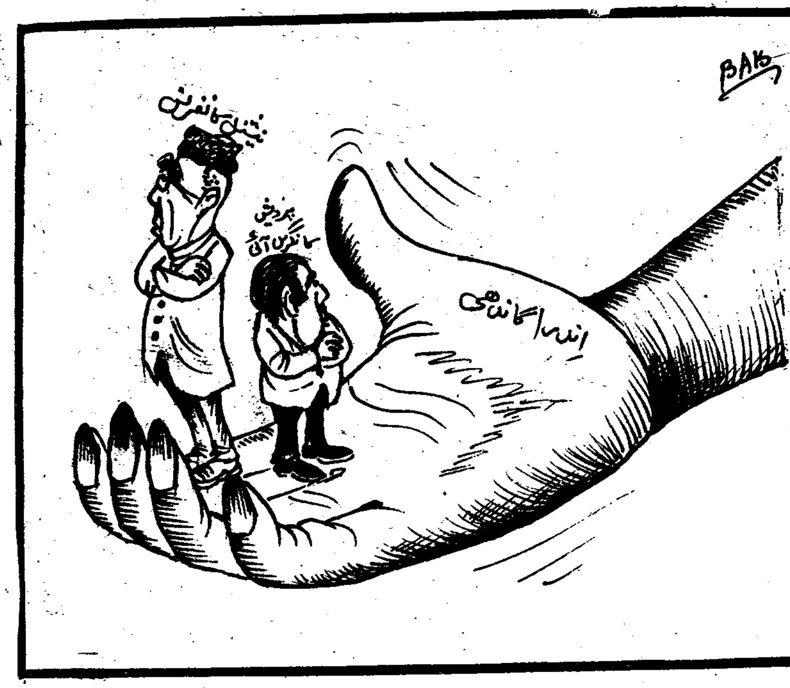
ضمنی انتخاب کی تیاری شروع ہوتے ہی کشمیر اسمبلی کو اس کا کردار یاد دلایا گیا ۔ چونکہ ۱۹۵۱ء میں اس اسمبلی کی عصمت انہی اصحاب کے ہاتھوں لٹ چکی تھی اور بعد میں جس نے چاہا اس کو داغدار کیا ، اس لیے اسے اس کا کریکٹر یاد دلایا گیا ۔ تاکہ یہ اسمبلی سر اونچا کر کے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے ۔

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ اگر اسمبلی کا یہ ضمنی انتخاب پاک و صاف طریقے سے انجام دیا جاتا تو نیشنل کانفرنس کے یہ دونوں لیڈر انتخاب جیت لیتے لیکن عادت سے مجبور ہو کر حکومت کی مشنری استعمال کر کے دھاندلی اور دھونس سے

کام لیا گیا اور خوف و ہراس کا ایسا ماحول پیدا کیا گیا گویا اِن دو حلقوں میں انتخاب نہیں جنگ ہو رہی تھی ۔

۳ر جولائی سے پہلے ہی جماعتِ اسلامی کے بیشتر کارکن نظر بند کر دیئے گئے اور ووٹنگ کے روز جو کچھ کیا گیا جمہوریت اور حق رائے دہی شرم کے مارے کسی کو اپنا منہ بھی نہ دکھا سکی

اس طرح
شیخ محمد عبداللہ
اور
مرزا محمد افضل بیگ نے
اپنے عہدوں پر مہرِ تصدیق ثبت کرا دی ۔



ریاست کی کانگریس پارٹی ہو یا نیشنل کانفرنس دونوں مسز اندرا گاندھی یعنی مرکز کے ہاتھوں کے کھلونے رہے۔

ہوئے محکوم کھو بیٹھے متاعِ آبرومندی
گئی ہمّت، گئی غیرت، گئی وہ شعلہ سامانی

اعلیٰ عہدے کا ناجائز استعمال

کانگریس اور نیشنل کانفرنس کی آپسی چپقلش

کشمیری عوام کے رہنما شیرِ کشمیر دہلی ایکارڈ کے تحت ریاست جموں وکشمیر کے حاکمِ اعلیٰ بن گئے تو اپنے عہدے کے طفیل انھوں نے اپنے ذاتی فائدے کے لیے جو احکامات جاری کیے اس سے وہ عام اور خاص نظروں میں مشکوک بن گئے۔

وزیرِ اعلیٰ نے اپنی ذاتی کوٹھی میں رہ کر اپنے لیے اس کوٹھی کا کرایہ ماہانہ ایک ہزار اور اس کوٹھی کے فرنیچر وغیرہ کا کرایہ چھ سو روپے مقرر کیا اس طرح انھوں نے خزانہ عامرہ سے اپنی تنخواہ کے ساتھ اپنی کوٹھی کا اپنے لیے کرایہ وصول کرنے کا ایک نیا طریقہ رائج کیا۔

دنیا کو چھوڑ کر سارے ہندوستان میں یہ پہلا اور آخری وزیرِ اعلیٰ تھا جو اپنی ذاتی کوٹھی میں رہنے کا عوام سے معقول معاوضہ لینے لگا۔

ان کی ذاتی کوٹھی کے لیے جو سامان، فرنیچر قالین، فرنیشنگ، ٹلیگ اور پردے وغیرہ لائے گئے وہ سرکاری خزانے سے لائے گئے، لیکن نہ صرف وہ ان کی ذاتی ملکیت بن گئے بلکہ اس کا ماہانہ چھ سو روپے معاوضہ بھی وصول کیا گیا۔ اس کوٹھی میں رنگ وروغن کرانے کی ہزاروں روپے کی بچت بھی ہوگئی، یہ سب ایسی باتیں تھیں جو کسی سے پوشیدہ نہ تھیں۔

کانگریس جو خود بھی کبھی لوٹ کھسوٹ میں ملوّث تھی اس نے وزیرِ اعلیٰ کی اس کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھانا شروع کیا۔

اپنی ذاتی کوٹھی کو سامانِ ضرورت اور سامانِ عیش سے مزیّن کرنے کے بعد انہیں اپنی

فیملی کا خیال آیا،

چنانچہ انہوں نے کمشنر نزول کو اپنے ہاں بلوا کر ان سے خالی سرکاری زمین کی تفصیل مانگی کمشنر صاحب نے مختلف جگہوں پر سرکاری زمین کی نشاندہی کی تو شیخ صاحب نے گپکار کی زمین پسند فرمائی اور اسے اپنے دو بیٹوں کے ساتھ ایک بیٹی کے لیے معمولی معاوضہ مقرر کر کے "پٹے" پر حاصل کر لیا۔

اس زمین کو "پٹے" پر حاصل کرنے کے دوران پٹوار حلقہ نہ صرف مار پیٹ کا شکار ہوا بلکہ کمشنر نزول کو بھی ڈانٹ کھانی پڑی۔

حلقہ پٹوار نے اس زمین کا انتخاب بنوا کر اس میں سے دو کنال اور ۶ مرلہ ایک ٹھیکہ دار دیوان مدن لال کی ملکیت دکھائی تھی، وزیر اعلیٰ کا کہنا تھا، اس خطۂ زمین کو بھی نزول کی ملکیت میں شامل کر لو۔ چونکہ ایسا کرنا حلقہ پٹوار کے حدِ اختیار میں نہیں تھا، لہٰذا انہوں نے ایسا کرنے سے معذوری ظاہر کی، وزیر اعلیٰ کو طیش آیا اور انھوں نے ان کی خوب خبر لی معاملہ کمشنر تک پہنچ گیا تو بعد میں متعلقہ ٹھیکہ دار سے دستبرداری لی گئی اسے نزول کی زمین کے ساتھ شامل کر لیا گیا۔

کاغذات مکمل کرنے کے دوران وزیر اعلیٰ کا تقاضا تھا کہ اس لیز کی میعاد نوّے سال کے بجائے ڈیڑھ سو سال کر دی جائے۔ کمشنر نزول نے ایسا کرنے سے معذوری ظاہر کی اور اسے آئین و قانون کے منافی قرار دیا۔

چنانچہ نوّے سال کے لیے لاکھوں روپے کی یہ سرکاری زمین حقیر معاوضہ کے مطابق اپنی اولاد میں اس طرح تقسیم کرائی گئی گویا یہ ان کی ملکیتی زمین تھی۔

یہ ساری کارروائی اپنے عہدے کا ناجائز استعمال۔ کنبہ پروری اور لوٹ کھسوٹ کے زمرے میں آتی تھی اور اس کے مرتکب وہ شیخ صاحب ہوئے جو کانگریسی لیڈروں اور بخشی برادران پر کنبہ پروری کے الزامات لگاتے تھے۔

کانگریس نے ان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر فیصلہ جات لینے میں اتنا تنگ کیا کہ لاچار ہو کر انھیں کانگریسیوں کو اپنانا پڑا۔

اپنے ایک بیان میں انھوں نے کہا:۔

"میں کابینہ میں وسعت دے کر کانگریس کے چار اور نیشنل کانفرنس کے چھ وزیر لونگا"۔

کانگریس نے ان کا یہ فیصلہ نامنظور کر کے نیشنل کانفرنس کے چار اور کانگریس کے چھ وزراء لینے کی تجویز رکھ دی، لیکن وزیر اعلیٰ نے کانگریس کے چھ کے بجائے پانچ اور نیشنل کے بھی پانچ مان لیے۔ اس پر کانگریس نے کہا نیشنل کا پانچواں وزیر غیر پارٹی ہو۔

وزیر اعلیٰ نے یہ شرط قبول کر لی۔ چنانچہ نیشنل کانفرنس سے (۱) عطاء اللہ سہروردی (۲) حکیم حبیب اللہ (۳) غلام محمد شاہ (۴) غلام نبی کوچک۔

اور کانگریس سے

(۱) منگت رام شرما (۲) رنگیل سنگھ (۳) بھگت چھجو رام (۴) چوہدری محمد اسلم (۵) زینب بیگم کو لیا گیا۔

غیر پارٹی ممبر کے لیے نظر انتخاب موہن کشن ٹکو پر پڑا تو کانگریس نے اسے تسلیم کر لیا لیکن وزارت میں شریک کرنے سے بھی کانگریس مطمئن نہ ہو سکی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں مدغم کیا جائے۔

محاذ رائے شماری کو دفنا کر شیخ صاحب نے کانگریس میں اپنی پارٹی کو مدغم کرنے کے بجائے کانگریسیوں کو نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے کی دعوت دی، اس کا آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے سخت نوٹس لیا۔

اس دوران مسز اندرا گاندھی نے اچانک وادیٔ کشمیر کے دورہ کرنے کا پروگرام بنایا، اگلے روز ۸ اکتوبر کو شیخ صاحب نے عوامی اجتماع سے خطاب فرمایا۔

"..... کل جب وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی یہاں تشریف لائیں گی تو ان کا ایک یادگار استقبال کیا جائے گا، وزیر اعظم کے ساتھ ہمارے تین طرح کے تعلقات ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی کشمیری نژاد ہیں ان کے خاندان نے خود کو ہماری تحریک کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ اور وہ ہماری وزیر اعظم ہیں۔....."

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی بے حد تعریفیں کرنے کے بعد انھوں نے مقامی کانگریسیوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا:۔

"یہ لوگ بہروپیے بن کر اور وزیر اعظم کو غلط باتیں بتا کر انہیں ہمارے خلاف بھڑکاتے ہیں یہ لوگ ہماری عزّت کا سودا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے کروڑوں کی جائیدادیں بنا لی ہیں اور شراب کے خُم لُنڈھائے ہیں۔ یہ لوگ جنہوں نے سالہا سال اپنی زندگی شراب نوشی میں گزاری اپنے آپ کو کیا سمجھ رہے ہیں، کیا قوم ان کے سامنے سجدہ کرے گی ان کے لیے ایک ہی صورت ہے کہ عوام کے سامنے اپنا حساب پیش کریں اگر عوام ان کو چھوڑیں گے تو ہم بھی انہیں چھوڑیں گے ....!"


اندرا گاندھی

مسز اندرا گاندھی ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو سرینگر تشریف لائیں تو کانگریس اور نیشنل کانفرنس نے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ان کا زبردست استقبال کیا۔ انہیں ویر سے دریائی جلوس کی صورت میں لایا گیا۔

شام کو ان کے اعزاز میں ایمپوریم گارڈن میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ اپنی مختصر تقریر میں مسز اندرا گاندھی نے فرمایا۔

"کشمیر میں کانگریس کو توڑا نہیں جائے گا اور اگر یہاں اس جماعت کے ساتھ صرف ایک آدمی رہے گا، پھر بھی یہ تنظیم قائم رہے گی۔ کانگریس کو بُرا بھلا کہنے والے اپنے گریبان میں منہ ڈالیں دوسروں پر کیچڑ اُچھالنے سے پہلے اپنی کوٹھی کے قیمتی قالین کا کونا اٹھا کر دیکھیں وہاں گرد کی کتنی موٹی تہہ جمی ہے۔"

اُسی روز شام کو ریسٹ ہاؤس میں کھانے کی میز پر مسز اندرا گاندھی نے شیخ صاحب کو مقامی کانگریسیوں کے خلاف تقریر کرنے پر ایسی جھاڑ پلائی کہ شیخ صاحب سکتہ کے عالم میں کھانا بھی نہ کھا سکے۔

مسز اندرا گاندھی نے گورنر، ریاستی کابینہ اور کانگریس کے بعض عہدیداروں کی موجودگی میں شیخ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا :-

"آپ کانگریسیوں سے حساب مانگیں گے تو کیا یہ لوگ آپ سے حساب

مانگ نہیں سکتے، کیا آپ سمجھتے ہیں ان کے پاس آپ کے کرتوت کا حساب کتاب نہیں ہے، اگر آپ چاہتے ہیں تو یہ سارا حساب آپ کو بھیجا جائے گا تاکہ سبھوں کو پتہ چلے کون کتنے پانی میں ہے ـــ فی الحال آپ پچھلا حساب رکھ دیجئے اور بالکل تازہ حساب بتائیے ـــ جون کے پہلے ہفتے میں جب صدر مملکت فخرالدین علی احمد صاحب یہاں وادی کے دورے پر آئے تھے تو ان کے استقبال میں پبلک کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے رام باغ سے لے کر ڈل گیٹ تک سڑک کے دونوں طرف جو سینکڑوں پول اور پچیس ٹن وزنی لوہے کی راڈیں استعمال میں لائی گئیں تھیں یہ سارے پول اور لوہا جو شیخ باغ میں ڈمپ کیا گیا تھا۔ کئی ٹرکوں کے ذریعے یہ سارا مال گپکار پہنچایا گیا جن ٹھیکیداروں کے ذریعہ یہ مال پہنچایا گیا انکے نام محمد صدیق شیخ بوچھوارہ اور غلام قادر آبی گزر ہیں۔

ایک اور ٹھیکہ دار غلام قادر آبی گزر سے ان کوٹھیوں کے لیے نہ صرف ساٹھ ہزار نقدی وصول کیے گئے بلکہ ڈیڑھ سو بوریاں سیمنٹ بھی حاصل کر لیا گیا۔ گپکار کی ان جملہ کوٹھیوں کا خرچہ بھگت کرم چند کے فرزند مسٹر راجکمار نے ادا کیا جو میڈیکل انسٹی ٹیوٹ صورہ کے خزانچی ہیں۔ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سے عمارتی سامان شیخ عبدالسلام کے ذریعے لایا گیا۔

اگر آپ کو یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ جن ٹرکوں کے ذریعے خرد بُرد کا مال گپکار پہنچایا گیا، ان کے مالکوں کو اس کا معاوضہ اپنی جیب سے نہیں بلکہ سرکار اور اوقاف سے دلایا گیا تو آپ کیا کہیں گے ـــ؟"

اس طرح کا انکشاف کر کے مسز اندرا گاندھی نے شیخ صاحب کی پول کھول کر رکھ دی تو وہ چُپ چاپ سب کچھ سنتے رہے۔

مسز اندرا گاندھی کے واپس جانے کے بعد کئی روز تک آپ بالکل ناراض اور مغموم رہے انھوں نے انتظامیہ میں تطہیر کی غرض سے جن آفیسروں کو چلتا کرنے اور جن آفیسروں پر راشی ہونے کا لیبل لگا کر انھیں اپنے عہدوں سے برطرف کرنے کا اشارہ دیا تھا

اس کام پر انھوں نے ہاتھ روک دیا اور ان سبھوں کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

شیخ صاحب نے اناج کی خوش خرید کا فیصلہ کیا تو کانگریس نے اس کی زبردست مخالفت کر کے کسانوں کو ان کے خلاف بھڑکایا۔

کچھ مدت کے بعد وزیر اعلیٰ سے کانگریس کے مزید دو وزرار کابینہ میں لینے کے لیے کہا گیا۔ چنانچہ ان کے نام عبدالغنی گونی اور علی محمد نایک تجویز کیے گئے۔ وزیر اعلیٰ نے کانگریس کے ان دو وزیروں کو اس شرط پر لینے میں آمادگی ظاہر کی کہ ان کے بعض وزرار کا درجہ بڑھانے میں کوئی اڑچن نہ ڈالی جائے، کانگریس ہائی کمان نے نیشنل کانفرنس کے چار وزرار کا درجہ بڑھانا اس شرط پر مان لیا کہ ان کے دو کے بجائے چار وزرار کابینہ میں لیے جائیں۔ وزیر اعلیٰ نے یہ شرط بھی مان لی البتہ انھوں نے گردھاری لال ڈوگرہ کو کابینہ میں لینے سے انکار کیا۔

راج بھون میں اس سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ وزرار کو حلف دلانے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی کہ کانگریس کے ہائی کمان نے ان نئے وزرار کو حلف کی کاروائی میں شامل ہونے سے منع کیا، کانگریس ہائی کمان کے اس فیصلے سے وزیر اعلیٰ شش و پنج میں پڑ گئے۔ انھیں شک ہوا شاید یہ سب گردھاری لال ڈوگرہ کو ڈراپ کرنے کا نتیجہ ہے، چنانچہ انھوں نے ڈوگرہ صاحب کو بھی کابینہ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن کانگریس نے وزیر اعلیٰ پر الزام لگایا کہ وہ کانگریس کے دو ممبران اسمبلی محمد شفیع اُوڑی اور محمد اشرف خاں کو ورغلا رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے اس الزام کی تردید کی لیکن کانگریسی پھر بھی مطمئن نہ ہو سکے چونکہ حلف برداری کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی اس لیے وزیر اعلیٰ کو تقریب میں شامل ہو کر کہنا پڑا۔

"مجھے امید تھی کہ آج کی تقریب وزارتی کونسل میں کانگریس پارٹی کی بھرپور شرکت سے مسرت انگیز بنے گی اور میں نے اس مقصد کے لیے کانگریس کے چار سرکردہ ارکان کو کابینہ کی سطح پر ہاتھ بٹانے کی دعوت دی تھی لیکن موجودہ غلط فہمی سے فضا مکدر ہو گئی اور میں نے محسوس کیا ہے کہ آج کی تقریب سے اشتراک و مفاہمت

کے اس مقصد کے حصول میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی اس لیے میں نے گورنر سے استدعا کی کہ اس تقریب کو ملتوی کیا جائے۔"

شیخ صاحب حلف برداری کی اس تقریب کو ملتوی تو کرا سکے لیکن کانگریس نے ان کا دائرہ اتنا تنگ کیا کہ وہ اسے وا نہیں کرا سکے۔

مسز اندرا گاندھی ۲۷ مارچ ۱۹۷۶ء کو دو روزہ دورے پر جموں پہنچ گئیں تو ۲۸ مارچ کو ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کے دوران وزیر اعلےٰ نے نہایت ہی انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"مسز اندرا گاندھی طاقت کا ایک سرچشمہ ہے یہ اُس نہرو کی بیٹی ہے جسے کشمیری ہونے پر فخر حاصل تھا۔ اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر مسز اندرا گاندھی کشمیری خاندان کے ساتھ اپنی وابستگی پر نازاں ہے ـــــ ہمیں راستہ بتلانے میں ایک رہنما کی ضرورت تھی خوش قسمتی سے خدا تعالیٰ نے ہمیں وہ رہنما مسز اندرا گاندھی کی شکل میں دیدیا........!"

دو دنوں کے بعد مسز اندرا گاندھی کو رخصت کرتے ہوئے انھوں نے حاضرین کے سامنے فرمایا؛

"میں تین نعرے دوں گا۔ تم اس کا جواب اتنی زور سے دینا کہ جب اندرا جی دہلی کے پالم کے ہوائی اڈے پر اُتریں تو یہ آواز وہاں بھی ان کے کانوں میں گونجنی چاہیئے۔"

اس کے بعد شیخ صاحب نے تین بار" مسز اندرا گاندھی" کا نام جتنی زور سے لیا، اُس سے کہیں زیادہ زور سے اُن کے نام کا "زندہ باد" حاضرین سے کہلوایا، لیکن ہر نعرے کے بعد انہوں نے کہا۔" اور زور سے۔"

"اندرا گاندھی زندہ باد" کا ورد کرنے کے بعد انہوں نے حاضرین سے تین بار" جے ہند" کے نعرے بھی دُہرائے۔ اس طرح انھوں نے مسز اندرا گاندھی کی خوشنودی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن مقامی کانگریس کے عہدیدار پھر بھی اپنی حرکات سے باز نہیں آئے۔ انہوں نے ان کی کرسی کی ٹانگیں کھینچنے میں جب

کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی نوتنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق انھوں نے ۲۹ مئی ۱۹۷۶ء کو کوکرناگ میں عوامی اجتماع کے سامنے کانگریسیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"میری خواہش تھی اور امید بھی کہ آج کی یہ تقریب وزراء کی کونسل میں کانگریس پارٹی کی بھرپور شمولیت سے پُرمسرت بنے گی لیکن یہ بات میرے لیے باعث افسوس ہے کہ وزارتی کونسل کی تشکیلِ نَو اور میونسپل انتخابات جیسے معاملات میں تنظیمی سطح پر کچھ مشکلات اب بھی حائل ہیں مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اور مفاہمت سے کام لے کر ان تمام مشکلات کا تسلّی بخش حل بھی نکل آئے گا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میں نے اپنی جانب سے ہر سطح پر کانگریس کا تعمیری تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس مقصد کے پیش نظر میں نے کانگریس کے چار سرکردہ اراکین سے وزارتی سطح پر وزارت میں شامل ہونے کی درخواست کی تھی اس کے علاوہ میں نے آنے والے بلدیاتی انتخاب میں نشستوں کی تقسیم کے معاملہ پر بھی کانگریس پارٹی کو اپنے پورے تعاون کی پیش کش کی تھی چنانچہ اسی جذبے کے تحت ہم نے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ بھی بڑھانے کا فیصلہ کیا تھا، اس طرح میں نے ہر مرحلہ پر یہ واضح کیا کہ میں کانگریس پارٹی کا سرگرم اور تعمیری تعاون کا بجا طور پر متمنی ہوں۔ بدقسمتی سے موجودہ غلط فہمی سے فضا مکدّر ہو گئی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ آج کی تقریب سے اشتراک و مفاہمت کے اس مقصد کے حصول میں رُکاوٹیں پیدا ہوں گی جو وزراء کی کونسل کی تشکیلِ نَو میں کارفرما تھا۔ اس لیے میں نے گورنر سے درخواست کی کہ آج کی رسمی تقریب منسوخ کی جائے، انھوں نے یہ درخواست منظور فرمائی۔

بہر حال ہم کانگریس کی لیڈر شپ کے ساتھ ایک ایسے حل کی تلاش جاری رکھیں گے جو باہمی طور پر قابلِ قبول ہو، چنانچہ اس مقصد

کے پیش نظر اور مناسب ماحول پیدا کرنے کے لیے حکومت نے کچھ وقت کے لیے بلدیاتی انتخابات بھی ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے یہ اقدامات اس بھروسے اور یقین کے ساتھ کیے ہیں کہ ان سے مفاہمت اور تعاون کے جذبے کو بڑھاوا ملے گا جو ہمیشہ میرا اوّلین مقصد رہا ہے۔ ایسی مفاہمت ایکارڈ کے پس منظر میں اور وسیع تر قومی مقاصد کے لیے بھی اسی طرح یہ بلاشبہ ریاست کی تیز تر ترقی کے لیے بھی لازمی ہے۔ میں پورے خلوص کے ساتھ کانگریس کے تعاون کی قدر کرتا ہوں کیوں کہ اس وقت میرا اقتدار اُن کے ہی تعاون پر منحصر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کانگریس لیڈر شپ معاملات پر ازسرِ نو غور کرے گی اور میں نے جو اقدام کیے ہیں ان کے نتیجے میں جو سازگار ماحول قائم ہوگا اس سے ایک تعمیری مطالعہ اور مکالمہ کے لیے راہ ہموار ہوگی۔"

شیخ صاحب کی اس کاروائی سے وقتی طور پر سیاسی بحران ٹل تو گیا لیکن اندر ہی اندر چنگاریاں سلگنے لگیں، مقامی کانگریس کے لیڈر اپنی شرارتوں سے باز آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ نئے وزیروں کو وزارت میں شامل ہونے سے بائیکاٹ کرنے کی ہدایت کے بعد کانگریس کے ممبران اسمبلی کے مستعفی ہونے کی دھمکی کی وجہ سے شیخ صاحب اپنے اقتدار کے لیے خطرات محسوس کرنے لگے۔

حالات اور واقعات گواہ ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن اقتدار کی رخنہ اندازی کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے تھے، اقتدار کے بارے میں خدشات دیکھ کر انہیں نہ صرف کشمیری عوام (جن میں انسان کم اور بھیڑ بکریاں زیادہ ہیں) یاد آتے ہیں، بلکہ کشمیر کی خصوصی پوزیشن بھی یاد آتی ہے۔

ایسے مواقع پر کشمیری عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے ان کے پاس جو نسخہ ہے فوری طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۷۶ء کو انھوں نے سوپور کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"پچھلے دنوں کانگریس کے مرکزی لیڈروں کے ساتھ مشورہ کر کے ہم نے

اپنی کابینہ میں توسیع کرنا مان لیا تھا۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ملک کی اتنی بڑی جماعت چار گھنٹے تک بھی اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی، ہندوستان ایک بڑا ملک ہے اور کانگریس کے لیڈر ساٹھ کروڑ عوام کی نمائندگی کرتے ہیں اتنے بڑے ملک کے لیڈروں کا ایک اصول ہونا چاہیئے۔ ان کے فیصلے پر ایک اعتبار ہونا چاہیئے اتنے بڑے ملک کے لیڈر صرف چار گھنٹے کے اندر ہی اندر اپنے فیصلے بدل دیتے ہیں آخر کوئی اخلاقی معیار بھی ہونا چاہیئے" ہم ایمانداری کے ساتھ کانگریس کو اپنی کابینہ میں نمائندگی دینا چاہتے تھے۔ ہم سمجھتے تھے ان کا یہ مطالبہ ناجائز نہیں ہے، اس سلسلے میں وزیروں کے چُننے کا اختیار میرا تھا، مجھے کانگریس کے وزیروں کے ناموں کے اعلان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اگر نئی دہلی میں ان ناموں پر اتفاق ہوا ہوتا۔"

سوپور کے بعد وزیر اعلیٰ اسلام آباد کے دورے پر گئے۔ شیخ صاحب نے اسلام آباد چوک میں عوامی اجتماع سے خطاب فرمایا۔ اس موقع پر کانگریس کے وہ ارکان بھی اسٹیج پر موجود تھے جنہوں نے کانگریس سے علیحدہ ہو کر نیشنل کانفرنس میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ان میں عبدالغنی لون اور محمد اشرف خان قابلِ ذکر ہیں۔

شیخ صاحب نے اپنی تقریر میں کہا:-

"گزشتہ ہفتہ جو واقعات رونما ہوئے مختلف لوگ ان واقعات کو مختلف طریقوں سے پیش کر رہے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ جو سمجھوتہ ہوا، اس میں ایک حد یہ تھی کہ نئی اسمبلی قائم کی جائیگی جو اُن تمام مرکزی قوانین پر نظر ثانی کرے گی جن کو ۱۹۵۳ء کے بعد ریاست پر لاگو کیا گیا۔ اس وقت ہندوستان میں حالات اچھے نہیں تھے۔ گجرات اور بہار میں اسمبلیاں توڑنے کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ ایسے حالات میں اگر ریاست کی اسمبلی کو توڑنے کا مطالبہ کیا جاتا تو بہار اور گجرات

لہ شیخ صاحب بہانہ ڈھونڈنے کے لیے کونسی دُور کی کوڑی لے آئے۔ کشمیر کی خصوصی (باقی اگلے صفحہ پر)

میں ایسا مطالبہ کرنیوالوں کو ایک جواز مل جاتا۔ اس وقت میں نے مرکزی لیڈروں سے کہا کہ میرے پاس جب اپنی اسمبلی نہیں تو میں حکومت کیسے چلا سکتا ہوں، مجھے یقین دلایا گیا کہ کانگریسی ممبران اسمبلی میرا پورا ساتھ دیں گے۔

وزیر کا انتخاب کرنے میں، میں آزاد ہوں گا اور اسمبلی اور اسمبلی سے باہر کسی کو بھی اپنی وزارت میں، میں لے سکتا ہوں، اس وقت تک کچھ معاملا حل طلب تھے۔ ان کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ آگے چل کر ان کو حل کیا جائیگا۔[۲]

حکومت کی ذمّہ داریاں سنبھالتے وقت میں نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ میں ۸ راگست ۱۹۵۳ء کی ہی پوزیشن سے شروع کروں گا، ۱۹۵۳ء کے بعد جو کچھ کیا گیا اسے میں کسی بھی صورت میں تسلیم[۳] نہیں کروں گا،

چنانچہ طے ہوا کہ انتخابات کے بعد نئی اسمبلی تمام قوانین پر نظر ثانی کرے گی۔ اسمبلی کو اختیار ہوگا کہ وہ جن قوانین کو مفید اور فائدہ مند سمجھے ان کو باقی رکھے جن مرکزی قوانین سے ریاست کی اندرونی خود مختاری متاثر ہو رہی ہو ان کو اسمبلی واپس کر سکتی ہے، ان شرائط کے بعد ہم نے حکومت کی ذمّہ داریاں سنبھال لیں۔ کانگریسی اپنے وعدے پر قائم نہیں رہے انہوں نے ہمارے کچھ وعدوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ انھوں نے ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیا، اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس وقت ہم بہت ہی خطرناک حالات سے گزر رہے ہیں ہم نہیں بتا سکتے کہ آگے کیا ہوگا۔ میں وزیر اعظم شریمتی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) پوزیشن کا دعوے دار اور دفعہ ۳۷۰ کا رکھوالا بہار اور گجرات کے حالات کا تذکرہ کر کے خود ہی کشمیر کی خصوصی پوزیشن کی مٹی پلید کر رہا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۲ پھر آگے چل کر ان کو حل کیوں نہیں کیا جبکہ اسمبلی میں آپ کو بھرپور حمایت حاصل تھی۔

۳ یہ سراسر جھوٹ اور بُہتان ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ صاحب کو وزیر اعلیٰ کا یو چانس اس بھروسے پر دیا گیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ریاست کی خصوصی پوزیشن یعنی دفعہ ۳۷۰ کو وہ منسوخ کر دیں گے۔ اس کے ثبوت میں تفصیلات آگے صفحات میں آئیں گی۔

اندرا گاندھی سے کہنا چاہتا ہوں کہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس سے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اگر ہندوستان کو ہم پر اعتبار نہیں تو سارا قصّہ ختم کیا جانا چاہیئے۔ ہم نے طوفان دیکھے ہیں ہم میں اب تک کسی بڑی سے بڑی طاقت سے مقابلہ کرنے کی قوّت ہے یہ آج کی بات نہیں ہم نے ان حالات میں بھی طوفان سے مقابلہ کیا جب ہمارا کوئی یار و مددگار نہیں تھا۔ آج ہزاروں جوان قوم کی عزّت و آبروؔ[1] بچانے کے لیے جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں۔ ہندوستانی لیڈر اگر کشمیری عوام کا اشتراک چاہتے ہیں تو ان کو اپنا طریقہ بدلنا ہوگا۔"



تقریروں کے اس سلسلے میں انھوں نے ۲۹ر اکتوبر کو چرار شریف میں عوامی اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے کہا۔

"میں لوگوں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے ہماری جنگ ابھی جاری ہے۔ ہم نے تہیّہ کر لیا ہے کہ جب تک ہماری رگوں میں خون دوڑ رہا ہے ہم کسی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی کشمیری عوام کو دوبارہ زنجیریں[2] پہنانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اگر کسی کو گمان ہے کہ وہ روپے کے بل بوتے پر کشمیری عوام کو خرید سکتا ہے تو وہ بھول رہا ہے۔ ۲۲ سال تک انھوں نے یہاں کے لوگوں کو خریدنے

---

[1] صاف ظاہر ہے کہ شیخ عبداللہ نے اپنے ذاتی اقتدار کو قوم کی عزّت و آبرو کے ساتھ منسوب کیا تھا۔ اور اس اقتدار کے لیے وہ کشمیر کے جوانوں کو (بھیڑ بکریوں) کو قربانی دینے کے لیے تیار کر رہے تھے۔

[2] شیخ صاحب شاید اپنے اقتدار کو کشمیری عوام کی آزادی اور دوسروں کی حکومت کو غلامی کی زنجیر سمجھتے ہیں، اسی لیے وہ کہہ رہے ہیں میں دوبارہ کشمیری عوام کو زنجیریں پہنانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کشمیری عوام یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ یہ زنجیریں کب اتاری گئی تھیں جن کو آپ دوبارہ پہننے کی اجازت نہیں دیں گے۔

کی کوشش کی، کشمیری عوام نے اپنے آپ کو خریدنے سے انکار کیا۔ ۲۲ سال گزرنے کے بعد بھی لڑائی جاری ہے۔

کانگریس کو یاد رکھنا چاہیئے جس طرح پہلے اسے یہاں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے آئندہ بھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم غالباً ابھی تک اپنی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ آئندہ کیا ہوگا اس کا حال خدا کو ہی معلوم ہے، ہم اپنی تقدیر کے ساتھ کسی کو کھیلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ کشمیری عوام ان لوگوں کے ہاتھ میں اپنی تقدیر نہیں سونپ سکتے جنھوں نے ہماری عزّت و آبرو کے ساتھ کھیلا ہے۔"

وزیر اعلیٰ کی اس تقریر کا جس میں شکوہ، دھمکی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس کا کوئی اثر مقامی کانگریس نے قبول نہیں کیا۔ انھوں نے انھیں پریشان کرنے کا کام جاری رکھا۔

مقامی کانگریسیوں کے ہاتھوں کشمیر کے سب سے بڑے عوامی رہنما "شیر کشمیر" کی تذلیل سنجیدہ اور سمجھ دار طبقہ کے لیے مایوسی اور ناامیدی کا باعث بن گئی حتّٰی کہ کانگریس پارٹی میں بھی اس طریقۂ کار کے کارن پھوٹ پڑ گئی اور اس جماعت کے آٹھ ممبران اسمبلی نے کانگریس کے ساتھ قطع تعلقات کر کے اپنا جو علیٰحدہ گروپ بنایا وہ کانگریس کا باغی گروپ کہلایا لیکن انھوں نے اپنے آپ کو 'آزاد گروپ' کے نام سے منسوب کیا۔ اس گروپ میں عبدالغنی لون، محمد اشرف خان، ثناء اللہ ڈار، عبدالمجید بانڈے، محمد یٰسین شاہ، غلام حسن مسعودی، غلام قادر دوار اور علی محمد میر شامل تھے۔

بعد میں نیشنل کانفرنس کی ایک خصوصی تقریب جو پولو گراؤنڈ میں منعقد کی گئی۔ آزاد گروپ، نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گیا۔ البتہ نیشنل کانفرنس میں شامل ہو کر بہت جلد اس گروپ نے دیکھا، یہاں اس تنظیم میں انھیں وہ مقام نہیں ملا جو ملنا چاہیئے بلکہ جب ان کو شک کی نظروں سے دیکھا جانے لگا تو عبدالغنی لون کے ساتھ دو اور ممبران نیشنل کانفرنس کو خیرباد کہہ گئے۔

آٹھ ممبران کے چلے جانے سے جب کانگریس ٹوٹ گئی تو شیخ عبداللہ نے اپنے بڑے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو تنظیم میں لانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ان کے جانشین

ہونے کا دروازہ کھول دیا۔

۲۱ جولائی ۱۹۷۶ء کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو یوتھ نیشنل کانفرنس کا صدر بنایا گیا۔ رسم کے مطابق سابقہ صدر اے، آر، وانی نے ڈاکٹر فاروق سے استدعا کی کہ وہ یوتھ نیشنل کانفرنس کی صدارت قبول کریں۔ اس موقع پر فاروق عبداللہ نے فرمایا:



"یوتھ نیشنل کانفرنس نے مجھے اعتماد دے کر ملک، خاص کر نوجوانوں کی خدمت کرنے کی اہم ذمہ داری سونپی، مجھے یقین ہے کہ میں اپنے آپ کو یہ ذمہ داری نبھانے کا اہل ثابت کروں گا۔"

کانگریس اپنی کارکردگی کے کارن ٹوٹنے کے بعد بھی شیخ عبداللہ کے لیے مشکلات پیدا کرنے میں پیچھے نہیں ہٹی۔

مقامی کانگریس کو دو پھاڑ کرنے کے باوجود بھی مرکز کی کانگریس سرکار نے اس کا سنگین نوٹس کیوں نہیں لیا۔؟ اگر مرکز چاہتا تو اسی بات پر انھیں وزارت سے سبکدوش کرا دیتا۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔؟ اس لیے کہ وہ شیخ صاحب سے دفعہ ۳۷۰ ہٹانے کا کام لینا چاہتے تھے۔ اور اس کام کی عمل آوری سے پہلے وہ انھیں وزارت سے ہٹانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

مرکزی سرکار نے شیخ صاحب کا اتنا بڑا قصور محض اس لیے معاف کر دیا تاکہ وہ اپنا وعدہ پورا کر سکیں، چنانچہ جب انہیں اس وعدے کی یاددہانی کرائی گئی تو انھوں نے پیش بندی کے طور پر "لینڈ گرانٹس بل" پیش کرایا، تاکہ اس کا ردِ عمل دیکھا جائے۔

چنانچہ دفعہ ۳۷۰ کو کھوکھلا کرنے کے لیے شیخ صاحب نے گورنر کے ذریعے ایک خاص آرڈیننس جاری کروایا۔ یہ آرڈیننس جاری کرانے کے لیے اخلاقی طور پر ممبرانِ اسمبلی کا اعتماد حاصل کرنا ضروری تھا۔ مگر اسمبلی سیشن سے پہلے ہی اُسے نافذ کرا دیا گیا تاکہ وہاں اپوزیشن ممبران چیخ چیخ نہ کر سکیں۔ اسمبلی سے باہر اس قسم کا آرڈیننس جاری کرانا ایوانِ اسمبلی کی توہین سے ہرگز کم نہ تھا۔

دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کی بدنیتی اصل میں اُسی وقت عیاں ہو گئی تھی جب اس لیڈرشپ نے آئینِ ہند کی ۴۲ ویں ترمیم کے بارے میں لب سی لیے جبکہ وہ بخوبی جانتے تھے ۴۲ ویں ترمیمی بل سے دفعہ ۳۷۰ کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اور ریاست کی خصوصی پوزیشن کو ختم کرنے کا ہتھیار حاصل کر لیا ہے۔

لینڈ گرانٹس بل جس کے تحت بیرونی سرمایہ داروں کے لیے کشمیر کی سرزمین حاصل کرنے کا راستہ کھول دیا گیا۔ اس کے بارے میں شری پریم ناتھ بزاز کا کہنا ہے:

"لینڈ گرانٹس بل کا نفاذ اسی بلا تحریر اقتدار نامے کی وعدہ وفائی تھی جس کے تحت کشمیر کی حور صفت اور دُلہن نما خوبصورت سرزمین کی آغوش بے اصول سرمایہ داروں اور بے حیا پونجی پتیوں کے لیے کھول دی گئی اور جس پر عملدرآمد کا نتیجہ صرف یہی ہوتا کہ ریاستی باشندے خود اپنے وطن میں باورچیوں اور کنیزوں کی صورت اختیار کر کے عیش کا سامان اور ہوس کا ایندھن بن جاتے۔"

لینڈ گرانٹس بل جسے گورنر نے جاری کیا حسبِ ذیل ہے:

ضمیمہ

حکومت جموں و کشمیر، سول سیکریٹریٹ، محکمہ قانون۔

جموں و کشمیر لینڈ گرانٹس (ترمیمی) آرڈیننس ۱۹۷۶ء۔ آرڈیننس نمبر ۳ برائے ۱۹۷۶ء گورنر کی جانب سے جمہوریہ ہند کے ستائیسویں سال میں لاگو کیا گیا۔

اس آرڈیننس سے جموں و کشمیر لینڈ گرانٹس ایکٹ ۱۹۶۰ء میں ترمیم کرنا مقصود ہے۔

چونکہ ریاستی قانون سازیہ سیشن میں نہیں ہے اور گورنر کو اطمینان ہے کہ ایسے حالات موجود ہیں جن کے سبب اُس کے لیے فوری اقدام کرنا ضروری بن گیا ہے، لہذا گورنر اپنے ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جو اسے آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۹۱ کے تحت عطا کیے گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل آرڈیننس کے نفاذ کی منظوری دیتے ہیں:

(۱) مختصر عنوان اور عمل درآمد

اس آرڈیننس کو جموں وکشمیر لینڈ گرانٹس (ترمیمی) آرڈیننس ۱۹۷۶ء کے نام سے پکارا جائے گا۔

(۲) اس پر فوری طور پر عمل درآمد کیا جاسکے گا۔

۱۹۶۰ء کے ایکٹ ہشتم کے سیکشن (۴) کی ترمیم، جموں وکشمیر لینڈ گرانٹس ایکٹ ۱۹۶۰ء کے سیکشن (۴) کی شق نمبر (۱) میں ان الفاظ کے بجائے پابندی صنعتی اور تجارتی ترقی کے مفاد میں نرم کی جاتی ہے۔ "کی بجائے" یہ پابندی صنعتی اور تجارتی ترقی کے مفاد یا ٹورسٹ انڈسٹری کی ترقی کے مفاد میں یا دوسرے مقصد یا مقاصد جن کی حکومت وقتاً نوٹیفکیشن کے ذریعے تشریح کرتی رہے گی، کے الفاظ درج کئے جائیں۔"

دستخط :

ایل، کے، جھا۔ گورنر

نوٹ :- اس آرڈیننس کے جاری کرانے میں نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کے دل کا چور واضح ہوجاتا ہے۔ ایک طرف وہ اس کے لیے صنعتی اور تجارتی ترقی کی آڑ لے کر ملک کے سرمایہ داروں کے لیے ریاست میں آنے کا دروازہ کھول رہے ہیں لیکن دوسری طرف اس میں اس بات کی گنجائش بھی رکھی ہے کہ وہ اس سرزمین میں آکر اور یہاں بود و باش کرکے اپنی مرضی کے تحت اسے استعمال کرسکے گی اس غرض کے لیے آرڈیننس میں صاف طور پر واضح ہے۔ دوسرے مقصد یا مقاصد جن کی حکومت وقتاً فوقتاً نوٹیفکیشن کے ذریعے تشریح کرتی رہے گی۔

حکومت کے دوسرے مقصد یا مقاصد کیا ہوسکتے ہیں اس کی تشریح کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔

نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کی طرف سے اتنا کچھ کرانے کے باوجود بھی انڈین نیشنل کانگریس مطمئن نہیں ہوئی، چنانچہ اس نے دہلی سے ڈور کھینچنے کا سلسلہ جاری رکھا ۱۹۷۵ء کی تکمیل 'ایکارڈ' سے لے کر ۱۹۷۷ء کے اعتماد واپس لینے تک شیخ عبداللہ کے تخت میں اتنی لمبی لمبی کیلیں لگادی گئیں کہ وہ ایک ساعت کے لیے بھی اطمینان کے ساتھ اس تخت پر بیٹھ نہ سکے۔

اس کے ساتھ ہی ان کے تاج میں اتنے کانٹے بوئے گئے کہ وہ لمحہ بھر کے لیے بھی اس تاج کو سر پہ نہ رکھ سکے۔ شیخ عبداللہ کی وزارت کے یہ اڑھائی سال کس طرح گزر گئے اُس کے بیان سے زبان ہکلاتی ہے اور قلم لکھنے سے انکاری ہے۔

ان اڑھائی برسوں میں شیخ عبداللہ کو جن حالات سے گزرنا پڑا اور جو واقعات ان کو پیش آئے اس کو دیکھ کر ایک عام آدمی جس کے پاس ذرا سا بھی ضمیر اور تھوڑی سی بھی عزت ہو ہرگز ہرگز ایسے تخت و تاج کو برداشت نہیں کرسکتا بلکہ وہ تو اُسے ٹھوکر مار دیتا۔

شیخ عبداللہ جیسی قدآور شخصیت جو اس بات کی دعویدار تھی۔

"کبھی خم نہ ہوسکی میری گردن"

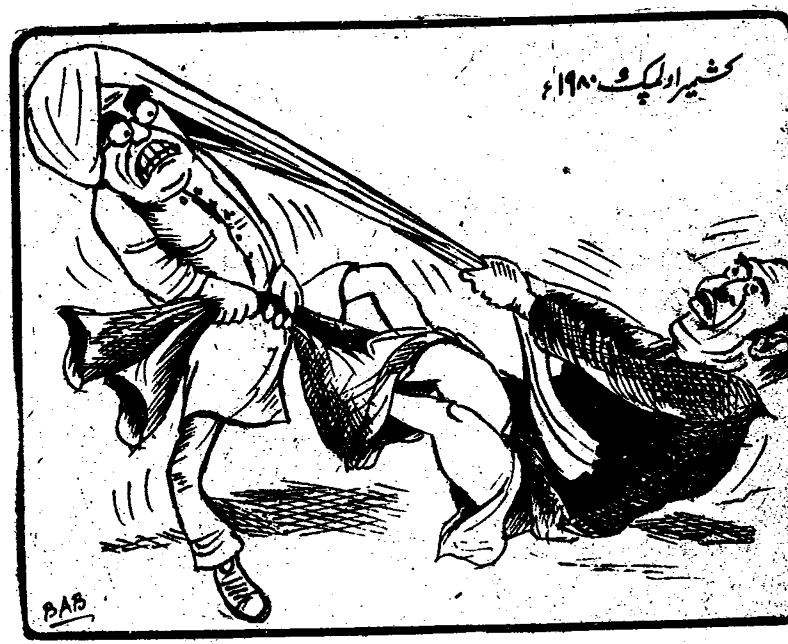
قدم قدم پر بے عزتی اور رسوائی کو برداشت کیسے کرسکی ؛

وزارت کے ان ڈھائی سالوں میں شیخ عبداللہ جیسے بین الاقوامی شہرت کے لیڈر کو ایک معمولی کانگریسی ورکر تگنی کا ناچ نچانے لگا تو مجبوراً انہیں شاہی مسجد میں ایک عوامی اجتماع کے سامنے کہنا پڑا۔

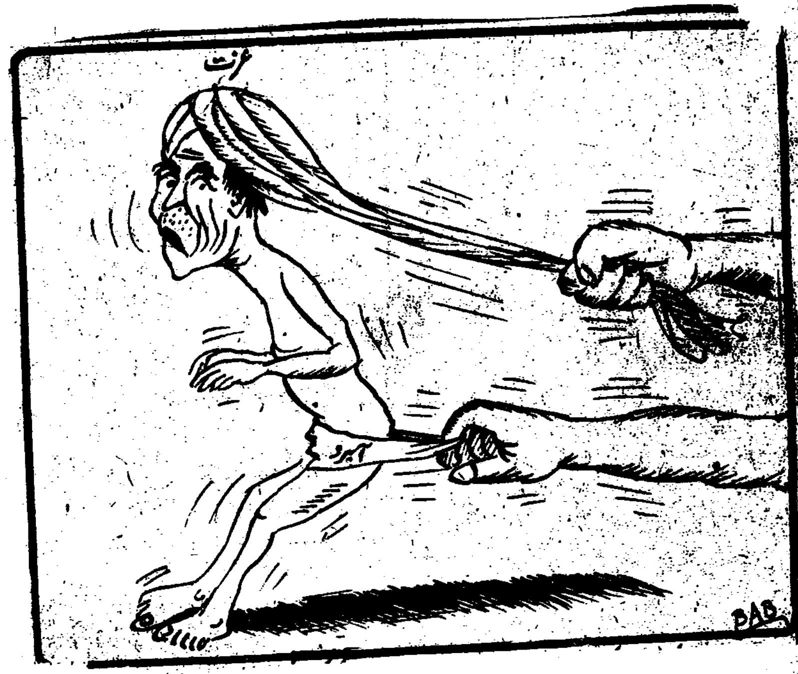
"اگر کانگریسیوں کا یہ خیال ہے کہ اقتدار سپرد کرنے سے ہماری ۱۹۳۱ء کی تحریک ختم ہوگئی ہے تو وہ ان کی غلط فہمی ہے اور خام خیالی ہے وہ چاہیں تو اسمبلی میں عدم اعتماد کرکے یہ اقتدار مجھ سے واپس لے سکتے ہیں ہم ۱۹۳۱ء کی تحریک پھر شروع کرسکتے ہیں"

وزیراعلیٰ نے کانگریسیوں کو جو یہ دھمکی دی اس کا کسی نے بھی کوئی خاص اثر نہیں لیا، دراصل ان کی آواز میں جو اثر ہوا کرتا تھا وہ زائل ہوچکا تھا۔

۱۹۷۵ء کا ایکارڈ جن حالات میں ہوا تھا اور اس کا جو ماحصل تھا وہ سب لوگوں کے سامنے آچکا تھا، اس ایکارڈ نے کشمیریوں کے رہنما کا وقار داؤ پر لگا دیا تھا۔ لہٰذا ۱۹۳۱ء کی تحریک دوبارہ شروع کرنے کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوسکا۔



کشمیری عوام کے رہنما اپنے اصول اور آدرش تیاگ کر کے کانگریس کے
رحم وکرم پر جو اقتدار حاصل کر چکے اس اقتدار سے انہیں ہٹانے کا منظر



کشمیر کے عوامی رہنما نے ایکارڈ کے تحت جب اقتدار سنبھالا تو انھوں نے
دعویٰ کیا تھا میں ریاست میں کھوئی ہوئی عزّت و آبرو کو بحال کروں گا
ریاستی کانگریس نے انکی عزّت و آبرو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر کے ان کی
جو عزّت و آبرو بحال کر دی اسی کا ایک منظر۔



مقامی کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان اقتدار کی لڑائی کا
ایک منظر

جو دے رہا ہے زمانے کو روشنی کا فریب
اُس آفتاب کے اندر بھی اک اندھیرا ہے

کشمیر میں جنتا پارٹی کا قیام

نیشنل کانفرنس کی نئی حکمتِ عملی

ریاست بھر میں نیشنل کانفرنس اور پردیش کانگریس کے درمیان حالات بالکل مخدوش تھے ۔ اُدھر ملک بھر میں افراتفری کا عالم تھا ۔ فسادات نے سارے ملک کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیا تھا ۔ ہندوستان کی اپوزیشن سرکار کا ناک میں دم کیے ہوئے تھی ۔

حالات بد سے بدتر ہو گئے تو لاچار ہو کر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے صدر مملکت فخر الدین علی احمد سے رجوع کیا اور ملک بھر میں ایمرجنسی نافذ کرا دی گئی ۔



عوام کے لیے شہری حقوق سلب کر دیئے گئے ۔

۲۹ جون کو صدر مملکت کا حکم ریاست جموں و کشمیر تک بڑھا دیا گیا ۔ ایسا ریاستی سرکار کی درخواست پر کیا گیا ۔ دفعہ ۳۷۰ کا دم بھرنے والے ملک سے ایمرجنسی کو مستعار لے آئے ۔ تمام ریاستوں میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا گیا ۔ ۴ جولائی کو مرکزی سرکار نے آر ۔ ایس ۔ ایس اور جماعت اسلامی سمیت چھبیس تنظیمیں خلاف قانون قرار دیں ، اسی روز سے وادئ کشمیر میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا گیا ۔

اندرا گاندھی فخر الدین علی احمد



(افتخار حسین انصاری)

قایم کیا۔ کانگریس کے سابقہ ممبر پارلیمنٹ ششی بھوشن جو سرینگر آئے ہوئے تھے اور یہاں گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے، مولوی محمد فاروق سے ٹیلی فون پر ملاقات کا وقت مقرر ہوا اگلے روز رات کے ۱۲ بجے کے قریب ششی بھوشن مولوی فاروق سے ملے، دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا۔

اگلے روز مولوی فاروق نے سرینگر کی سیٹ پر محمد فاروق رحمانی کی حمایت واپس لے کر اپوزیشن اتحاد کو دم بخود کر دیا۔

حسبِ عادت اور حسبِ منشاء مسلم اتحاد کو اس وقت زک پہنچائی جب اس کی بڑی ضرورت تھی۔

مولوی فاروق کی اس کاروائی سے ناراض ہو کر محمد فاروق رحمانی نے کاغذات نامزدگی داخل کرنے سے اجتناب کیا، صوفی محمد اکبر ناراض ہو کر واپس سوپور چلے گئے۔ البتہ جماعت اسلامی اور پولیٹکل کانفرنس کے لیڈروں کے مشورے پر فضل الحق قریشی نے کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دیئے۔ کاغذات داخل کر کے جب وہ واپس آئے تو حق رائے دہی اور جمہوریت منہ پھاڑے اس کا انتظار کر رہی تھی چنانچہ انہیں گرفتار کرنے کے ساتھ ہی ان کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد کر دیئے گئے۔



مولوی فاروق

میر واعظ مولوی محمد فاروق کو عوام کے ایک طبقے کی بھرپور حمایت حاصل ہے اس بات کو مدنظر رکھ کر انتخابات یا قومی مسائل میں جب جب مسلم رہنماؤں کو باہم اتحاد و اتفاق کی ضرورت محسوس ہوئی تو سب سے پہلے مولوی صاحب پر نظر پڑتی اور ان کی طرف رُخ کیا جاتا۔ مولوی صاحب ایسے موقعوں پر اپنی طرف سے بھرپور حمایت دینے کا وعدہ ضرور کرتے ہیں، لیکن اکثر حالات میں ان کی طرف سے مایوسی ہوا کرتی تھی۔

ان پر آس لگانے والے اکثر منہ کی کھاتے ہیں اور یہ شکایت کرتے ہیں کہ حکمراں جماعت کو ناراض کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔

چونکہ مولوی افتخار حسین انصاری کو کانگریس کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے

اُن کے کاغذات کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی البتہ شہر میں شیعہ سُنّی کا شوشہ پھیلا کر شیعہ سُنّی فسادات کے ذریعے میدان انتخاب کو میدان فتح میں بدلنے کا طریقہ استعمال کیا گیا۔

مولوی افتخار حسین کے شیعہ ہونے اور شیعوں کے بارے میں من گھڑت کہانیوں کا اتنا زوردار پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اکثر سنّی شیعوں کو اچھوت سمجھنے لگے۔ شیعوں کے بارے میں بعض ایسی خبریں زبانی زبانی دُور دُور تک پہنچائی گئیں کہ بیشتر لوگ شیعوں کو دوسری مخلوق سمجھنے لگے۔

اس کے باوجود بھی نیشنل کانفرنس اور اس کی لیڈر شپ کے مخالف مولوی افتخار حسین انصاری کی حمایت کرنے لگے تو مجاہد منزل سے نیشنل فوج کے لئے خصوصی کمک بھیج دی گئی، جس سے مولوی انصاری کے جلسے اور جلوس تتر بتر ہونے لگے۔

انصاری صاحب پر حملے شروع ہو گئے۔ ان کی جیپ جلائی گئی اور جگہ جگہ پتھراؤ کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔

شیعہ سنّی کے بعد شیر اور بکرا لڑائی میں طرفین کے بہت سارے لوگ زخمی ہوئے۔

پولنگ کے دن وہی حربے استعمال کیے گئے جو نیشنل کانفرنس ایسے موقعوں کے لیے ریزرو رکھتی آئی ہے۔ حلقہ انتخاب اسلام آباد میں کانگریس کے امیدوار محمد شفیع قریشی کے خلاف نیشنل کانفرنس خفیہ مہم چلا رہی تھی۔ بارہمولہ حلقہ انتخاب میں عبدالاحد وکیل کا مقابلہ جماعت اسلامی کا محبوس لیڈر سیّد علی شاہ گیلانی کر رہا تھا۔

جماعت کے بیشتر کارکن پہلے ہی ایمرجنسی کی آڑ میں گرفتار کر لیے گئے تھے اور جو باقی ورکر گیلانی صاحب کی الیکشن مہم میں حصّہ لے رہے تھے دوسرے دن ان کو گرفتار کر کے غائب ہی کر دیا جاتا۔

اس انتخاب میں وادیٔ کشمیر سے نیشنل کانفرنس اور کانگریس اپنے پُرانے ہتھکنڈوں سے انتخاب جیت تو گئی لیکن ہندوستان بھر میں جنتا پارٹی نے حکمراں کانگریس کو برسوں کے بعد عبرتناک شکست دے کر اقتدار حاصل کر لیا۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی راج نرائن کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ ان کے بیٹے سنجے گاندھی کے ساتھ کانگریس کے کئی لیڈر لڑھک گئے۔ کانگریس کی اس شکست نے اس تنظیم کا شیرازہ

بکھیر کر رکھ دیا۔

اس شکست کا ذمّہ دار مجموعی طور پر مسز اندرا گاندھی کی آمرانہ پالیسی کو ٹھہرایا گیا۔ آزادی کے تیس برس بعد کانگریس کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مسز اندرا گاندھی کے بہت سے دیرینہ ساتھی اور کانگریس کے بعض اہم ستون ان کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہوگئے۔

۲۴ مارچ کو مرارجی ڈیسائی ہندوستان کے وزیر اعظم بن گئے اور اسی روز سے ہندوستان کی تاریخ میں جنتا پارٹی کا باب درج ہوگیا۔

مرکز میں کانگریس کی شکست نے ریاست میں کانگریس پارٹی کے ہوش و حواس اُڑا دیئے اور وہ ہاتھ پاؤں مار کر شیخ عبداللہ کو اقتدار سے محروم کرنے میں جلد بازی دکھانے لگے۔

مرکز میں کانگریس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو ریاست میں شیخ عبداللہ کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ شیخ عبداللہ یا تو وزارت چھوڑ دیتے نہیں تو وزارت ان کو چھوڑ دیتی۔ بہر حال قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کانگریس نے شیخ عبداللہ سے اعتماد واپس لے کر مفتی محمد سعید کو پارٹی کا لیڈر منتخب کیا، ایک طرح سے انھوں نے مفتی محمد سعید کی سربراہی میں کابینہ بھی تشکیل دی اور جب وہ اپنی اکثریت جتانے گورنر کے پاس گئے تو گورنر نے مرکز سے رجوع کیا۔


مفتی محمد سعید

اسی دوران وزیر اعلیٰ نے اسمبلی توڑنے کی سفارش کی جسے مرکز کی ہدایت پر گورنر ایل، کے جھا نے قبول کر کے مقامی کانگریس کا خواب چکنا چور کر دیا۔

شیخ صاحب کا وزارت سے محروم ہونا ہی تھا کہ دبے کچلے اور ناراض اشخاص سب اکٹھے ہوگئے۔ ان کے پرانے دشمن نئے دشمنوں کے ساتھ مل گئے۔

وادیٔ کشمیر کا "کشمیر موٹر ڈرائیور ایسی ایشن"، جو ۱۹۳۱ء سے برابر ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ اور جن کے بل بوتے پر شیخ صاحب نے کشمیر میں مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کو سر اُٹھانے نہیں دیا، جن کی پشت پناہی سے انہوں نے مسلم اتحاد کو یہاں پنپنے نہیں دیا۔ اور جن کے مکمل اور بھرپور تعاون سے وہ پاکستان کو مسترد کر کے ہندوستان

کو اپنا سکا۔ وہ ایسوسی ایشن دو حصّوں میں بٹ گئی۔

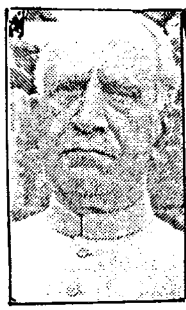
اس کے ایک حصّے نے باغی ہو کر سرینگر میں جنتا یونٹ قائم کیا اور جنتا پارٹی کا پہلا جھنڈا اسی باغی گروپ نے یہاں نصب کیا۔

اسلام آباد کے غلام رسول کوچک اور ڈاکٹر عبدالمجید جو شیخ عبداللہ کے دیرینہ ساتھی اور ان کے زبردست حامی تھے۔ فوراً سرینگر آ گئے اور بڑے ڈاک گھر کے پاس میونسپل پارک جو شیرِ کشمیر پارک بنا دیا گیا تھا اس کا سائن بورڈ اتروا کر اس کی ارتھی بنا دی۔

چند لوگوں نے اس ارتھی کو کندھا دیا اور باقی لوگ اس ارتھی کے ساتھ چل کر شیخ عبداللہ کی ذات پر رکیک حملے کرنے لگے۔

ارتھی کو لال چوک پہنچا کر اور بیچ سڑک پر رکھا گیا۔ بعض من چلے جوانوں نے اس سائن بورڈ کو پاؤں تلے روندھا پھر اس پر پرانے کپڑے اور گھاس پھوس رکھ کر اسے نذرِ آتش کیا گیا ـــ جس وقت "شیرِ کشمیر پارک"، نام کا یہ سائن بورڈ جل رہا تھا ـ کئی جوشیلے جوان اُچھلتے کودتے طوفانِ بدتمیزی کر رہے تھے، یہ سارا کھیل غلام رسول کوچک اور ڈاکٹر عبدالمجید کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ کے، ایم، ڈی کا ناراض یونٹ ان کا ساتھ دے رہا تھا ـــ شیخ صاحب کے بعض حریف جو برسوں سے گوشہ نشین ہوگئے تھے سامنے آ کر ایکارڈ کی مخالفت کرنے لگے ـــ جگہ جگہ نیشنل کانفرنس کے جھنڈے، سائن بورڈ اور بینر اُتارے گئے

جنتا پارٹی کی شاخ قائم کرنے کے لیے مرکز سے اشوک مہتہ، نانا جی دیشمکھ اور پرتاپ سنگھ یہاں آگئے انہوں نے مولانا مسعودی غلام محی الدین قرہ اور مولوی فاروق کے ساتھ کئی میٹنگیں کرنے کے بعد ۱۸ اپریل کو مولانا مسعودی کی سربراہی میں مقامی جنتا پارٹی قائم کی ان کے ساتھ جو دوسرے لیڈر جنتا پارٹی میں شامل ہوگئے، ان میں مولوی فاروق، غلام محی الدین قرہ، پریم ناتھ بزاز،


(غلام محی الدین قرہ)


مولانا مسعودی


(مولوی فاروق)

عبدالغنی لون، مولوی افتخار حسین انصاری، شمیم احمد شمیم، عبدالرشید کابلی، غلام رسول کوچک، ڈاکٹر عبدالمجید۔ پیرزادہ علی شاہ، جی، ایم، باون، غلام نبی خیال، چوہدری محمد شفیع اُوم صرّاف، غلام نبی اونتو، سردار سنت سنگھ تیغ، محمد امین نحوی، محمد امین۔ بٹ، اور دوسرے قابلِ ذکر ہیں۔

ان سبھوں کے اکٹھے ہونے سے نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ یقیناً خوفزدہ ہوگئی مولوی فاروق کے تین ساتھی عبدالرشید کابلی، سلیم انور دار اور صوفی احمد جنتا پارٹی میں شامل کیے گئے۔

اسی دوران مولوی فاروق دہلی روانہ ہوگئے، جہاں انھوں نے اپنے ایک اخباری بیان میں کہا:۔

"جنتا پارٹی میں میری شمولیت کا سوال انتخاب کے بعد زیرِ غور آئے گا جنتا پارٹی کو عوامی ایکشن کمیٹی کی مکمل حمایت ملتی رہے گی، جموں و کشمیر اور نئی دہلی میں جو لوگ مجھے سٹیٹ جنتا پارٹی کی قیادت سنبھالنے کے لیے مسلسل اصرار کر رہے ہیں۔ میں ان پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی عہدہ یا منصب کا طالب نہیں میں کسی عہدے کے بغیر جنتا پارٹی کا اپنا بھرپور تعاون دے سکتا ہوں"

نیشنل کانفرنس نے ان پر الزام لگایا کہ مولوی فاروق دفعہ ۳۷۰ ختم کرنے کے لیے جن سنگھ سے سازباز کر رہا ہے۔ ایسا ہی الزام انہوں نے مولانا محمد سعید مسعودی پر بھی لگایا نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ نے دفعہ ۳۷۰ کی رکھوالی کرنے کا الیکشن ایشو بنا لیا۔

رات بھیگی، راہ پیچیدہ، مُسافر تشنہ کام
جا رہا ہے کس طرف یہ کاروانِ تیز گام

الیکشن مہم میں نیشنل کانفرنس کا ایک نیا اپروچ

مقامی جنتا پارٹی کو مرکزی سرکار کی مکمّل حمایت حاصل ہے — اور یہ پارٹی یہاں اقتدار حاصل کر کے ہی رہے گی اس خیال نے نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو سخت اضطراب میں مبتلا کیا۔ ان کی برسوں کی عبادت صرف ڈھائی سال تک حکومت کرنے کے بعد ضائع ہو رہی تھی اور سیاسی میدان میں ان کو ہزیمت اٹھانا پڑ رہی تھی، اس خیال سے وہ سخت دِل برداشتہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ نیشنل کانفرنس کے بڑے لیڈر شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو دِل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے شیخ صاحب کو مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔


شیخ عبداللہ

شیخ صاحب کے دل کے دورے کا چرچا ہوا تو ان کے علاج کے لیے آل انڈیا میڈیکل سائنسز دہلی کے دو ممتاز ڈاکٹر مسٹر ایس، کے بجاج اور مسٹر ایم، ایل، بھاٹیہ سرینگر بھیج دیئے گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر علی محمد جان اور ڈاکٹر غلام قادر علاقہ بند کے ہمراہ شیخ عبداللہ کا معائنہ کیا۔

نیشنل کانفرنس نے اپنے لیڈر کے دل کا یہ دورہ مخالفین کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

شیخ صاحب کے دل کے دورے کی خوب پبلسٹی کرائی گئی تاکہ اگر الیکشن میں ان کی ہار ہوئی تو انہیں کہنے کا موقع مل سکے کہ ہم الیکشن مہم لیڈر کے بغیر چلا نہ سکے اور ہماری غیر موجودگی کا اپوزیشن نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مرکزی سرکار اُن کی پُشت پناہی کر رہی تھی۔

دل کے اس دورے کی پبلسٹی بڑی کارگر ثابت ہونے لگی تو ان کی صحت یابی کے لیے آستانوں اور خانقاہوں میں دعائیہ مجالس منعقد کی جانے لگیں، جگہ جگہ بھیڑ بکرے نذر کیے جانے لگے۔

مرزا محمد افضل بیگ، بیگم شیخ عبداللہ اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ شیخ صاحب کی صحت یابی کے لیے دعائیہ مجلسوں میں لوگوں کو جنتا پارٹی سے جسے یہ لیڈر جن سنگھ کہا کرتے تھے لوگوں کو خبردار کرنے لگے۔ مرزا محمد افضل بیگ عوامی اجتماع میں سبز رومال اور پاکستانی نمک


(بیگ)


(بیگم شیخ عبداللہ)


(فاروق عبداللہ)

کی ڈلی لے کر عوامی جلسوں میں اسکی نمائش کرا کر واضح الفاظ میں کہنے لگے:

"اب راول پنڈی کا راستہ زیادہ دور نہیں ـــ برسر اقتدار آنے پر نیشنل کانفرنس اسمبلی میں ہندوستان سے علیحدگی کا ایک بل پیش کرے گی، نیشنل کانفرنس برسر اقتدار آتے ہی سب سے پہلے راولپنڈی روڈ کھول دے گی۔ نیشنل کانفرنس دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت کرے گی۔ ہندوستان کو کوئی حق نہیں کہ وہ ہماری اندرونی خود مختاری میں دخل دے، اس پارٹی نے قوم سے جو وعدے کیے وہ پورا کرے گی"۔



نیشنل کانفرنس کی اس سیاسی مہم کو کانگریس نے تکڑم بازی سے تعبیر کیا اور کانگریس کے لیڈر سید میر قاسم نے اسلام آباد کے ڈاک بنگلہ میں کانگریسی کارکنوں کے اجتماع سے خطاب فرمایا:۔

شیخ عبداللہ کی عزت و آبرو، مرزا افضل بیگ کی رائے شماری ـ غلام محی الدین کا پاکستان ذاتی مفادات کے لیے ایک جنگ تھی ـــ انہوں نے فرمایا:۔

"ہم اس بات کے ہرگز قائل نہیں کہ یہاں کے نہتے عوام کو فریب اور

دھوکے میں رکھ کر ان کے بنیادی حقوق کے ساتھ کھیلیں کانگریس نے ہمیشہ عوام کی خدمت کو ترجیح دی ہے اور ہم یہ خدمت برابر انجام دیتے رہے ہیں۔

کانگریس کو اپنی ساری غلطیوں کی سزا مل چکی ہے، اور ہم اپنے اعمال کو درست کر کے پھر قوم کی خدمت کرنے کے لیے اپنے آپ کو کمربستہ کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کانگریس کے ہاتھ پھر سے اقتدار آجائے گا ہم نے عوام کے مفاد کی خاطر شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سونپ دیا تھا لیکن انہوں نے اسے اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے کنبہ پروری رشوت خوری اور لوٹ کھسوٹ کو فروغ دیا۔

شیخ عبداللہ کی عزت و آبرو، بیگ صاحب کی رائے شماری اور محی الدین قرہ کا پاکستان محض ذاتی مفادات کی تلاش کی خاطر ایک جنگ تھی اور یہ آج پھر ایکبار انہی مقاصد کے لیے لڑی جارہی ہے۔

شیخ صاحب کے بڑھاپے کا لحاظ کر کے ہم نے ان سے اپیل کی تھی کہ وہ ہمیں خدمت کا موقع دیں لیکن شیخ صاحب کو اپنے بڑھاپے کا کوئی خیال نہیں وہ ۸۱ سال کی عمر میں بھی اپنے آپ کو جوان سمجھتے ہیں شیخ صاحب ایک ناکام سیاستدان اور ناکام حکمراں ثابت ہوئے ہیں ان کی ناکامیوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ شیخ صاحب ہماری جو مخالفت کرتے ہیں وہ صرف بانہال تک اپنا اثر رکھ سکتی ہے جبکہ انڈین نیشنل کانگریس پورے ملک خاص کر جموں کشمیر اور لداخ کی نمائندگی کا حق ادا کر چکی ہے اور ادا کر سکتی ہے۔

جنتا پارٹی چوں چوں کا ایک مربہ ہے۔ اس جماعت پر جن سنگھ کا غلبہ ہے۔ جموں و کشمیر کی وحدت کو زبردست خطرہ ہے لہذا عوام کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ شیخ صاحب اور بیگ صاحب کا یہ نعرہ کہ ریاست کو ہند سے الگ کر دیا جائے گا، اب بہت فرسودہ ہو چکا ہے اور اس کا سارا اثر ۱۹۷۵ء میں زائل ہو چکا ہے ہم نے ان کے دفعہ ۳۷۰ کے دعوے دیکھے ہیں، عوام اتنے بے وقوف نہیں کہ وہ

بار بار اُن کے جھانسے میں آئیں۔

اس نازک وقت میں کانگریس ہی ملک کو انتشار سے بچا سکتی ہے۔"

کانگریسی لیڈروں کے ساتھ ساتھ جنتا پارٹی نے شیخ عبداللہ کی دھمکیوں اور اُن کی بلیک میلنگ کا سخت نوٹس لیا، چنانچہ پارٹی کے مقامی لیڈروں نے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا:-

"دفعہ ۳۷۰ کے مغالطے میں ہی آج تک شیخ عبداللہ کی بناسپتی لیڈر شپ قائم رہی، اسی دفعہ کے تحت ریاست میں سالہا سال سے تنازعہ اور ٹکراؤ کے ماحول کو جنم دیکر اپنا الّو سیدھا کیا۔ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی ہوس نے پہلے بھی شیخ عبداللہ کو اصول شکنی پر مجبور کیا اور پھر اسی تناؤ اور ٹکراؤ کی صورت کو جنم دینے کے لیے دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت اور ضمانت کا ڈھونگ رچایا۔



(قائداعظم محمد علی جناح)

قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی پیشین گوئی کتنی صحیح نکلی کہ شیخ عبداللہ سیاسی موت مریں گے اور آج شیخ عبداللہ سیاسی موت مر چکے ہیں اس سے بڑھ کر سیاسی موت اور کیا ہو سکتی ہے کہ کل کے واحد لیڈر آج ممبر اسمبلی کے لیے لڑ رہے ہیں کیا پتہ اس ریاست کے گستاخ لوگ کیا کر بیٹھیں۔

دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت کا دم بھرنے والے یہ بھول رہے ہیں کہ ۷۵ کا ایکارڈ کرتے وقت اس دفعہ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس ایکارڈ کی رو سے شیخ صاحب نے گورنر کی مراعات اور تنخواہ مقرر کرنے اور الیکشن کے لیے ریاستی اسمبلی کے اختیارات صدر جمہوریہ ہند کو سونپ دیئے ہیں۔

کشمیر اسمبلی اگر کوئی قانون پاس کرنا چاہتی تو اُسے صدر مملکت کی منظوری حاصل کرنا پڑے گی، اس ایکارڈ کے بعد ریاست کے پاس قانون ساز کونسل توڑنے کا اختیار بھی صدر مملکت کو سونپ دیا گیا ہے۔

آئین ہند کی دفعہ ۳۶۸ کے تحت کشمیر ایکارڈ کے ذریعے ریاستی اسمبلی کے فیصلوں کو صدر جمہوریہ کی مرضی کے تابع رکھنے کے لیے ایک آرڈیننس جاری کرنے کے بعد دعوی کرنا کہ ہم دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت کریں گے بھولے بھالے عوام کو صریحاً دھوکہ دینے والی بات ہے، دفعہ ۳۷۰ کی حالت آپ نے اس مکان کی جیسی بنا دی جس کی اندرونی ساری دیواریں ڈھائی گئی ہوں صرف بیرونی چار دیواریں کھڑی ہیں۔"

وادی بھر میں الیکشن مہم زوروں پر جاری تھی۔ دعویٰ اور جواب دعویٰ زور شور سے ہو رہے تھے۔ نیشنل کانفرنس اور جنتا پارٹی کے جلسے اور جلوس تصادم کی صورت اختیار کر گئے۔ جنتا پارٹی نے جہاں کہیں جلسہ کا پروگرام رکھا تو اس کا توڑ کرنے کے لیے اگلے روز نیشنل کانفرنس نے یہاں اپنا اسٹیج کھڑا کیا۔

اس سلسلے میں اسلام آباد چوک میں جنتا پارٹی کے تحت بلائے گئے ایک جلسہ میں اس پارٹی کے ایک لیڈر خواجہ غلام محی الدین قرہ نے کثیر عوامی اجتماع سے خطاب فرمایا۔

"...... مرزا محمد افضل بیگ کے ۱۵ مئی کی اسی چوک میں کی گئی اُن کی تقریر جس میں انھوں نے فرمایا تھا نیشنل کانفرنس کو ووٹ دینا 'رائے شماری' کے برابر ہے، اور جیب سے سبز رومال نکال کر کہا" رائے شماری" کا مطلب آپ جانتے ہیں کیا ہے؟ — نیشنل کانفرنس یہاں کی واحد جماعت ہے جو یہاں کے لوگوں کی عزت و آبرو کی ضمانت دے سکتی ہے جو دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت کر سکتی ہے اور راولپنڈی روڈ کھول سکتی ہے۔"

غلام محی الدین قرہ نے بیگ صاحب کے بیان کے بارے میں کہا۔

" رائے شماری کا نعرہ دینے والے سیاسی ٹولے کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ سیاست سے سبکدوش ہو جائیں کیونکہ یہی وہ ٹولہ ہے جو رائے شماری کرانے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا۔

اس ٹولے نے ریاست میں کنبہ پروری، اقربا نوازی، لوٹ کھسوٹ

جبر وستم اور عوام کی بے حرمتی کا جو سلسلہ جاری رکھا، اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ ۱۹۳۱ء سے لیکر ۱۹۷۷ء تک ان کی سیاسی جد و جہد کا حاصل ایک کرسی کی تلاش رہی ہے اور اپنے ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر نام نہاد لیڈروں نے کبھی بھی قوم کے غم میں اپنے آپ کو بے چین نہیں رکھا بلکہ ۱۹۵۳ء میں اقتدار کی محرومی کے بعد" اقتدار کی واپسی "کا نشہ ان کے دماغوں پر سوار رہا آج یہ لوگ پھر کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے کچھ جذباتی اور فرقہ وارانہ نعروں کو ہوا دے رہے ہیں۔ آج یہ لوگ پاکستان کو استعمال کر کے اپنے سیکولرزم کو بھی بھول رہے ہیں جس سیکولرزم کے یہ بڑے دعویدار تھے۔

رائے شماری کا نعرہ دے کر ان لوگوں کا مقصد صرف ووٹ حاصل کر کے سلطان کشمیر بنتا ہے لیکن ہم اور ہمارے غیور اور باغی جوان کسی شخص کو سلطان کشمیر بننے کی قطعاً اجازت نہیں دے سکتے، دفعہ ۳۷۰ کی تسبیح کرنے والے قومی غداروں کو دفعہ ۳۷۰ کی رٹ لگانے کا کوئی حق نہیں کیونکہ انہی لوگوں نے اس دفعہ کو کھوکھلا کر دیا۔ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے ان لوگوں نے لینڈ گرانٹس بل پیش کیا اس وقت دفعہ ۳۷۰ اور اس کی عصمت کا خیال کیوں نہیں ستایا دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت وہ لوگ نہیں کر سکتے جنہوں نے ایک عدد نوکری کے لیے ریاست جموں وکشمیر کی سودے بازی کر کے ہماری آزادی کے ستون کو ہلا کر رکھ دیا۔

خواجہ غلام محی الدین قرہ کے بعد غلام محی الدین شال ایڈوکیٹ، ڈاکٹر عبدالمجید اور غلام رسول کوچک نے اپنی تقریروں میں لگ بھگ انہی خیالات کا اظہار کیا، البتہ انھوں نے اس میں مزید اتنا اضافہ کر دیا۔

" نیشنل کانفرنس اپنے دو سالہ دورِ حکومت میں ننگی ہو چکی ہے، اس نے اپنا اعتماد کھو دیا ہے اس لیے یہ جماعت دوبارہ اقتدار پر قابض نہیں ہو سکتی "

اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس اور جنتا پارٹی نیشنل کانفرنس کا کچا چٹھا نکال کر ان کا ظاہر و باطن پبلک اجتماع میں اُجاگر کر رہے تھے، لیکن نیشنل کانفرنس کی حکمت عملی جو اوّل اور آخر دھوکہ اور فریب پر مبنی تھی بڑی کارگر ثابت ہونے لگی۔

وادیٔ کشمیر کے وہ لوگ جو بار بار اپنے عمل سے یہ ثابت کرتے آئے ہیں ہم انسانی صورت کے بھیڑ اور بکریاں ہیں۔ ہم غیرت اور شعور سے بالکل مبرّا ہیں۔ نیشنل کانفرنس کے جھانسے میں آگئے، وہ اس انتخاب کو" رائے شماری یعنی پاکستان" کا تصوّر لے کر میدان کارزار میں کود پڑے جہاں انہیں راولپنڈی روڈ کھولنے کی بشارت دے کر پاکستان کے پرچم کے طور پر سبز رومال اور پاکستانی سرزمین کے طور پر پاکستانی نمک دکھایا گیا۔ تو انھوں نے جنتا پارٹی کو ہندوستان اور نیشنل کانفرنس کو پاکستان سمجھ کر رائے شماری کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھا۔

مرکز سے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی، چرن سنگھ، ہیم وتی نندن بہوگنا۔ اٹل بہاری باجپئی، اور بابو جگجیون رام کی آمد نے عام لوگوں کو جنتا پارٹی سے متنفر کر دیا۔



بہوگنا — چرن سنگھ — (مرارجی ڈیسائی)

اسی دوران سبھرامنیم سوامی نے دفعہ ۳۷۰ اور بابو جگجیون رام نے سقوطِ ڈھاکا اور بنگلہ دیش کی فتح کا ذکر کیا تو کشمیری مسلمانوں نے اسے ایک چیلنج سمجھ لیا، مرارجی ڈیسائی کئی دیہات کا دورہ کرنے کے بعد سرینگر آئے تو مولوی فاروق نے انہیں میر واعظ منزل میں مدعو کیا، مولوی صاحب کے عقیدت مندوں نے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کا لامثال استقبال کیا، عورتوں نے روایتی کشمیری وَن وُن میں ان سے مخاطب ہو کر گایا۔

" سبز دستارس نبیؐ چھوئے راضی پاکستانک غازی آؤ "

(یعنی آپ کے سبز دستار پر نبی صلعم راضی ہیں، آپ یہاں پاکستان کے غازی آئے ہیں)

مولوی فاروق کے حامی سبز ہلالی پرچم لیے وزیر اعظم کا استقبال کر رہے تھے اور مرارجی ڈیسائی سبز پرچم کو پاکستانی پرچم سمجھ کر اندر ہی اندر کُڑھ رہے تھے۔

مولوی فاروق نے جب بیٹھک میں مرارجی ڈیسائی کو ایک خاص کرسی پر بٹھا دیا تو مولوی صاحب نے ان سے کہا۔

"اس کرسی پر کبھی قائداعظم محمد علی جناح بیٹھتے ہیں"۔

مرارجی ڈیسائی نے دونوں ہاتھوں سے کرسی کو تھام کر طنزیہ انداز میں کہا:

"پھر تو ٹھیک ہے۔ میں جناح صاحب کی کرسی پر بیٹھا ہوں"۔

مرارجی ڈیسائی میرواعظ منزل میں جب داخل ہوئے تو ان کے باڈی گارڈ کے ہاتھ میں سرخ ہرے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک ڈبہ تھا جسے دیکھنے والے مٹھائی کا ڈبہ سمجھ بیٹھے، چنانچہ جناح صاحب کی کرسی پر بیٹھنے کے دوران جب مرارجی نے یہ ڈبہ مولوی صاحب کو پیش کیا تو مولوی صاحب نے اسے اپنے گھر یلو نوکر کو اندر رکھنے کے لیے دینا چاہا۔

مرارجی ڈیسائی نے فوراً مولوی صاحب سے کہا اسے آپ اپنے پاس ہی رکھ لیجئے۔ یہ مٹھائی خاص آپ کے لیے ہے۔ مولوی صاحب کو اشتیاق ہوا انہوں نے ڈبہ کھولنا چاہا تو مرارجی نے انہیں پھر روک دیا اور کہا اسے آپ بعد میں بھی کھول سکتے ہیں۔ ایسی جلدی کیا ہے؟

مولوی صاحب اور مرارجی ڈیسائی کی یہ نوک جھونک دیکھنے والے بڑے محظوظ ہو رہے تھے۔

شری مرارجی ڈیسائی سرینگر کا دورہ مکمل کر کے دہلی گئے، تو سرینگر میں اسلامی پرچم اور پاکستان کی گونج ان کا تعاقب کر رہی تھی، چنانچہ وہ پہلی فرصت میں سابقہ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی سے ملنے اُن کی کوٹھی پر گئے۔ اور کشمیر کے بارے میں اُن سے مشورہ لینے لگے۔

مسز اندرا گاندھی نے مرارجی ڈیسائی کے سامنے واضح کر دیا کہ:

"کشمیر میں ہمارے لیے صرف شیخ محمد عبداللہ قابلِ اعتبار شخصیت ہیں ایک وہی شخص ہے جو وہاں ہندوستان کا رکھوالا ہے، وہ آپ سے اور مجھ سے کم ہندوستانی نہیں لہٰذا ان کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ خانی نہ کی جائے"۔

اس موقع پر مرارجی ڈیسائی نے مسز اندرا گاندھی سے کہا۔

"لیکن آج کل وہ اپنے ڈھنڈورچیوں کے ذریعے پاکستان کو خوب اُچھال رہے ہیں۔ راولپنڈی روڈ کھولنے کا پرچار کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہلواتے ہیں کہ ہم الیکشن میں کامیاب ہوئے تو ہم بھارت کے ساتھ الحاق کو توڑ دیں گے"۔

مسز اندرا گاندھی نے جواب دیا:۔

"یہ سب الیکشن اسٹنٹ ہے اور کچھ نہیں —— الحاق توڑنے اور راولپنڈی روڈ کھولنے کی بات ہی نہیں۔ ان کا بس چلے تو وہ کشمیر اور پاکستان کے درمیان دیوارِ چین کھڑا کر سکتے ہیں۔

آپ شیخ عبداللہ پر بھروسہ کریں گے تو وہ آپ کے کام آ سکتا ہے۔ دفعہ ۳۷۰ بھی وہی ہٹا سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں انہوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے"۔

ایسا سن کر مرارجی ڈیسائی بولے:۔

"میں نے بڑی غلطی کی جو میں آپ سے ملے بغیر کشمیر گیا میں تو وہاں سے گھاٹے کا سودا کر کے آیا ہوں"۔

۳۰ جون کو مولوی فاروق کی قیادت میں جامع مسجد سے لوگوں کا ایک بھاری جلوس نکل کر حضوری باغ میں اختتام پذیر ہوا، اس جلوس میں مولوی فاروق کے حامیوں نے شیخ عبداللہ کی بیماری کا ناٹک دکھا کر اُن کی ذات کی تذلیل کی اور الیکشن میں نیشنل کانفرنس کی ہار کی پیشگی اطلاع دی۔ بکروں کی اس حرکتِ نازیبا نے اُن لوگوں کو بھی نیشنل کانفرنس کی طرف مائل کر دیا جو اس تنظیم سے بدظن ہو کر خاموش تماشائی بننا چاہتے تھے۔

یکم جولائی کو نیشنل کانفرنس کا جوابی جلوس نکلا۔ اس میں مولوی فاروق اور بکروں کی خوب تذلیل کی گئی۔

انتخاب کے دن کشمیری عوام نے نیشنل کانفرنس کی آڑ میں پاکستان کو ووٹ دیئے۔ شیخ محمد عبداللہ کو اس فتح سے نیا جنم مل گیا۔

الیکشن کے دوران جن کے بارے میں طرح طرح کی باتیں پھیلائی جارہی تھیں ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو اُنھیں پولو گراؤنڈ لوگوں کے درشن کے لیے لایا گیا۔

۷ جولائی کو انھوں نے اسی پولو گراؤنڈ میں عوامی اجتماع کے سامنے نحیف آواز میں فرمایا:۔

عوام کی دعاؤں کے طفیل مجھے نئی زندگی ملی، اس کے لیے میں اپنی اور اپنے خاندان کی طرف سے عوام کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

اس کے بعد انھوں نے کلام پاک کی تلاوت کی اور اقبالؔ کے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا:۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

باب ۲

نیشنل کانفرنس کا دورِ حکومت

عوام مایوسی کے شکار

خاندانی راج کا چلن

شُعلوں کی حُکومت ہے چمن زیر و زبر ہے
ہم نے جو لگایا تھا شجر اُس کا ثمر ہے

•

جز

نیک ناموں نے ڈبو دی ناؤ ننگ و نام کی
اور جو بدنام تھے ۔ بدنام ہی رہتے رہے

نیشنل کانفرنس کی حکومت

نئی وزارت سے عوام کی توقعات

مرکز میں جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں کشمیری عوام نے نیشنل کانفرنس اور ان کی لیڈر شپ کو بھاری اکثریت سے فتح دلائی ۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک ان رہنماؤں کے کارناموں کو دیکھا جائے تو یہ عوام کی طرف سے مسترد ہونے کے قابل تھے، چونکہ کشمیری مسلمانوں کی بیشتر آبادی عقل و شعور اور غیرت کے بجائے جذبات سے کام لیتی ہے، اور الیکشن کے موقعوں پر سبز رومال، پاکستانی نمک دیکھ کر راولپنڈی کی آس میں، رائے شماری، پر عملی جامہ پہناتی ہے اور اس طرح نیشنل کانفرنس لیڈر شپ کے ہاتھوں ایک دو بار نہیں بلکہ بار بار دھوکا کھاتی آئی ہے ۔

نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ نے عوام کو جتنا زیادہ دھوکا اور فریب دیا اس سے کہیں زیادہ عوام نے انھیں پیار اور اعتماد دیا ۔



شیخ عبداللہ

۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک شیخ عبداللہ کی وزارت ریاست کی معیشت سدھارنے کے بجائے ریاست کے مستقبل کے جھمیلوں اور سازشوں میں گزری ۔

۱۹۷۵ء کے ایکارڈ کے بعد دوبارہ حکمراں بن گئے تو وہ کانگریس کے رحم و کرم پر رہ کر کوئی ٹھوس کام نہ کر سکے ڈھائی سال کا عرصہ کانگریسیوں کے ناز نخرے اٹھانے میں صرف ہو گیا ۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں عوام نے انہیں بلا شرکتِ غیرے

مسندِ وزارت پر ایسا بٹھا دیا کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکا۔

اگر یہ کہا جائے کہ برسوں کی جد وجہد کے بعد پہلی بار ۱۹۷۷ء میں شیخ محمد عبداللہ حقیقی معنوں میں حکمراں بن گئے تو غلط نہیں ہوگا۔ عوام کے لیے کچھ کر گزرنے کے لیے اگر ان کے دل میں کوئی چاہت تھی تو ان کو پورا کرنا اب ان کے بس میں تھا۔ "نیا کشمیر کا خواب" تعبیر کے روپ میں پیش کرنے کے لیے اب وہ پوری استطاعت رکھتے تھے۔ کشمیری عوام نے اپنا تن، من اور دھن دے کر شیخ عبداللہ کو جس غرض وغایت کے لیے اپنا رہنما اپنا قائد اور اپنا حاکم مانا تھا وہ غرض وغایت پورا کرنے کی گھڑی اب آ گئی تھی۔

آج شیخ محمد عبداللہ کشمیری عوام کا ایک ایسا حکمراں بن کر آیا تھا جس کے پیچھے عوامی طاقت تھی اور عوامی طاقت دنیا کی سب سے بڑی قوت مانی جاتی ہے۔

کشمیری عوام نے شیخ عبداللہ کو سر آنکھوں پر بٹھا دیا انہیں اپنی بھرپور محبت دی، ان کا بے حد احترام کیا اور انہیں اپنے کتنے ہی حسین وجمیل خوابوں کی تعبیر سمجھ بیٹھے۔

شیخ محمد عبداللہ آج پھر ریاست جموں وکشمیر کے حاکم اعلیٰ بنے — یہ وہی شخصیت تھی جسے کشمیر کے سیاسی افق پر نمودار ہوتے ہی ڈوگرہ شاہی نے باغی قرار دیا، لیکن قوم نے اپنے باغی عبداللہ کو "شیر" کا خطاب دے کر انہیں "شیرِ کشمیر" کے نام سے پکارا، اور اس شیر کی دہاڑ نے کاخِ اُمراء کے در ودیوار ہلا دیئے۔

صدیوں کے بعد یہاں کے دبے اور کچلے عوام نے ایک کشمیری جوان کو یہاں کی مطلق العنان حکومت کے ظلم واستبداد کو للکارتے ہوئے دیکھا تو قوم نے انھیں خدا کا نازل کردہ کرشمہ سمجھا اور ان کے بارے میں ایسی باتیں منسوب ہو گئیں کہ وہ انسانی پیکر میں ایک عجوبہ بھی بن گئے۔ ان کے تئیں عوام کی اتنی عقیدت بڑھ گئی کہ وہ مافوق الفطرت شئے بن گئے۔

عوام کی سادگی کا فائدہ اٹھا کر "زرینہ گیرِ آب پھیرِ، صُورہ منزلال نیرہ" کی من گھڑت پیش گوئی پھیلائی گئی۔ اس کے بعد یہ افواہ اُڑائی گئی کہ مہاراجہ نے شیخ عبداللہ کو تیل کی ایک کڑکتی ہوئی کڑھائی میں اترنے کو کہا تو شیخ عبداللہ نے اس میں ہاتھ ڈال کر تیل کو

ٹھنڈا کر دیا۔ مہاراجہ یہ حال دیکھ کر شیخ عبداللہ سے ڈر گئے۔

کچھ مدت کے بعد مولوی بشیر احمد کی طرف سے درختوں کے پتوں پر تیزاب سے شیرِ کشمیر لکھ کر اس پبلسٹی سے عوام کا دل بہلایا گیا۔

ان توہماتی مفروضات سے پہلے یہ افواہ بھی پھیلائی گئی کہ جن دنوں شیخ صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قلعہ ہاری پربت میں قیدی تھے تو صبح سویرے ایک شیر یہاں آ کر دہاڑتا تھا۔

شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ نہ تو توہماتی اور نہ ہی معجزاتی کردار تھے، بلکہ ایک انسانی نفسیات کے حامل سیاسی لیڈر تھے، جن کے تئیں توہماتی مفروضات پر مبنی افواہیں پھیلا کر ایک مخصوص گروپ سادہ لوح کشمیری عوام کو جہالت کی طرف دھکیلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس مخصوص گروپ کے وقفہ وقفہ کے بعد شیخ صاحب کے بارے میں معجزاتی افواہیں پھیلانے کا کام پہلے پہل مسلم قائدین اور پھر نیشنل کانفرنس بن جانے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس نے انجام دیا۔

مسلم قائدین عوام کے سامنے شیخ عبداللہ کی سحر بیانی کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور کانگریس کا بس یہی ایک مقصد تھا شیخ عبداللہ کو کسی طرح پچھلی صف سے لا کر اگلی صف میں کھڑا کر دیا جائے اور اگلی صف میں ان سے وہ کام لیا جائے جس کے لیے ان سے پہلے ہی عہد وپیماں ہو چکا ہے۔

ان توہماتی مفروضات پر مبنی افواہوں سے شیخ صاحب کی ہمہ گیر مقبولیت میں اضافہ ہوا لیکن کشمیری عوام کو اپنے رہنما کی اصلیت اور ان کی افادیت سمجھنے میں بڑی زبردست فاش غلطیاں سرزد ہوئیں۔

شیخ عبداللہ نے اپنی پُرعزم اور مجاہدانہ قیادت سے کچھ ہی برسوں میں جہاں ریاست کے بیشتر مسلمانوں کو اپنے گرد منظّم کیا وہاں ڈوگرہ شاہی ان کے عزائم کو کمزور کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئی۔

شیخ محمد عبداللہ نے فرقہ وارانہ بھائی چارے اور قومی رواداری پر اپنی دلولہ انگیز تقریروں سے نہ صرف ریاست کے غیر مسلم عوام میں بلکہ ہندوستان کے سوشلسٹ اور سیکولر

حلقوں میں اپنا ایک مقام بنا لیا، محب وطن دانشور بھی ان کے گرد جمع ہو گئے۔

انہوں نے آزادی کی لڑائی میں عدم تشدد کا پرچار کر کے "کشمیر کا گاندھی" کا خطاب بھی حاصل کر لیا۔

۱۹۴۲ء کے اوائل میں انھوں نے "نیا کشمیر" کا سوشلسٹ پروگرام اپنا نصب العین بنا کر پیش کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

"نیا کشمیر" کا پروگرام پیش کر کے نیشنل کانفرنس اور اس کی لیڈرشپ دنیا کی نظروں میں اُجاگر ہو گئی۔

"نیا کشمیر" کا پروگرام عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے شیخ صاحب نے فرمایا تھا:

" ہمیں وہ شخصی راج کسی بھی صورت میں منظور نہیں جو راج وراثت میں باپ کے بعد بیٹے کو ملتا ہے چاہے یہ بیٹا نالائق اور ناقابلِ قبول ہی کیوں نہ ہو۔"

شیخ محمد عبداللہ نے جاگیرداری کا خاتمہ، چک داری سسٹم کی منسوخی اور زمیندار کے چنگل سے کاشت کار کو آزادی دلانے کا نہ صرف اپنا عزم دہرایا بلکہ اس پر عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں عوام نے انہیں وہ ساری طاقت لوٹا دی جس کی بدولت وہ عوام کے برسوں کے خوابوں کی تعبیر میں بدل سکیں۔

شیخ محمد عبداللہ ریاست جموں و کشمیر کے بلا شرکتِ غیرے وزیراعلیٰ بن گئے تو پہلے ہی مرحلے پر انہوں نے ایک چھوٹی غریب اور پسماندہ ریاست پر پورے ۲۴ منسٹروں کا بھاری بوجھ ڈال دیا۔ یہ ایک ایسا بوجھ تھا جس سے اس ریاست کی معیشت کی کمر ٹیڑھی ہو گئی۔ ریاست جہاں صرف دس بارہ منسٹروں کا بار مشکل سے سہہ لیتی وہاں پورے ۲۴ منسٹروں کا بار اس پر ڈال دیا گیا۔

وزارت کی تشکیل کے بعد وزیراعلیٰ کی سربراہی میں اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا تو گورنر ایل۔ کے جہا نے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں جنتا پارٹی کے دور میں ہوئے حالیہ الیکشن کو پاک وصاف کی سرٹیفکیٹ دے کر اس سے قبل کے انتخابات کو اشارتاً ایک فراڈ سے تعبیر کیا اس طرح گورنر نے اسمبلی کے ذریعے بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کو مشکوک بنا دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جنتا دورِ حکومت کے اس الیکشن کو مکمل پاک وصاف ہرگز نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ الیکشن کے دن پولنگ بوتھوں پر قبضہ اور غیر نیشنلسٹ ایجنٹوں کا اغوا اور عملوں کو پولنگ بوتھوں تک آنے سے روکنا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، ووٹ صندوقوں اڑانے یا بدلنے، کاؤنٹنگ ہال میں دھاندلی کرنے اور ناکام امیدواروں کو کامیاب بنانے تک تو یہ انتخابات یقیناً صاف ستھرے تھے، لیکن مکمل پاک وصاف نہیں تھے۔

۱۹۵۰ء سے لیکر اب تک کے تمام انتخابات کے مقابلے میں بہت حد تک غنیمت تھے۔ اسمبلی میں گورنر کے ایڈریس پر شکریے کی تحریک کے دوران جماعت اسلامی کے واحد ممبر اسمبلی سید علی شاہ گیلانی نے اس الیکشن کا یوں تجزیہ کیا۔

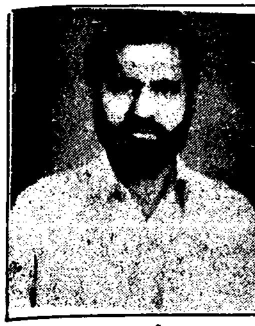
" حالیہ انتخابات میں نیشنل کانفرنس کو جو اکثریت حاصل ہو گئی ہے یہ نیشنل کانفرنس کے حق میں ہندوستان کی نفرت کا ووٹ تھا جس کو لوگوں کے جذبات اُبھار کر حاصل کر لیا گیا ہے۔ الیکشن کے موقع پر نیشنل کانفرنس کی عام طور پر یہ پالیسی رہتی ہے کہ وہ اپنی پارٹی کو ہندوستان کی بدترین مخالف اور دشمن کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور یہ باور کراتی ہے کہ صرف ہم ہندوستان کی جارحیت کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور کشمیری قوم کے تشخص کا تحفظ کر سکتے ہیں کوئی اور پارٹی یا جماعت اس فریضہ کو انجام نہیں دے سکتی اور لوگ بڑی آسانی کے ساتھ اس بہکاوے میں آجاتے ہیں۔ اس میں شخصیت پرستی کے سوفیانہ جذبات کا بھی بڑا عمل دخل ہے اور لوگوں کے ذہنی اور علمی بے مائیگی بھی ایک موثر عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔"

اسی اجلاس کے دوران گیلانی صاحب نے وزیراعلیٰ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

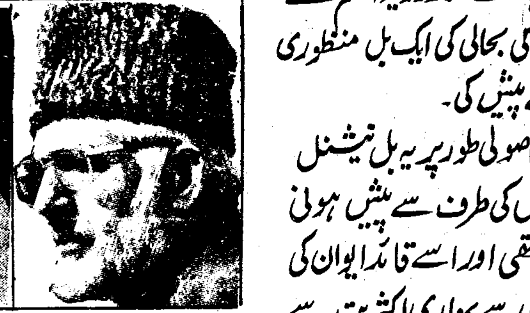
" برصغیر ہندو پاک میں ملت اسلامیہ جن عظیم نقصانات سے دوچار ہوتی ہے ان کی تمام تر ذمہ داری صرف آپ اور آپ کی ذات پر عائد ہوتی ہے۔"

دورانِ سیشن اسمبلی میں سید علی گیلانی اور عبدالغنی لون نے ۱۹۵۳ء کی بحالی،

نیشنل کانفرنس نے عوامی اجتماعات میں واضح کر دیا تھا کہ اگر ہم انتخاب جیت گئے تو اسمبلی میں ہندوستان کے ساتھ علیحدگی کا بل پیش کیا جائے گا۔"



عبدالغنی لون



سید علی شاہ گیلانی

صدرریاست اور وزیر اعظم کے
عہدوں کی بحالی کی ایک بل منظوری
کے لیے پیش کی۔

اصولی طور پر یہ بل نیشنل
کانفرنس کی طرف سے پیش ہونی
چاہیے تھی اور اسے قانڈ ایوان کی
منظوری سے بھاری اکثریت سے
پاس بھی ہونا تھا۔ کیونکہ یہ نیشنل
کانفرنس کے منشور میں درج تھا اور الیکشن کے دوران اس پارٹی کے لیڈروں کا عوام سے ایک عہد بھی تھا۔ برعکس اس کے قانڈ ایوان اور نیشنل کانفرنس کے ممبران کی طرف سے اس بل کی نہ صرف مخالفت کی گئی بلکہ اس بل کو پیش کرنے کا موقع بھی فراہم نہیں کیا گیا۔ عبدالغنی لون اور سید علی شاہ گیلانی کو اس بل کے ذریعے فتنہ جگانے کا الزام لگا کر انہیں نہ صرف دھمکی دی گئی بلکہ ان کے خلاف زور زبردستی کا مظاہرہ بھی کیا گیا ان دونوں ممبران اسمبلی کی اسمبلی ہال میں ضرور مار پیٹ کی گئی۔ لیکن انہوں نے نیشنل کانفرنس کے منشور اور عوام سے کیے گئے عہد و پیمان کے بارے میں نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کے تمام کپڑے اتار کر انھیں اسمبلی میں ننگا کر کے رکھ دیا۔

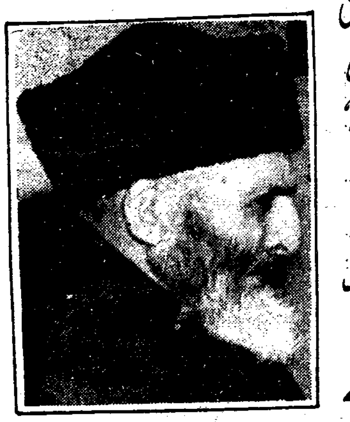
اگر کشمیر میں انسانی شکل و صورت کی بھیڑ بکریوں کی تعداد بہت زیادہ نہ ہوتی تو انھیں اپنے لیڈر اور رہنما کبھی بھی کپڑوں میں نظر نہیں آتے، اور نہ ہی فریب دھوکہ اور جھوٹ کا پردہ اُٹھنے کے بعد انہیں بحیثیت حکمران قبول کر لیتے۔

لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے، جہاں جیسے لوگ رہتے ہیں ان کو ویسے ہی حاکم بھی ملتے ہیں۔ کشمیری عوام پر یہ بالکل صادق آتا ہے۔

میری پیدائش کا تم سمجھے نہیں ہو مدعا
آگیا ہوں زندگانی کو مٹانے کے لیے

ریاست میں جنتا پارٹی کا زوال
عوام پر حکومت کے "سیفٹی ایکٹ" کا وار

کشمیر کا جنتا یونٹ انتخابات میں شکست کھانے کے بعد ایک طرف مرکزی سرکار کی ...ی سے برہم ہوا۔ دوسری طرف اس شکست کا مورد الزام اس کے کنوینر مولانا محمد سعید مسعودی ...ہرایا گیا۔ مولانا مسعودی پر سازش کر کے جنتا پارٹی کو ڈبونے کا جو الزام لگایا گیا۔ وہ اگرچہ ...ن دار تھا۔ لیکن سوائے چودھری محمد شفیع کے اور کوئی اس راز سے واقف نہیں تھا کہ مولانا ...دی کو پوشیدہ طور پر شیخ صاحب کے ساتھ (UNDER STANDING) تھی اور ...ے لئے انھیں مرکز کی ہدایت بھی تھی۔ مرزا افضل بیگ نے خود میرے سامنے اس بات کا اعتراف ...ا۔ "مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ مولانا جنتا پارٹی ...نیر کی حیثیت میں ہمارے لئے کام کر رہے ہیں اور میں ...صاحب سے کہہ بھی دیا تھا۔ ان پر بھروسہ کم کرنا چاہیئے' ...بعد میں مجھے اُن کے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا۔ ...شیخ صاحب کو دیکھئے کتنے بے مروت ہیں میری طرح ...ساتھ بھی کیسا سلوک کر رہے ہیں۔ (ان دنوں بیگ ...تنظیم اور وزارت سے نکالے گئے تھے)"



(مولانا محمد سعید مسعودی)

مولانا محمد سعید سے گاندربل میں ایک ملاقات کے ...ن جب میں نے اُن سے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا ...ن نے اس کا گول مول جواب دیا۔ میں نے ان سے دریافت کیا۔ چونکہ آپ ابتدا سے تحریک

کے ساتھ رہے ہیں۔ لہٰذا آپ نے اس تحریک کے بارے میں ضرور لکھا ہوگا۔ انھوں نے اقرار کیا اور بتایا ہاں! کچھ نوٹس قلمبند کر کے رکھے ہیں لیکن وہ یہاں میرے پاس نہیں ہیں۔

مولوی صاحب ہسپتال میں جب زیرِ علاج تھے تو مجھے ان کے ضروری نوٹس کی فکر ہوئی۔ میں نے ان کے چھوٹے بھائی نذیر احمد مسعودی سے پوچھا تو انھوں نے مجھے بتایا۔ میرا خیال ہے اُنھوں نے کشمیر کی سیاست پر جو کچھ بھی لکھا ہے وہ چودھری محمد شفیع کے پاس دہلی میں رکھا ہے۔



(چودھری محمد شفیع)

"کشمیر کا سیاسی انقلاب" کے سلسلے میں مجھے کتنی بار دہلی جانا پڑا تو میں نے چودھری صاحب سے ملاقات کی تو اُنھوں نے مسعودی صاحب کے کاغذات رکھنے سے انکار کیا۔ البتہ اس بات کا اقرار کر لیا کہ جنتا دورِ حکومت میں ہم نے ریاست میں نیشنل کانفرنس کا خفیہ طور پر بھرپور ساتھ دیا۔

"یہ ساتھ آپ نے کیسے دیا۔؟" میں نے پوچھا۔

"جب ہمیں پتہ چلا کہ جنتا پارٹی ریاست میں برسرِ اقتدار آنے پر مرکزی سرکار کی کٹھ پتلی بنے گی اور یہ کشمیر کی انفرادیت ختم کرنے کے لئے ہمیں استعمال کرے گی تو ہم نے نیشنل کانفرنس کا ساتھ دینا شروع کیا۔"

"ہاں! تو یہ ساتھ کیسے ۔ کس طرح دیا؟"

"مرکزی سرکار نے انتخابات کے دوران پولنگ بوتھوں پر قبضہ کرنے سے روکنے کے لئے جو دو بٹالین سی۔ آر۔ پی۔ ایف بھیجدی تھی۔ اس کو پولنگ بوتھوں پر بھیجنے کے بجائے بارکوں میں رکھنے کا فیصلہ لیا گیا تاکہ نیشنل کانفرنس کو پولنگ بوتھوں پر قبضہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آسکے۔ بیشتر پولنگ بوتھوں پر ہمارے ایجنٹوں کے اغوا کی شکایات کا ہم نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ جنتا پارٹی کے سبھی مقامی لیڈر اس بات پر زور ڈال رہے تھے کہ انتخابات میں وہی پرانا طریقہ آزمانا چاہیئے جواب تک یہاں آزمایا جا رہا تھا۔ لیکن کنونیر صاحب نے ان کو بتایا۔ وزیرِ اعظم نے ایسا کرنے کی مناہی کر دی ہے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو لینے کے دینے پڑیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرکز کو ریاست میں جنتا پارٹی کے جیتنے میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی کیونکہ مسز اندرا گاندھی نے اس بارے میں خطرے کی گھنٹی بجائی تھی۔

اسمبلی انتخابات میں شکست کھانے کے بعد وادی کے جنتا لیڈروں جن میں مولانا محمد فاروق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِن پر نیشنل کانفرنس کے حامیوں نے ایسا نزلہ اُتارا کہ اُنھیں کئی دنوں

تک اپنے عیال کے ساتھ گوشہ نشین رہنا پڑا۔ ان کے علاوہ غلام محی الدین قرہ، افتخار حسین انصاری، نعیم احمد شمیم، جی۔ ایم۔ باون، غلام نبی خیال، پیرزادہ علی شاہ، محمد امین بٹ اور دوسرے شہر سرینگر کے جنتا لیڈروں کے گھروں پر نہ صرف پتھراؤ کیا گیا بلکہ غلیظ گالیوں سے ان کے جذبات مجروح کئے گئے۔

نیشنل کانفرنس کے حمایتوں کے ہاتھوں مقامی جنتا لیڈروں کی درگت اور اس پر جنتا سرکار کی سرد مہری نے وادی کی جنتا پارٹی کو سخت بیزار کر دیا اور وہ آہستہ آہستہ اس پارٹی سے کنارہ کش ہونے لگے۔

سرینگر سے جنتا پارٹی کے مرکزی دفتر سے بذریعہ پولیس جنتا لیڈروں کو بے دخل کرنے اور یہاں کا سارا ریکارڈ توڑ پھوڑ کر دینے کے بعد جنتا کے مقامی لیڈر ایک طرح سے روپوش ہو گئے وادی کے جنتا پارٹی کے لیڈروں کو نیشنل کانفرنس کے رحم وکرم پر چھوڑ کر مرکزی سرکار نے جو رول ادا کیا۔ اس سے وادی کا جنتا یونٹ بکھر کر رہ گیا۔

ایک مدت تک پوشیدہ رہنے کے بعد جب حالات رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگے۔ تو کئی مقامی لیڈروں نے کنونیر مولانا مسعودی سے شکایت کی نیشنل کانفرنس کے حمایتی پولیس کی مدد سے ہمارے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں۔ اگر فوری طور اس کا تدارک نہیں کیا گیا تو ہم کشمیر سے ترکِ وطن کریں گے۔

مولانا مسعودی نے جنتا لیڈروں اور ورکروں سے دستخط شدہ ایک میمورنڈم لے کر مرکزی سرکار کو بھیجدیا، اس میمورنڈم میں صاف صاف لکھدیا گیا تھا کہ اگر ہمارا یہاں تحفظ نہیں ہو سکتا تو ہمیں کسی اور ریاست میں بسایا جائے۔

اس میمورنڈم پر مرکزی ہوم منسٹری نے سخت نوٹ لکھ کر وزیرِ اعلیٰ کو متنبہ کیا کہ اگر ان حالات کو روکا نہیں گیا تو مرکز کو مداخلت کرنا پڑے گی اور گورنر سے کہنا پڑے گا کہ وہ عوام کو تحفظ فراہم کرے۔

مرکزی ہوم منسٹری نے جس لہجے میں وزیرِ اعلیٰ سے جنتا پارٹی کے لیڈروں اور ورکروں کو ستانے سے باز آنے کی دھمکی دی تھی۔ اس میں گورنر راج نافذ کرنے کی بُو سونگھ کر شیخ صاحب کے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی۔

انھوں نے جنتا سرکار کی ناراضگی دور کرنے کے لئے ۴ار دسمبر ۱۹۷۷ء کو مرکزی سرکار کو ایک خط لکھ کر جہاں مقامی جنتا لیڈروں کی شکایات کو غلط قرار دیا۔ وہاں اپنی وفاداری کا یقین دلانے

ہوئے اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کردی۔

"جموں وکشمیر کے "آزاد کشمیر" حصّے کو کسی مزید تاخیر کے بغیر پاکستان کے قبضے سے آزاد کر دیا جائے، موجودہ کنٹرول لائن ایک غیر قدرتی لائن ہے جس سے بہت سارے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔"

اِس خط کے جواب میں ۲۵ جنوری ۱۹۷۸ء کو مسٹر اٹل بہاری باجپائی نے شیخ صاحب کو لکھ دیا:

"..... شیخ صاحب کو محسوس کرنا چاہیئے کہ "آزاد کشمیر" کو آزاد کرانے کے لئے انڈیا کو جو جنگ لڑنی ہوگی۔ اس کے دوررس نتائج نکل سکتے ہیں۔ خاص طور پر ان حالات میں جبکہ کئی ممالک مقبوضہ کشمیر کو پاکستان کا ایسا ہی حصّہ تصور کرتے ہیں جیساکہ وہ کشمیر کے اِس حصّے کو ہندوستان کا حصّہ مانتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مقبوضہ کشمیر پر چڑھائی کرنے سے ایک مردہ سوال پھر زندہ ہو سکتا ہے اور موجودہ حالات میں یہ آ بیل مجھے مار والی بات ہوگی۔

ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں لیکن ہم اس ملک کو کسی جنگ میں اُلجھانا نہیں چاہتے ہیں۔ جب جنگ کے ذریعے یہ کام ہو سکتا تھا۔ اس وقت آپ ہی اس میں رکاوٹ بن گئے۔ آپ ہی نے پہلے پنڈت نہرو اور پھر مسز اندرا گاندھی کو مقبوضہ کشمیر پر قبضہ کرنے سے روکا۔!

ہم امن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ دونوں پڑوسی ممالک امن کے ماحول میں اپنے اپنے عوام کی خدمت کر سکیں!"

پاکستان کے چُنگل سے "آزاد کشمیر" کو چھڑالانے میں وزیراعلیٰ کا جو مقصد تھا۔ ——— کسی حد تک پورا ہوا، اس طرح اُنھوں نے ہندوستانی رہنماؤں کو اپنی وفاداری اور ہندوستان نوازی کی سند پیش کی، اس سند پر تصدیقی مہر لگانے کے لئے انھوں نے مارچ میں چندی گڈھ کے دورے کے دوران اخباری نمائندوں کو بتایا۔

"ہند کے ساتھ کشمیر کا الحاق ناقابلِ تنسیخ ہے اور یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کشمیر کے کسی ایک حصّے نے نہیں بلکہ پوری ریاست نے ہند کے ساتھ الحاق کیا ہے۔ پاکستان "آزاد کشمیر" پر ناجائز قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ میں نے مرکزی سرکار کو مشورہ

دیا ہے کہ وہ "آزاد کشمیر" کو پاکستان سے چھڑالائیں۔"

سرینگر میں قانون ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو گورنر کے ایڈریس پر شکریہ کی [illegible]ک کی ابتدا کرتے ہوئے انھوں نے یہ بات واضح کردی کہ .....

"جموں وکشمیر کے ایک حصّے پر پاکستان کے تسلّط سے جو حالات پیدا ہوئے ہیں ان سے ہمیں زبردست مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے۔ ریاستی حکومت مرکزی سرکار سے درخواست کر چکی ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی حل ڈھونڈا جائے، کشمیر پر پاکستانی حملے کے وقت ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی کا جو فیصلہ کیا گیا وہ صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا جس وقت جنگ بندی کا فیصلہ کیا گیا ہماری فوجیں مظفر آباد اور کوٹلی تک پہنچ چکی تھیں۔ اگر جنگ بندی کا فیصلہ نہ کیا گیا ہوتا تو ہم نے ریاست کے تمام علاقوں کو پاکستان کے قبضے سے آزاد کرالیا ہوتا۔"

کشمیر اسمبلی میں وزیراعلیٰ کے اس بیان پر عوامی حلقوں میں کافی لے دے ہوئی، وہ [illegible] یقیناً حیران ہوں گے جو پاکستان کے نام پر نیشنل کانفرنس کو ووٹ دے کر راولپنڈی روڈ [illegible]ے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

الیکشن مہم کے دوران جو لیڈر عوام سے کہہ رہے تھے۔ اگر ہم انتخاب جیت گئے تو اسمبلی میں [illegible]وستان سے ریاست کو علیحدہ کرنے کا بل پیش کریں گے۔ جب وہ اس اسمبلی سے الحاق کو ناقابلِ [illegible]خ اور پاکستان کے چُنگل سے "آزاد کشمیر" کو چھڑالانے کی باتیں سُننے لگے تو انھوں نے اپنے آپ [illegible]ائزہ لے کر اس بات کی ضرور تصدیق کی ہوگی۔ ہم ایسے بے غیرت اور بے شعور لوگ ہیں جو بار بار [illegible]کے جھانسے میں آتے ہیں۔

نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ نے الحاق کو ناقابلِ تنسیخ مان کر اور "آزاد کشمیر" کو پاکستان [illegible]گل سے چھڑانے کا منشور لے کر الیکشن لڑا ہوتا تو یہ سب کچھ ہرگز قابلِ اعتراض اور قابلِ [illegible]ن نہ ہوتا۔

بھولے بھالے کشمیری عوام سے پاکستان کے نام پر ووٹ لے کر ہندوستان کے گیت گانا [illegible] قابلِ اعتراض اور قابلِ افسوس بات ہے۔ میرا خیال ہے ایسی دوغلی پالیسی سے وہ بھی خوش [illegible]وں گے جن کے یہ آج گیت گا رہے ہیں۔

خداتعالیٰ نے حضرتِ انسان کو ضمیر کے نام سے ایک انمول تحفہ دیا ہے۔ جس کے پاس ضمیر نہیں

اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ انسان اور حیوان میں یہی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ انسان کے پاس ضمیر نام کے ایک انمول شئے ہے اس شئے سے حیوان بالکل محروم ہے۔

کشمیر اسمبلی میں وزیراعلیٰ کے اس بیان پر بعض عوامی حلقوں میں ضرور لے دے ہوئی مگر وہ ممبرانِ اسمبلی جنہوں نے مینڈیٹ کے عوض شاید اپنی غیرت اور ضمیر نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کے پاس گروی رکھدی تھی۔ اُف تک نہ کر سکے۔ محض اسمبلی کی ممبری اور وزارت کے عہدے کی خاطر اُن کی خاموش ضمیر فروشی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ دراصل وادی کشمیر میں ضمیر کی آواز پر اسمبلی کی ممبری یا وزارت سے استعفےٰ دینے کا اس لئے کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ جب ضمیر ہی نہیں تو ضمیر کی آواز کیسی؟ نیشنل کانفرنس کی تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی جب اس تنظیم کے ایک ادنیٰ کارکن سے لے کر اعلیٰ عہدیدار تک کسی ایک نے بھی ضمیر کی آواز پر اس تنظیم سے علیحدگی اختیار کی ہو، یا لیڈر شپ سے کسی بات پر باز پُرس کی ہو، حد تو یہ ہے کہ انھوں نے اُس وقت بھی ایک آہ تک نہ بھری جب لیڈر شپ نے ریاستی عوام پر ایک بھرپور وار کیا۔

انھوں نے عوام کی عزّت و آبرو بحال کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کو پبلک سیفٹی ایکٹ نافذ کر کے پورا کیا۔

پبلک سیفٹی آرڈی نینس

ریاست جمّوں و کشمیر کے عوام نے شیخ محمد عبداللہ کو حکمرانی کی بحالی کے لئے جو قربانیاں دیں اور جو ظلم و ستم برداشت کئے اس کا صلہ عوام کو بہرحال دینا ہی تھا۔ چنانچہ انھوں نے ۲۹ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کو دے ہی دیا۔

اس روز ان کی ہدایت پر گورنر ایل۔ کے۔ جھا نے دفعہ ۹۱ کے تحت وہ فرمان جاری کیا جسے پبلک سیفٹی آرڈی نینس کا نام دیا گیا۔

حالانکہ عملی طور پر یہ گلا گھونٹنے کا آرڈی نینس تھا۔ جسے ایک خوبصورت نام سے مشتہر کیا گیا۔ اس فرمان کی رو سے ....

.... حکومت جموں و کشمیر نے ریاست کی سلامتی اور امنِ عامہ قائم رکھنے کے بہانے بیک وقت اخبارات اور دیگر مطبوعات پر پابندی عائد کرنے، پریس کو شکنجے میں کسنے اور لوگوں کو وجہ بتائے بغیر نظر بند کرنے

کے وسیع اختیارات حاصل کر لئے۔[۱]

یہ رسوائے زمانہ آرڈی نینس جاری کر کے حکومت کسی بھی شخص کو اس کی نظر بندی کے وجوہات بتائے بغیر قید کر سکتی ہے۔ کسی بھی قیدی کو اس کا کیس کسی مشاورتی بورڈ کے سامنے رکھے بغیر دو سال تک نظر بند رکھ سکتی ہے۔

پہلے نظر بندی حکم کے میعاد گزر جانے یا منسوخ کئے جانے کے بعد دوسرے نظر بندی حکم کے اجراء پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔

یہ فرمان ریاست کے اندر شائع ہونے والے اخبارات، رسائل اور کتابیں بند کر سکتا ہے۔ اگر سرکار یہ محسوس کرے کہ ان میں شائع شدہ مواد ریاست کی سلامتی اور امنِ عامہ کے لئے ضرر رساں ہے۔

یہ آرڈی نینس ریاست کے ممنوعہ علاقے کے اردگرد گھومنے کو بھی خلافِ قانون قرار دیتا ہے۔ کوئی بھی پولیس آفیسر یا سرکار کی طرف سے کوئی بااختیار شخص کسی بھی آدمی کو ایسے ممنوعہ علاقے میں داخل ہونے، وہاں موجود ہونے یا وہاں سے روانہ ہوتے پر تلاشی لے سکتا ہے۔ اس قسم کی تلاشی کے لئے کسی شخص یا موٹر گاڑی کو روکا جا سکتا ہے۔ دفعہ ۹۱ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو دو ماہ کی قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکیں گی۔ اس دفعہ کی رو سے اگر حکومت ضروری محسوس کرے تو وہ حکم کے ذریعے

---

[۱] راقم نے "تحریک حریت" کے پس منظر میں اپنی کتاب "یہ کس کا لہو ہے کون مرا" پریس میں چھاپنے کے لئے دی تھی جو وہاں افشا ہو گئی۔ پولیس نے بیک وقت پریس اور میرے گھر پر چھاپہ مار کر اس کا سارا مواد ضبط کر لیا۔ وزیراعلیٰ کو یہ سارا مواد دکھایا گیا تو انھیں پتہ چلا کشمیر میں ایسے بھی قلمکار ہیں جو دوسروں کی طرح خاموش تماشائی بن کر نہیں رہنا چاہتے۔ بلکہ حقایق لوگوں کے سامنے لا کر ان کی حکومت کو پریشان کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ انھوں نے اسمبلی میں اس بارے میں کہا بھی اور تب ہی سے انھوں نے اس قسم کا لٹریچر اور اس کا تخلیق کار پابندِ سلاسل کرنے کا فیصلہ لیا تھا۔

کسی بھی شخص کے کسی خاص علاقے میں داخلے کو ممنوع قرار دے گی، خلاف ورزی کرنے والے کو تین ماہ کی قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی۔ اِس آرڈی نینس کے ذریعے حکومت ایک عام یا خاص حکم کے ذریعے کسی علاقے میں کسی فوجی نوعیت کی مشق یا نقل و حرکت کو ممنوع قرار دے سکتی ہے یا اس کو محدود کر سکتی ہے۔

اِس دفعہ کی خلاف ورزی کرنے والے کو چھ ماہ قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی۔

ایک اور دفعہ کا تعلق کرفیو آرڈر کے نفاذ سے ہے۔ کرفیو آرڈر کی خلاف ورزی کرنے والے کو چھ ماہ قید تک کی سزا دی جاسکے گی۔ اِس آرڈ نینس کے تحت اگر کسی شخص کو ضرر رساں کارروائی کرنے کا قصور وار ٹھہرایا گیا تو اسے دو سال تک قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی۔

قابلِ اعتراض خبروں کی اشاعت پر کنٹرول کرنے سے متعلق دفعہ کی رو سے اگر حکومت کی رائے میں کوئی دستاویز جو آرڈی نینس سے پہلے یا بعد میں چھاپی گئی ہو یا شائع کی گئی ہو، کوئی ضرر رساں خبر شامل رکھتی ہو، تو حکومت ریاست کی سلامتی کے مفاد اور امنِ عامہ کے قیام کی خاطر یہ حکم دے سکتی ہے کہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر یا وہ شخص جس کے قبضے میں ایسی دستاویز ہو اِس حکم میں مقررہ اتھارٹی کو ایسے شخص کے نام اور پتہ کے بارے میں مطلع کرے۔ جو ایسی خبر دینے سے تعلق رکھتا ہو، ایسی دستاویز اور اس کی نقل مقررہ اتھارٹی کے سپرد کرنے کا حکم بھی دے سکتی ہے۔"

نیشنل کانفرنس کی جیسی عوامی حکومت کے اِس آرڈی نینس نے سنجیدہ عوام کو جہاں دم بخود کر دیا۔ وہاں اپوزیشن پارٹیوں کے علاوہ غیر ریاستی تنظیموں نے بھی اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، اسے ایک جابرانہ قانون اور بلا اعلان ایمرجنسی سے تعبیر کیا۔

ریاست جموّں و کشمیر کے عوام کو اپنے قائد اپنے لیڈر اور اپنے حکمران سے اس قسم کا واسطہ پڑا تو پڑھے لکھے لوگوں، سنجیدہ افراد اور دانشوروں کے پاؤں تلے گویا زمین نکل گئی۔ اِس چنگیزی حکم نے ان سبھوں کو حواس باختہ کر دیا۔

عقل و شعور رکھنے والے لوگ نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کو ظالم و جابر حکمران جاننے میں کوئی پس و پیش نہیں کر سکے۔

اِس چنگیزی حکم کے خلاف سب سے زیادہ احتجاج جموّں میں کیا گیا۔ جموّں میں اِس آرڈی نینس کی منسوخی کے لئے مختلف پارٹیوں کی ایک سنگھرش سمتی بنائی گئی۔ جس نے جموّں شہر میں مظاہرے کئے۔

چنانچہ دربار مُو کے سلسلے میں جب وزیر اعلیٰ اور اُن کی کابینہ دیگر دفاتر کے ساتھ جموّں منتقل ہو گئی تو ان کو زبردست مظاہروں کا سامنا کرنا پڑا۔

جمّوں شہر کے لوگ جو کشمیریوں کی طرح عقیدت کے اندھے نہیں۔ ان کی ناراضگی کو دیکھ کر حکومت نے ۱۵ر نومبر کو اس چنگیزی حکم کے نفاذ کی دلیل میں ایک وہائٹ پیپر جاری کیا۔ اس میں حکومت نے ایک ایسی دوا تجویز کی جو جموّں واسیوں کے درد کے لئے تیر بہدف دوا تھی۔

حکومت نے اِس آرڈی نینس کے جاری کرانے کا قصور پاکستان کے سر تھوپ دیا۔ وہائٹ پیپر میں پاکستان کے بارے میں کہا گیا۔

"جموّں و کشمیر ایک سرحدی ریاست ہے۔ جس کے کئی حصّے بیرونی ملکوں کے قبضے میں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں ریاست کی سلامتی اور امن و قانون کے لئے ایسے مسائل کا سامنا ہے جو ملک کی دوسری ریاستوں کو درپیش نہیں۔"

اِس آرڈی نینس کے ذریعے شیخ محمد عبداللہ نے بحیثیت حکمران ریاست میں تحریر و تقریر کی آزادی اور پریس کی آزادی پر جو کاری ضرب لگا دی۔ اِس پر برصغیر میں سخت شور شرابہ ہوا۔ لیکن انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی، کیونکہ آج شیخ عبداللہ عوام کے لیڈر نہیں بلکہ حکمران تھے۔

حالانکہ جب وہ صرف لیڈر تھے اور ڈوگرہ شاہی سے ٹکر لے رہے تھے تب تحریر و تقریر اور پریس کی آزادی پر ان کی رائے بالکل مختلف تھی۔

۱۹ر جنوری ۱۹۴۲ء کو انھوں نے جموّں میں ایک پریس کانفرنس میں فرمایا تھا:

"۱۹۳۱ء سے پہلے ریاست میں پریس کی آزادی نہ تھی۔ چنانچہ رعایائے ریاست کا یہ پیدائشی حق حاصل کرنے کے لئے ہمیں کافی قربانیاں دینی پڑیں، مجھے اخبارات، رسائل اور کتابوں کے ساتھ پریم ہے۔ کیونکہ یہ پودا میرے ہی ہاتھوں لگایا ہوا ہے۔ اس لئے میں اسے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ ضروری

نہیں کہ تمام اخبارات نیشنل کانفرنس کے خیالات کے ساتھ متفق ہوں، کانفرنس کے ساتھ کئی امور پر پریس کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن کانفرنس اس بات کی خواہاں ہے کہ پریس اس قدر مضبوط اور منظم ہو کہ واقعی اسے چالیس لاکھ باشندگانِ ریاست کی صحیح آواز کہا جاسکے، ایک طرف تو پریس کو پبلک کا اعتماد حاصل ہو اور دوسری طرف گورنمنٹ کی نظروں میں بھی اس کا وقار بڑھے اور گورنمنٹ بھی پریس کی آواز کی قدر کرے۔ اس کی آزادی کا خیال رکھے ....."

شیخ محمد عبداللہ جب حکمران نہیں تھے بلکہ عوام کے رہنما اور اپوزیشن کے لیڈر تھے اور بھارت کی حکومت سے برسرِ پیکار تھے۔ انھوں نے ۱۹۶۵ء میں ڈیفینس آف انڈیا رولز کے خلاف آسمان سر پر اُٹھایا۔ اس آرڈی نینس کے خلاف شور مچایا اور بڑی ڈھٹائی سے کہا:-

"یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ دار و گیر کے قوانین سے انسانی مسائل حل نہیں ہوتے اس قسم کے جابرانہ طریقۂ کار سے مظلوموں کے اندر بے اطمینانی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اگر میری دہائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تو بغیر کسی تاخیر کے تمام نظر بندوں کو رہا کیا جائے اور تمام جابرانہ قوانین کو منسوخ کیا جائے جن کے نتیجے میں کشمیر کے اندر شہری آزادی اور اظہارِ خیال کی آزادی دبائی جاچکی ہے۔ ڈی. آئی. آر. کشمیریوں کو پورے دباؤ کے ساتھ دن رات روندھے جارہا ہے۔"

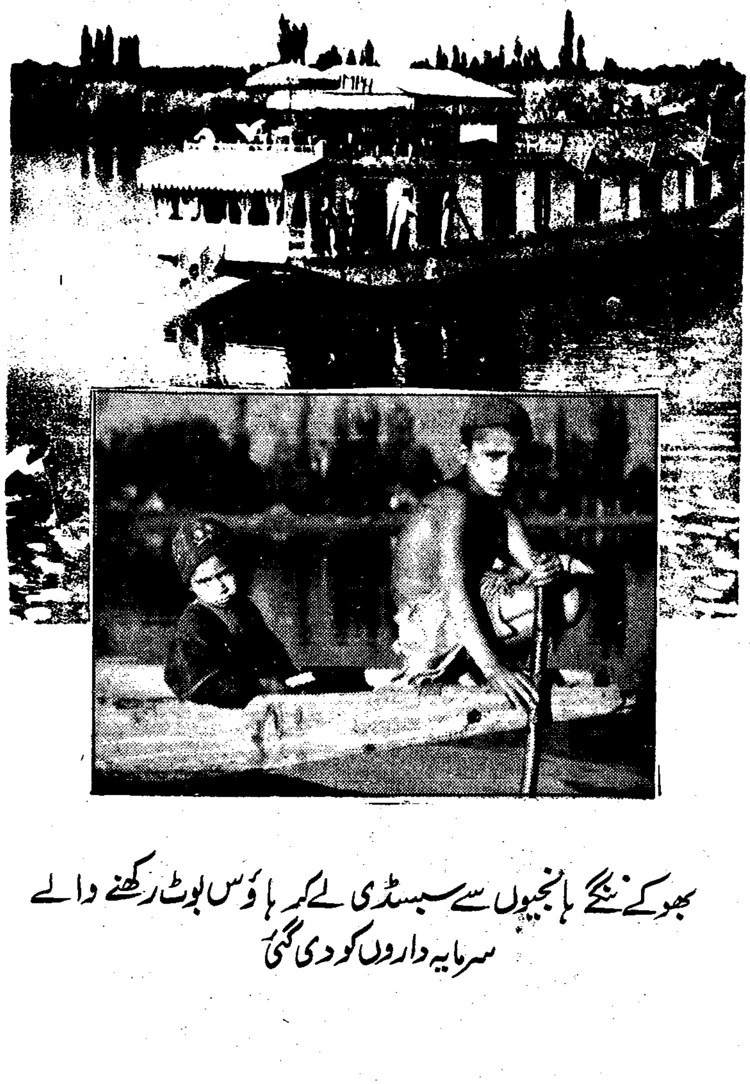
شیخ محمد عبداللہ نے میدانِ سیاست میں اُتر کر بحیثیت ایک قومی لیڈر کے مطلق العنان حکمرانوں پر الزامات لگا کر جن باتوں پر انھیں للکارا خود حکمران بنکر انہی باتوں کی آبیاری کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ——— شیخ عبداللہ کی ساری سیاسی زندگی کو نظرِ غائر سے دیکھکر اس کا جائزہ لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے جو وہ کہتے تھے کرتے نہیں تھے اور جو کرتے تھے وہ کہتے نہیں تھے ان کے کہنے اور کرنے میں جو تضاد ہے اس کی مثال ساری دُنیا میں ملنی مشکل ہے۔ اپنے ایک روپ میں وہ اپنی زبان سے ایسی باتیں بتاتے کہ انھیں دُنیا بھر کے اہم سیاستدانوں پر فوقیت دینا پڑتی تھی۔ ان کے خیالات اور نظریات پر ایمان لانا پڑتا تھا لیکن اپنے دوسرے روپ میں اُنکی زبان سے نہیں ان سے جو کچھ سننے کو ملتا تو آدمی دم بخود ہو کر ان کا موازنہ کرنے لگتا ——— شیخ محمد عبداللہ کے بارے میں کوئی بھی شخص حتمی طور پر کہہ نہیں سکتا کہ وہ بڑے سیاستدان تھے یا بڑے اداکار، کیونکہ اپنی ساری سیاسی زندگی میں انھوں نے جو اداکاری کی اس کو دیکھکر نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی سیاست بڑی ہے یا اداکاری!

(سبسڈی سے محروم ہو کر بھیک مانگنے والی خواتین)





تیس روپے نقد اور تیس روپے اُدھار پر کشمیر کا مستقبل داؤ پر لگا دیا گیا



بھوکے ننگے ہانجیوں سے سبسڈی لے کر ہاؤس بوٹ رکھنے والے
سرمایہ داروں کو دی گئی

کس کو فرصت ہے کہ کہے اُنکے زخموں کا شمار
بے طرح مرتے رہے جو بے سبب جیتے رہے

راشن پر سبسڈی کی منسوخی

سرمایہ داروں کے لیے سبسڈی کی بحالی

اپنے دورِ حکمرانی میں عوام پر پبلک سیفٹی ایکٹ کا بھرپور وار کرنے کے بعد شیخ عبداللہ نے ریاستی عوام کے منہ سے نوالا چھیننے کے لئے راشن پر دی جانے والی سبسڈی یعنی رعایت کی منسوخی کا حکم نامہ جاری کر کے ساری ریاست میں کنٹرول سی پیدا کر دی، خوراک پر دی جانے والی سبسڈی منسوخی کے جواز میں انھوں نے فرمایا:

"خوراک کی اس امداد سبسڈی نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ یہ ہمارے خزانے کا ایک بھاری حصّہ ہڑپ کرتی رہی ہے اور دوسری طرف سارے مُلک میں کشمیریوں کو چاول کی خیرات لینے کے طعنے دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خوراک اور دوسرے میدانوں میں خود کفالت حاصل کرنے کا سارا خواب درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ انڈے سے لے کر بینگن بلکہ چارے تک ہر ایک چیز کے لئے ہمیں بیرون ریاست کی منڈیوں کی طرف ہاتھ پھیلانے پڑ رہے ہیں۔"

وزیراعلیٰ شیخ عبداللہ نے ۱۹۵۳ء سے اپنی معزولی اور گرفتاری کے بعد برسوں تک ریاستی عوام پر سستے چاول کھانے کا طعنہ دیا، جب وہ ہندوستان کو اپنا مُلک سمجھتے نہیں تھے اور ہمیں بتایا کرتے تھے، ہندوستان ایک جابر اور غاصب ملک ہے جس نے ریاست پر ناجائز قبضہ کر لیا ہے۔ تب تک تو سستے چاول کھانے کا طعنہ کسی حد تک موزوں تھا لیکن اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کے ساتھ ریاست کا الحاق ناقابلِ تنسیخ مان کر سستے چاول

کھانے کا طعنہ دینا قطعاً ناموزوں و نامناسب تھا۔ اپنے مُلک کی رعایا اگر کوئی چیز سستی اور کوئی مہنگی کھائے تو اس میں ایسی کوئی برائی نہیں جس کا واویلا کیا جائے۔ چونکہ یہ کام بخشی غلام محمد نے شروع کیا تھا۔ جو شیخ صاحب کی نظروں میں غدار تھا حالانکہ اُن سے یہ خطاب چھین لیا گیا۔ بخشی غلام محمد کا کوئی بھی کام چاہے وہ صحیح اور موزوں ہی کیوں نہ ہو اس کی مخالفت کرنا شیخ عبداللہ کا فرضِ اولین تھا۔


(بخشی غلام محمد)

وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے ریاستی عوام کو سستے چاول کھانے کا طعنہ کچھ اس طرح دیا گویا ہندوستان میں یہ واحد ریاست تھی جسے راشن میں رعایت ملتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ راشن پر رعایت صرف ریاست جموّں و کشمیر کو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دوسری ان ریاستوں کو بھی ملتی تھی (ان کو اب بھی ملتی ہے)، جو خوراک کے معاملے میں خود کفیل نہیں اور جہاں کی انڈسٹری نہایت ہی محدود ہے۔

مرکزی سرکار اپنی ۲۵ ریاستوں میں سے ۸ ریاستوں کو جن میں جموّں و کشمیر بھی شامل ہے راشن پر رعایت دیتی ہے اور مرکزی سرکار اس پر سالانہ دَو ارب روپے صرف کرتی ہے۔
اِن دَو ہزار کروڑ روپے میں جموّں و کشمیر کی ریاست کے حصّے میں سالانہ بیس کروڑ روپے آتے تھے۔

چونکہ ریاست جموّں و کشمیر کے لئے راشن پر سبسڈی بخشی غلام محمد نے شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے ساتھ واگزار کرائی تھی۔ اس لئے ان کی نظر میں یہ ایک گناہ تھا۔ لہٰذا اس گناہ سے جتنی جلدی نجات ملے اتنا ہی اچھا ہے۔

راشن پر سبسڈی کے اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کی منسوخی کا وزیر اعلیٰ کا فیصلہ ایک غلط فیصلہ ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مکمل طور سبسڈی منسوخ کرنے کے بجائے اگر اس کے لئے مستحق اور غیر مستحق کا خیال رکھا گیا ہوتا تو یہ یقیناً ایک قابلِ قدر اقدام ہوتا۔

ہماری ریاست میں راشن پر سبسڈی وہ لوگ بھی حاصل کرتے تھے جو ہرگز ہرگز اس کے مستحق نہیں تھے۔ لیکن آج بھی یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس رعایت کے حقدار ہیں۔

اس رعایت کی منسوخی میں امیر اور غریب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک کر وزیر اعلیٰ نے ہرگز

شمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ اس لئے کہ مشاہدے میں آیا ہے کہ اس رعایت سے محروم ہونے والے راشن حاصل کرنے کے لئے کئی گھرانوں نے رفتہ رفتہ اپنا اثاثہ بیچ دیا۔ بعض گھرانوں نے اپنے زیورات برتن وغیرہ بیچ دیئے۔ اتنا ہی نہیں کئی گھرانوں کے بچے تعلیم چھوڑ کر روزگار حاصل کرنے کے لئے مجبور ہوگئے۔

راشن پر رعایت کی قدر و قیمت وہ لوگ ہرگز نہیں جان سکتے جو کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ بلکہ وہ لوگ جانتے ہیں جو محدود آمدنی میں گزارہ کرتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے راشن سبسڈی جانے والی ان رقومات سے سڑکیں تعمیر کرنے، پُرانے پلوں کی مرمت اور نئے پلوں کو بنانے پر صرف کرنے کی جو تجویز رکھدی۔ وہ بظاہر ایک صحیح تجویز تھی مگر اس کے باوجود بھی ہماری سڑکوں اور پلوں کی جو حالت ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک مد سے رقومات نکال کر دوسری مد میں ڈال کر ضائع کر دی گئیں تو ہرگز غلط نہیں ہوگا۔

یہ بات قابلِ ستائش تھی کہ وزیر اعلیٰ کو احساس ہوگیا کہ ہماری زرخیز وادی آج انڈے سے لے کر بینگن تک بیرونِ ریاست کی منڈیوں کی محتاج ہے اور اس کی ایک خاص وجہ یہی ہے کہ خزانہ عامرہ راشن پر سبسڈی کا بوجھ برداشت نہیں کر رہی ہے۔

لیکن پوچھا جاسکتا ہے، راشن پر سبسڈی کے خاتمے کے بعد کیا ہم ضروریاتِ زندگی کے بارے میں پانچ فیصد بھی خود کفیل ہوگئے ہیں ۔۔؟ نہیں !

مجھے اس بات کا دعویٰ ہے کہ راشن پر سبسڈی ختم ہونے کے باوجود بھی ضروریات زندگی کی ہر شئے کے لئے ہم بیرونِ ریاستوں کے محتاج ہیں اور یہاں آج بھی ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو راشن پر اس رعایت کے بالکل مستحق ہیں۔

شیخ صاحب کو بخشی صاحب کا یہ فیصلہ منسوخ کرنا تھا سو کر لیا۔ لیکن حالات اور واقعات شاہد ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ نے غریبوں، محتاجوں اور لاچاروں سے رعایت واپس لے کر یہ رعایت امیروں، رئیسوں اور سرمایہ داروں کو دی۔

ریاست کے دولتمندوں کو دولت سے مالا مال کیا گیا۔ ہزاروں اور لاکھوں روپے کی سبسڈی کے لالچ میں بعض سرمایہ داروں اور اثر و رسوخ رکھنے والوں نے اپنی کوٹھیوں کو گیسٹ ہاؤسوں میں بدل دیا۔

ایک ہوٹل کے مالک نے دوسرا ہوٹل بنایا۔ ایک ہاؤس بوٹ رکھنے والے نے دَو اور نئی

ہاؤس بوٹ بنائے۔ بعض صنعت کاروں اور کارخانہ داروں نے برائے نام صنعتوں اور کارخانوں پر بے شمار دولت حاصل کرلی۔

کئی امیرزادوں نے گاڑیاں خریدنے کے لئے لاکھوں کی سبسڈی وصول کرلی۔

عام لوگ جن میں بیشتر لاچار، غریب اور مجبور تھے سالانہ بیس کروڑ کی رعایت حاصل کرتے تھے جس کو وزیراعلیٰ نے خزانہ عامرہ پر بھاری بوجھ کہہ کر مسترد کیا، لیکن ریاست کے سرمایہ داروں نے ہوٹلوں، باغوں، صنعتی یونٹوں کارخانوں، ہاؤس بوٹوں اور موٹر گاڑیوں کی خرید پر شیخ عبداللہ کے دور حکومت میں جو سبسڈی حاصل کرلی۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق ایک ارب ستر کروڑ اٹھاون لاکھ اور بہتر ہزار روپے پر مشتمل ہے۔

جن سرمایہ داروں اور اثر و رسوخ رکھنے والے اشخاص نے اتنی ڈھیر ساری دولت رعایت میں حاصل کرلی ان میں بیشتر ہماری نظروں کے سامنے ایک کوٹھی سے دوسری کوٹھی، ایک ہوٹل سے دوسرا ہوٹل، ایک باغ سے دوسرا باغ، ایک ہاؤس بوٹ سے دوسرا ہاؤس بوٹ اور ایک کارخانہ سے دوسرا کارخانہ، ایک گاڑی سے کئی گاڑیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ایسے بھی اثر و رسوخ کے مالک ہیں جنھوں نے نہ کارخانہ لگایا نہ صنعتی یونٹ قائم کیا نہ ہی گاڑی خریدی اور نہ ہی ہوٹل بنایا لیکن پھر بھی سبسڈی وصول کرلی۔ جون ١٩٨١ء کو چیمبر آف کامرس کے اجلاس میں تقریر کے دوران وزیراعلیٰ نے خود کہا ہے — "مجھے حیرت ہے کہ کچھ تاجروں نے کروڑوں روپے کی سبسڈی حاصل کرنے کے باوجود کارخانے نہیں کھولے۔"



(شیخ محمد عبداللہ)

شیخ محمد عبداللہ کے دور حکمرانی میں سرمایہ دار اپنی پراپرٹی بڑھاتا گیا اور غریب نادار اپنا پیٹ پالنے کے لئے اپنا اثاثہ لٹاتا رہا۔ یہ اپنے محبوب لیڈر سے عوام کا ایک ایسا واسطہ تھا جو تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

سبسڈی کے بارے میں شیخ عبداللہ کا یہ استدلال ہے کہ اس سے کشمیری عوام کی قومی غیرت کو نقصان پہنچا ہے اور ذہنی طور پر یہ گداگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ غیرت کا تقاضا ہے کہ آدمی بھوکا رہے۔ چاول نہ ملے تو آلو کھائے، درختوں کے پتے کھائے مگر دستِ سوال دراز نہ کرے — "آدھی روٹی کھائیں گے سر نہیں جھکائیں گے۔" کہنے والے آج پچاس کروڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور عام لوگوں کی مالی و اقتصادی

حالت دیکھنے کے قابل ہے۔

کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا واقعی انسان کو ذلیل کرتا ہے لیکن کم آمدنی والے اپنی حکومت سے رعایت حاصل کریں تو یہ ہرگز معیوب بات نہیں ہے۔ جس ہندوستان سے دست سوال دراز کرنے پر ہمیں طعنہ دیا گیا۔ وہ یہاں کا نظامِ حیات چلانے کے لئے ہمیں فنڈس مہیا کرتا ہے ان فنڈ میں سے کچھ حصہ مستحق افراد کے لئے رعایت میں چلا جائے تو طعنہ کیسا۔؟ ہندوستان کے ساتھ ہم نے عارضی الحاق کیا ہے اور اس ناطے وہ ہماری ضروریات پورا کرنے کا ذمہ دار بھی ہے۔ خود ہندوستان بھی اپنے ملک کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسرے کئی ممالک سے رعایت وصول کر رہا ہے۔ یہ ایک نظام ہے جو کم و بیش ساری دُنیا میں چل رہا ہے۔

بہر حال اگر وزیراعلیٰ سمجھ رہے ہیں سبسڈی کے حقدار صرف سرمایہ دار ہیں اور یہاں کے غریبوں کے لئے ہندوستان کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے ہم اپنی عزت مٹی میں نہیں ملا سکتے تو چلئے ان کی بات مان لیتے ہیں — لیکن یہی شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ریاست کے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے طریقوں پر بڑی تیزی سے عمل کرنا چاہیئے اور اس سلسلے میں ریاست کی سب سے بڑی انڈسٹری یعنی سیر و سیاحت کو فروغ دینا لازمی ہے۔

ٹورسٹ انڈسٹری کو فروغ دینے کے لئے ان کا استدلال یہ ہے کہ بیرونی سیاحوں کو یہاں رہنے کے لئے ہٹ اور کوٹھیاں بنانے کی اجازت دی جانی چاہیئے جس زمین پر وہ ہٹ اور کوٹھیاں بنائیں یہ زمین وہ نوّے سال کے لئے پٹے پر حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ وزیراعلیٰ بیرونی سرمایہ داروں کو کشمیر میں کارخانے لگانے کی ترغیب دے کر انھیں نوّے سال کے لئے زمین پٹے پر دینے کی آفر کر رہے ہیں تاکہ یہاں کارخانوں کے بننے اور سیاحوں کے یہاں آکر مستقل رہائش کرنے سے لوگوں کو روزگار کے مواقع فراہم ہوں۔

یعنی ایک کشمیری باشندہ اپنی زمین کسی غیر ریاستی سرمایہ دار کو نوّے سال کے پٹے پر دے کر وہ زمین کے ٹکڑے کی مروجہ قیمت اسے ادا کرے۔

اس طرح کشمیری باشندے بیرونی سرمایہ داروں کے روپے کی جھنکار پر اپنے مستقبل کو بیچ ڈالے اور پھر چند برسوں کے بعد یہ کشمیری اس بیرونی سرمایہ دار کا غلام بن کر رہ جائے۔ نوّے سال میں دو نسلیں بیت جاتی ہیں۔ اگر ہم مروجہ قیمت پر اپنی زمین نوّے سال کی لیز پر کسی

غیر کشمیری کو پٹّے پر دے دیں تو ہمارا پوتا کیا کبھی اس زمین پر اپنا حق جتا سکے گا۔ جبکہ نوّے سال میں تاریخ، اپنا حلیہ ہی بدل چکی ہوگی۔

نوّے سال کے بعد قبضہ چھڑا لینے کے لئے ایک شخص کا پوتا وہ سرمایہ کہاں سے لائے گا۔ جو اس سے طلب کیا جائے گا۔ آج دس سال کے بعد کوئی کرایہ دار قبضہ نہیں چھوڑتا۔

نوّے سال کے بعد کہاں چھوڑے گا۔ اگر چھوڑے گا بھی تو سو گنا قیمت کے اضافے کے ساتھ جس کی ادائیگی ان کے بس کی بات ہوگی ہی نہیں۔

کشمیری قوم کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے خواب کی تعبیر یہ ہوگی کہ زمین کا مالک پٹّے دار کی نظرِ کرم کا محتاج ہوگا۔

جو شخص سبسڈی کی ذلت کو گوارا نہیں کرتے اور اسے قومی غیرت کے منافی سمجھ کر اسے لینا پسند نہیں کرتے۔ اپنی غیرت مندی کا ثبوت اس طرح دیں کہ اپنے آشیانوں کو جنھیں ہمارے آبا و اجداد نے خار و خس چُن چُن کر بنایا تھا بیرونی سرمایہ داروں کی چھوکھٹ کی نذر کر کے دَر دَر کی خاک چھانتے پھریں۔

کشمیری عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا اتنا ہی شوق تھا تو ایکارڈ کے عوض مرکزی سرکار کو یہاں چند کارخانے لگوانے کے لئے راغب کیا جا سکتا تھا نہ کہ اپنا اثاثہ بیرونی سرمایہ داروں کے ہاتھوں بیچنے کا ہمیں مشورہ دے کر اپنے ہاتھوں دفعہ ۳۷۰ کا جنازہ نکال دیا جاتا۔

وزیرِ اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے ایک اور حکم کے ذریعے ریاست کے طول و عرض میں دستکاری اور قالین بافی کے مراکز کھول کر بظاہر ایک کارنامہ انجام دیا۔ لیکن ان مراکز کے لئے ماہانہ تیس۳۰ روپے نقد اور تیس روپے اُدھار پر جن بچے اور بچیوں کا انتخاب کیا گیا یہ انتخاب بالکل غلط اور نامناسب تھا۔ اس کی وجہ سے ریاست کا مستقبل تعلیم کے زیور سے محروم ہوگیا۔

تیس روپے کے عوض معصوم بچوں کا مستقبل داؤ پر لگا دیا گیا۔

جو حکمران اپنے مُلک کے مستقبل سے اس قدر لا پرواہ ہو، اس کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور دینا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑا مارنے کے مترادف ہے۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ ایسے بچّے جو بیشتر کارخانے بند ہونے کی وجہ سے نہ اِدھر کے رہے اور نہ اُدھر کے۔ آج کل بسوں اور میٹاڈوروں کی کلینری کرتے ہیں۔ بس اڈّوں، چوراہوں اور پلوں و فٹ پاتھوں پر ماچس، صابن، اسٹوپن وغیرہ بیچ رہے ہیں۔

اندازہ کیجئے ایسے معصوم بچے جو سڑکوں، پلوں اور فٹ پاتھوں پر سودا سلف بیچتے ہیں جو نشر مدابہ خواتین ہر مہینے تنخواہ کے روز دفتروں میں راشن ٹکٹ لے کر جاتی ہیں تاکہ وہ ہوکاری راشن حاصل کر سکیں، وہ وزیرِ اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کی نظر میں سبسڈی کی مستحق نہیں ہیں۔ اگر سبسڈی کے مستحق تھے تو وہ سرمایہ دار جن کے یہاں بڑے بڑے ہوٹل، بڑے بڑے کارخانے اور ملیں ہیں۔ وہ بڑے بڑے میوہ کے باغوں کے مالک جو لاکھوں اور کروڑوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ بے شمار منافع کماتے ہیں۔ ان باغوں میں چھڑکنے کے لئے ۷۵ فیصدی سبسڈی پر ادویات حاصل کرتے ہیں۔ خزانہ عامرہ پر سالانہ پچاس کروڑ روپے تک کا بار ڈالتے ہیں۔ وزیرِ اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کا یہ نظریہ کس قدر افسوسناک ہے۔ اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

ایک ایسا شخص جو کشمیری عوام کی غیرت اور افلاس کو دیکھ کر میدانِ سیاست میں اُتر کر ان کی حالت سدھارنے کے لئے باغی بھی بنا وہ یہاں کے غریبوں کا دشمن اور سرمایہ داروں کا دوست کیسے بنا۔؟ سمجھ سے بالاتر ہے۔ البتہ اِس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُنھوں نے اپنے دورِ حکمرانی میں کاشتکاروں کو زمین کا مالک بنا کر ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جو یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

کاشتکاروں کو مالکانہ حقوق دے کر اُنھوں نے ایک ایسا فیصلہ عمل میں لایا جو تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کر گیا۔

وزیرِ اعلیٰ نے تعلیم کے پھیلاؤ، تعلیمِ نسواں میں بڑی دلچسپی دکھائی، انھوں نے اپنے پیشرو کے مقابلے میں حکومت کو مختلف ڈگر پر چلانے کی شروعات کی۔ اس کے ایک قدم کے طور پر ضلع ہیڈ کوارٹروں پر کابینہ کے اجلاس منعقد کرنے کی روایات کا آغاز کیا۔ جو ہنوز جاری ہے۔

ظاہری طور پر یہ ایک اچھی بات نظر آ رہی ہے۔ کیونکہ اس طرح کابینہ کو مخصوص اضلاع کے مسائل پر غور کرنے اور اُن کو حل کرنے کی تدبیر ڈھونڈنے کا موقع مل سکتا ہے۔ لیکن مشاہدے اور تجربے سے یہ بات بالکل غلط ثابت ہوتی ہے اور عملی طور پر یہ سلسلہ فضول خرچی اور مہنگے تماشے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں صرف وقت اور قومی دولت ضائع ہو جاتی ہے اور کوئی ٹھوس مقصد حاصل نہیں ہوتا، یہ بات مشاہدے میں آ چکی ہے کہ ریاست کی

پوری کابینہ جب کسی ضلع میں وارد ہو جاتی ہے تو وہاں کئی ہفتوں تک پوری سرکاری مشنری کی توجہ دیگر مسائل سے ہٹ کر کابینہ اجلاس کی تیاریوں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ کابینہ کا استقبال، سڑکوں، پلوں، کوہلوں اور نالوں کی عارضی مرمّت، علاقے کی عارضی صفائی کے علاوہ وازوان اور دعوتوں کا اہتمام، پوری سرکاری مشنری غیر معین عرصے تک انہی فضولیات میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے۔ ضلع ہیڈ کوارٹر پر کابینہ کے اجلاس کے دوران پوری حکومت وہاں منتقل ہو جاتی ہے۔ وزیر اعلیٰ سے لے کر گاؤں کے چوکیدار تک سینکڑوں افراد پر مشتمل کارواں جن میں منسٹر صاحبان، ایم ایل اے، ایم سی، کمشنر سیکریٹری، مختلف محکموں کے سربراہ، تحصیلدار، بلاک اور پنچایتی عہدیدار، دیگر محکموں کے سٹاف ممبران کے علاوہ پولیس اور سیکورٹی عملہ نیز درجنوں کاریں، جیپیں اور گاڑیاں، ان کا تیل اور اس کے ساتھ تمام کے تمام کارواں کا سفر اور قیام، الاؤنس (TA/DA)، ایک سرسری اندازے کے مطابق ریاست میں ایک ضلع ہیڈ کوارٹر پر کابینہ کی میٹنگ پر خزانہ عامرہ پر تقریباً ۸ لاکھ سے ۱۰ لاکھ روپے کا بوجھ پڑتا ہے۔

۱۹۷۷ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک اس قسم کی نمائشی فضول خرچی پر ایک کروڑ پچاسی لاکھ باون ہزار تین سو روپے صرف کئے گئے ہیں۔

ریاست کے ضلعوں، تحصیلوں، بلاکوں اور قصبوں کے معائنہ کرنے کرانے کے کام کی رفتار دیکھنے کے اور بھی کئی محدود طریقے ہیں جن کے لئے حب الوطنی کے ساتھ قومی درد اور عقل و شعور کی ضرورت ہے۔

شیخ محمد عبداللہ کے دورِ حکمرانی میں فتنہ فسادات، دھماکوں اور ہنگاموں نے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جب شیخ صاحب عوام کے لیڈر تھے تو اس قسم کے فسادات اور ہنگامے ان کی حکمرانی کی بحالی کے لئے ہوا کرتے تھے۔ اور جب وہ حکمران بن گئے تو یہ واقعات اُن کی ناقص کارکردگی کے خلاف وقوع پذیر ہوئے۔

شیخ صاحب کے دورِ حکمرانی میں ریاست میں پہلی بار بموں کے دھماکے ہوئے، قتل کے سیاسی اور غیر سیاسی ۱۳۰ وارداتیں ہوئیں۔ اقدام قتل کے ۱۱۰ اور چوری کے ۲۸۷۰ وارداتیں ہوئیں۔ ریاست کی مختلف جگہوں پر اس دوران ۹۰ بم دھماکے ہوئے۔ دنگا فساد کے ۸۲ اور ہنگاموں کے ۱۰۳ واقعات رونما ہوئے۔ اس دوران ۱۸۲۷ افراد کی گرفتاری بھی عمل میں لائی گئی۔ کُل ملا کر یہ سب سیاسی اور غیر سیاسی وارداتیں سابقہ دورِ

حکومتوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ جن کی کسی کو توقع نہ تھی۔

شیخ عبداللہ کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو صاف پتہ چلے گا کہ سرمایہ دارانہ ذہنیت میں وہ سرمایہ دارانہ کردار ادا کرنے میں پیش پیش رہے۔ سرمایہ کی پرستش میں وہ دوستی اور دشمنی میں امتیاز قائم کرنے کے ہرگز قائل نہ تھے۔ اس سلسلے میں ایک نادر مثال جس کا تعلق شیخ بخشی خاندان کی دشمنی اور دوستی سے ہے۔ دونوں کے آپسی سرمایہ دارانہ مفادات نے ۲۲ برسوں کی دشمنی بدلنے کی داغ بیل ڈالدی۔

"شیخ صاحب کا طبقاتی کردار" کے زیرِ عنوان مرحوم شمیم احمد شمیم نے اس دوستی اور دشمنی کا تجزیہ کرتے ہوئے اخبار "آئینہ" کے ۹ر اگست ۱۹۷۸ء کے شمارے میں لکھا ہے۔

"فروری ۱۹۷۵ء میں شیخ صاحب کے وزیر اعلیٰ ہونے کے دو یا تین ہفتے بعد جب بخشی صاحب کے صاحبزادے بخشی بشیر احمد اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ ایک ساتھ ایک مقامی قہوہ خانے میں داخل ہو گئے تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگے۔ بات اتنی معمولی تھی کہ عام حالات میں اس کا تذکرہ بھی عجیب لگتا ہے لیکن کشمیر کے سیاسی منظر میں یہ واقعہ باعث موضوع بنا رہا۔ بخشی بشیر اور شیخ فاروق کی دوستی روز بروز گہری ہوتی گئی۔ بخشی بشیر نے ایک اچھے بزنس مین کی طرح اپنے دفتر میں اپنے والد مرحوم کے مدِ مقابل شیخ صاحب کی ایک قدِ آدم تصویر آویزاں کرنے کا اہتمام کیا۔ شیخ صاحب سونہ وار سرینگر میں بخشی غلام محمد کے گھر گئے۔ جہاں انھوں نے بخشی صاحب مرحوم کی تصویر کو پھولوں کا ہار پہنایا اور ایسا کرتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اطلاع کے مطابق شیخ صاحب بیگم عبداللہ کے بھائی بین جی نیڈو کے صاحبزادے فریڈرک کا رشتہ بخشی بشیر کی صاحبزادی لوریٹا سے طے کرنے کے لئے بہت پرانے دوست اور دشمن بخشی صاحب کے گھر تشریف لے گئے تھے اور اس مبارک رشتے کے ساتھ" دو خاندانوں کے درمیان ۲۵ سالہ عداوت دشمنی اور بدظنی کا دور ختم ہو گیا۔

اس واقعے کا شیخ صاحب کی اخلاقی بلندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے سماج کا وہ طبقہ جو شیخ عبداللہ کو ڈوبا ہوا سورج سمجھ کر ۲۲ سال تک نئے چاند اور ستاروں کی پرستش میں مصروف تھا۔ شیخ صاحب کے اقتدار کا سورج طلوع ہوتے ہی ایک بار پھر اقتدار کے مرکزوں سے اپنا رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ احتجاج، جد و جہد اور مظاہرے کرنے والے ان غریب لوگوں پر تو شیخ صاحب کے دروازے اُسی دن بند ہو گئے کہ جس دن

شیخ عبداللہ نے زمامِ اقتدار سنبھالی۔ لیکن سرمایہ داروں اور ہر چڑھتے سورج کی پرستش کرنے والے طالع آزماؤں کے لئے شیخ صاحب کے گھر کے ہی نہیں اُن کے دل کے دروازے بھی کھل گئے ہیں۔

پورے ۲۲ سال تک شیر کشمیر، کشمیری عوام کے دلوں میں بخشی غلام محمد اور اس کے خاندان کے خلاف نفرت اور عداوت کا زہر بھرتے رہے..... اُن کے اقتدار سے محروم ہونے کے بعد بھی شیر کشمیر کے غیض و غضب میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ اُن کی زندگی کے آخری دم تک انھیں کوستے رہے۔ حد یہ ہے کہ ان کی موت پر اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ ان کے جنازے میں شرکت نہیں کی بلکہ بخشی صاحب کے لواحقین سے اظہار تعزیت کے دو رسمی الفاظ کہنے سے بھی پرہیز کیا۔ یہی نہیں بلکہ بخشی صاحب کی تجہیز و تدفین کے وقت جب کچھ لوگوں نے اُن کی قبر پر پتھر پھینکنے کی مذموم حرکت کی تو شیخ صاحب نے اس کی مذمت سے بھی انکار کیا۔ اُنھوں نے یہ کہہ کر ایسے عناصر کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ کشمیریوں کی دریا دلی ہے کہ بخشی جیسے غدار کو کشمیر میں دفن ہونے کے لئے دو گز زمین مل گئی......

میرا اپنا خیال ہے کہ بخشی بشیر اور شیخ فاروق کی دوستی، شیخ صاحب کا بخشی صاحب کے گھر جاکر اُن کی تصویر کی گُل پوشی کرنا اور پھر بخشی بشیر کی صاحبزادی اور فریڈرک کی شادی میں غیر معمولی دلچسپی کے اظہار کا شیخ عبداللہ کی اخلاقی بلندی سے کوئی تعلق نہیں یہ سب کچھ بنیادی طور پر ان کے اور اُن کے خاندان کے طبقاتی کردار کا آئینہ دار ہے۔ اپنے سیاسی مقاصد کے لئے شیخ صاحب بھلے ہی کشمیری عوام کو عزت و آبرو کا مقام دلانے کا بار بار عہد کریں۔ طبقاتی اور ذہنی طور پر وہ پھر سرمایہ دار ہیں اور انھیں سرمایہ داروں کی صحبت زیادہ مرغوب اور اُن کی رفاقت زیادہ پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داروں کے معاملے میں وہ سیاسی نظریات اور اعتقادات کو ہی نہیں بلکہ اُن کے ماضی کو بھی نظر انداز کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ راج ساہنی، دھرم ویرا و برائے، لالہ تیر تھ رام، وجے در، بخشی بشیر علی شاہ، سیف الدین، شہداد، ایم۔ رمضانا، منتو سنز، خانیاری سنز، جمال سراج، شاہ سنز، سفرنگ موٹرز اور پرکاش سونی سے لے کر شہر کے ہر بڑے تاجر اور سرمایہ دار سے شیخ صاحب اور ان کے صاحبزادے کی دوستی اُن کے اسی فطری رجحان کی غماز ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر کرن سنگھ، ڈی۔ پی۔ در، سید میر قاسم اور مسز اندرا گاندھی سے بھی ان کے ذاتی تعلقات اس لئے خوشگوار تھے اور ہیں کہ یہ تمام لوگ

طبقاتی طور پر دولت اور اقتدار کے اس زمرے میں شامل ہیں کہ شیخ صاحب کے احساسِ کمتری اور ان کی انا کی تسکین کرتا ہے۔ اس کے برعکس شیخ صاحب اپنے کسی ایسے سیاسی حریف سے ذاتی تعلقات قائم رکھنے یا دوستی استوار کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جو اقتدار یا دولت، کسی شعبے میں ان کے معیار پر پورا نہ اُترتا ہو، یہی وجہ ہے کہ وہ ڈی۔ پی۔ در کی موت پر زار زار روئے ۔ لیکن بخشی صاحب جو ڈی۔ پی۔ در سے بھی زیادہ اُن کے قریبی دوست اور رفیق رہ چکے تھے۔ ان کے جنازے میں شرکت سے انکار کر دیا۔ بخشی صاحب سے انھیں یہ شکایت تھی کہ وہ آخری وقت تک ان کے اور اقتدار کے درمیان حائل ہوتے رہے۔



(ڈی - پی - در)

ڈی۔ پی۔ در کو انھوں نے اس لئے معاف کر دیا تھا کہ اس نے موت سے پہلے ان کے صاحبِ اقتدار ہونے میں اُن کی مدد کی تھی۔ شیخ صاحب کا یہ طبقاتی کردار اُن کی زندگی پر چھایا رہا۔

کشمیر کے وہ لوگ جو پچھلے ۲۲ برسوں سے ۹ اگست کو ہر سال "یوم سیاہ" منا کر بخشی غلام محمد کی غداری اُن کی وطن فروشی اور محسن کشی کی یاد منایا کرتے تھے جو مرحوم بخشی کے بھائی بندوں اور اس کے صاحبزادے کے عالی شان بنگلوں کو رشوت، بددیانتی اور خزانہ عامرہ کی لوٹ سے منسوب کر کے انھیں قومی تحویل میں لئے جانے کا مطالبہ کرتے آئے ہیں۔ یہ جاننا چاہیئے کہ اب جبکہ بخشی صاحب اور شیخ صاحب کے خاندان ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ اگست ۱۹۵۳ء کے سانحے کو کس رنگ میں اور کس طور پر منایا جائے۔؟ کیا آج کے دن بدستور بخشی صاحب کی مبینہ سیاہ کاریوں، غداریوں اور وطن فروشی کے قصے کہانیاں دہرا کر ان پر اور ان کے خاندان پر لعن طعن کیا جائے یا فاروق عبداللہ کی دوستی کی خاطر اور مسز لوریٹا بخشی کے جذبات کے احترام میں اس دن ۹ اگست کو وزیر اعلیٰ ہونے کا جشن منایا جائے ؟

کیا آج کے دن کو "یوم سیاہ" کے بجائے " اعتراف گناہ" کے طور پر منانا زیادہ موزوں نہ ہو گا ـــ ؟ "



زیورِ تعلیم سے محروم کر کے ان کا مستقبل تاریک بنا دیا گیا

کہتے ہیں بھائی بھائی یہ اہلِ وطن تمام
پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لیے ہوئے

مرزا محمدّ افضل بیگ کا
وزارت اور تنظیم سے اخراج

کونسل کی خالی نشستوں کو پُر کرنے کے لئے اگست ۱۹۷۸ء میں ممبران کے نام زیرِ غور آئے تو شیخ صاحب کے دستِ راست، ان کے وفادار دوست اور اُن کے نائب مرزا محمد افضل بیگ نے اُن سے استدعا کی کہ کونسل کی ایک نشست ان کے داماد مرزا یعقوب بیگ کو عنایت کی جائے۔ بیگ صاحب کا خیال تھا کہ وزیر اعلیٰ میری قربانی اور میرا لحاظ مدِ نظر رکھ کر بخوشی ان کی یہ استدعا قبول کریں گے اور کونسل کا ممبر بن جانے کے بعد وہ وزیر اعلیٰ سے اپنے داماد کے لئے منسٹری کا عہدہ حاصل کرائیں گے۔



اس خیال سے کہ شیخ عبداللہ کا داماد بھی منسٹر ہے اور لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ لہٰذا میں ہی پیچھے کیوں رہوں، انھوں نے اپنے داماد کا نام شیخ صاحب کے سامنے پیش کیا۔ (محمد افضل بیگ)

مرزا افضل بیگ اگرچہ اپنے بیٹے ممتاز بیگ کے بارے میں شیخ صاحب کو آزما چکے تھے پہلی بار انھوں نے ممتاز بیگ کی ملازمت کی درخواست رد کر دی تھی۔ پھر بھی انھیں آشا تھی اب کی بار وہ اُن کی سفارش رد نہیں کریں گے۔

مرزا افضل بیگ کو اس وقت بڑی خفت اُٹھانی پڑی جب بیٹے کے بعد داماد کے بارے میں ان کی استدعا مسترد کر دی گئی۔

شیخ صاحب اس وقت بھول گئے کہ میرا داماد منسٹر ہے۔ میری بیوی پارلیمنٹ ممبر ہے اور بیٹا یوتھ نیشنل کانفرنس کا صدر ہے۔ جب کہ اُنھوں نے بیگ صاحب سے سخت لہجے میں کہا۔

"ہمارے گھر اور خاندان سے باہر بھی ایسے قابل لوگ ہیں جو ان عہدوں کے مستحق ہیں۔ اگر ہم صرف اپنے گھر کے افراد کو ہی ان عہدوں پر لے لیں تو لوگ کیا کہیں گے؟"

بیگ صاحب جیسے زیرک کی شیخ صاحب کے سامنے بولتی بند ہو گئی البتہ بیگ صاحب کو نا اُمید ہوتے دیکھ کر بولے۔

"اگر آپ کی یہی چاہت ہے تو میں اُن کو بھی منڈیٹ دوں گا لیکن انھیں کامیاب کرنے کی میں ذمہ داری نہیں لے سکتا' ایسا نہ ہو کہ وہ انتخاب میں ناکام ہو جائیں اور آپ کو لینے کے دینے پڑیں۔"

بیگ صاحب کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آئی کہ وزیر اعلیٰ کیا کہہ رہے ہیں۔ البتہ جب وزیر اعلیٰ نے ووٹوں کی تقسیم کا فارمولہ پیش کیا تو اس حساب سے انھوں نے مرزا یعقوب بیگ کی ناکامی کا انتظام کر لیا تھا۔

کونسل کے لئے کشمیر سے تین اُمیدوار جن میں بارہمولہ سے حفیظ اللہ شاہ' سرینگر سے شیخ عبدالجبار اور اسلام آباد سے مرزا یعقوب بیگ نامزد کئے گئے۔

بارہمولہ اور سرینگر کیلئے اُنھوں نے بیس۲۰ بیس۲۰ ووٹ مگر اسلام آباد کے لئے صرف تیرہ۱۳ ووٹ تفویض کئے۔


(ملک محی الدین)

شیخ صاحب کی طرف سے ووٹوں کی اس طرح کی تقسیم کا معاملہ زیر بحث آیا تو مرزا افضل بیگ اسپیکر ملک محی الدین اور کئی دوسرے نیشنل کانفرنس کے ممبران وزیر اعلیٰ کے اس طریقہ کار کے خلاف ہو گئے۔ اپنے دیرینہ ساتھی جس نے قدم قدم پر ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ شیخ عبداللہ کا رویہ نہایت ہی نامناسب سمجھ کر نیشنل کانفرنس کے بعض ممبران بلکہ... کئی کانگریسی ممبران نے بھی مرزا یعقوب بیگ کے حق میں ووٹ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۱ ستمبر ۱۹۷۸ئہ کو جب کونسل کے چناؤ نتائج سامنے آگئے تو وزیر اعلیٰ اور اُن کا داماد

غلام محمد شاہ دم بخود سے ہو گئے۔ یہ دونوں مرزا یعقوب بیگ کی ہار کی خبر سننا چاہتے تھے۔ جب انھیں ان کی جیت کی خبر سنائی گئی تو انھیں حیرت کے ساتھ تعجب بھی ہوا۔

مرزا یعقوب بیگ کو خلافِ توقع سب سے زیادہ ووٹ مِلے تھے۔ اور یہ شیخ صاحب کے لئے صدمے کا باعث بن گیا۔

مرزا یعقوب بیگ کی جیت کو وزیر اعلیٰ نے اپنی ہار سے تعبیر کیا۔ چنانچہ انھوں نے اس کا سخت نوٹس لیا۔

مولوی یاسین ہمدانی سے جب جواب طلبی کی گئی کہ اُنھوں نے اپنا ووٹ یعقوب بیگ کے حق میں کیوں استعمال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس لئے مجھے اسپیکر ملک محی الدین نے مجبور کیا۔

چنانچہ مرزا افضل بیگ کے ساتھ اسپیکر ملک محی الدین کو سازشی عناصر میں شامل کر لیا گیا، مرزا یعقوب بیگ کے معاملے میں شیخ صاحب اور بیگ صاحب کے بارے میں ٹھن گئی۔ تو مرکزی سراغ رساں ایجنسی نے شیخ عبداللہ تک یہ بات پہنچا دی کہ مرزا افضل بیگ نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی مدد سے ممبران کو پھنسا کر آپ کے خلاف عدم اعتماد کی تیاری کر رہے ہیں ـــــ اُدھر مرزا افضل بیگ سے کہا گیا کہ شیخ صاحب سے نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے بیشتر ممبران ناراض ہیں اور وہ آپ کو اپنا لیڈر تسلیم کرنے میں راضی ہیں۔ لہٰذا موقع غنیمت ہے۔

اسی دوران مرزا افضل بیگ سرکاری دورے پر دہلی گئے کہ وزیر اعلیٰ نے پہلی فرصت میں وزارت سے اُنھیں برطرف کر دیا اور تنظیم سے نکال دیا۔

نئی دہلی سے واپسی پر مرزا افضل بیگ نے اپنے بیان میں کہا۔

"نئی دہلی میں وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس منعقد ہونے تک میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شیخ صاحب کو میرے خلاف اتنی شکایات ہیں۔ اگر مجھے اس کا علم ہوتا تو میں وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس میں شرکت کرنے دہلی کیوں جاتا۔ ۴۵ سال سے شیخ صاحب کی خوشیوں اور غموں میں شامل رہا ہوں۔ میں نے اپنی جان کی قیمت پر شیخ صاحب سے وفا کی۔ یہ بالکل غلط ہے کہ میں اُن کے خلاف کوئی سازش کر رہا تھا۔"

وزیر اعلیٰ کی طرف سے ان کے خلاف سخت ترین کارروائی کو دیکھ کر کئی ممبران اسمبلی

اُن سے ملے تو اگلے روز انھوں نے بیان دیا۔

"میرے ساتھ اسمبلی ممبران کی کافی تعداد ہے اور میں وزیر اعلیٰ کی اس نامناسب حرکت کا توڑ کر سکتا ہوں۔"

بیگ صاحب کے اس انکشاف سے نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ لرزہ براندام ہوگئی۔ چنانچہ تمام ممبران اسمبلی کو پولیس وائرلیس کے ذریعے طلب کر لیا گیا۔

کئی ممبران اسمبلی دوڑے دوڑے سرینگر آگئے اور جو نہیں آئے اُن کو غلام محمد شاہ نے ہتھکڑیاں پہنانے کی دھمکی دی۔



(غلام محمد شاہ)

سرینگر آنے والے ممبران اسمبلی کو وزیر خوراک غلام محمد شاہ کی کوٹھی میں ایک طرح سے نظر بند کیا گیا اور یہاں ان محبوس ممبران اسمبلی سے کہا گیا کہ وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر شیخ صاحب کی وفاداری کا اقرار کرلیں، جو ایسا نہیں کرے گا اُس کے ساتھ ٹھیک طرح سے نپٹ لیا جائیگا۔"

بیگ صاحب کے ساتھ وفاداری کی پاداش میں مولوی یٰسین ہمدانی کو معافی مانگنے پر چھوڑ دیا گیا۔ لیکن عبدالغنی وبری، عبدالسلام دیوا، محمد ابراہیم ڈار، اور عبدالصمد شبلی کو زدوکوب کر کے غلام محمد شاہ کی کوٹھی پر لایا گیا۔ کیونکہ اس سے قبل یہ سبھی ممبران بیگ صاحب کی حمایت کا اعلان کر چکے تھے۔ البتہ مار پیٹ کر کے انھیں اس صف سے واپس نکال لایا گیا۔ صرف محمد ابراہیم ڈار اپنے اعتماد پر مستحکم رہے۔

دونوں طرف ایک دوسرے پر الزامات لگائے گئے اور ایک دوسرے کو اعتماد شکنی کا مرتکب ٹھہرایا گیا۔ اس سلسلے میں ۲۷ ستمبر کو وزیر اعلیٰ نے اقبال پارک میں عوامی اجتماع کے سامنے فرمایا۔

"...... سابق نائب وزیر اعلیٰ مرزا افضل بیگ کے ان لوگوں کے ساتھ خفیہ تعلقات تھے جو نیشنل کانفرنس اور اس کے لیڈر کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں ایک طرح سے ان لوگوں تک مواد پہنچایا جا رہا تھا جن کو نیشنل کانفرنس کی مضبوطی پسند نہیں۔ اس صورت حال کا بڑی گہرائی سے ہم جائزہ لے رہے تھے اور ان خفیہ تعلقات پر نظر رکھ رہے تھے۔

کونسل کے انتخابات میں جو ووٹ اندازی ہوئی اس میں بیگ صاحب

نے کانگریس کے ساتھ خفیہ سمجھوتہ کیا تھا۔ تنظیم میں ہی نہیں بلکہ حکومت میں بھی بیگ صاحب نے اپنے خاص آدمیوں کے گروہ پیدا کئے تھے۔ یہ گروپ بندی کافی عرصہ سے ان کا ایک مقصد بن گیا تھا۔ کونسل کے انتخابات میں مرزا افضل بیگ نے کس طرح اس طریقہ کار کی خلاف ورزی کی جو ووٹنگ کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اس کا ثبوت میر واعظ مولانا محمد یاسین ہمدانی کے بیان سے مل سکتا ہے۔ مولانا یاسین ہمدانی سیاست گری نہیں جانتے۔ وہ ایک شریف اور سادہ آدمی ہیں۔ اُن کو بیگ صاحب نے کس طرح مرزا یعقوب بیگ کے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ کیا۔ مولانا یاسین ہمدانی کو یعقوب بیگ کے حق میں ووٹ دینے کے لئے اسپیکر ملک محی الدین نے آمادہ کیا۔

یہ ایک معمولی بات سمجھ کر درگزر نہیں کی جا سکتی۔ اپنے ۴۷ سالہ ساتھی کو علیحدہ کرتے وقت دل پر ضرور گراں گزرتا ہے۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا کتنا مشکل اور گھمبیر تھا۔ جس وقت ہم موت اور زندگی کی کشمکش میں ہوں۔ اگر اس وقت بھی ایسا ہو تو ہمارا انجام کیا ہوگا۔

۱۹۵۳ء میں بھی ایسا ہی ہوا جو لوگ شام تک کہتے تھے۔ شیخ صاحب ان کا چھٹا صفت ایمان ہے۔ انھوں نے ہی صبح سویرے میری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ اس قسم کی شرارت جہاں سے بھی ہو اس کا فوراً سر کچلنا چاہیئے۔"



(شیخ محمد عبداللہ)

شیخ صاحب کی اقبال پارک کی تقریر کے اگلے روز اسمبلی اور قانون سازیہ کے مشترکہ اجلاس میں ممبران کی اکثریت نے شیخ عبداللہ پر اعتماد کا اظہار کیا، اس طرح وزیر اعلیٰ نے مرزا افضل بیگ سے مکمل چھٹکارا پالیا۔ جن کے بارے میں انھوں نے سوپور میں پبلک جلسہ میں فرمایا تھا:

"بیگ صاحب قوم کو ساحل مُراد تک لے جائیں گے۔ یہ قوم کو بیچنے والے نہیں۔"

آج یہی بیگ صاحب اپنے داماد کی صف میں لانے کی پاداش میں وزارت

اور تنظیم سے ایسے نکال دیئے گئے جیسے تنظیم میں ان کی نہ کوئی حیثیت تھی اور نہ ہی وقعت سچ تو یہ ہے کہ تنظیم کے ایک ادنیٰ ورکر کو بھی اس طرح نکالنے میں پس وپیش کیا جاتا جس طرح بیگ صاحب کو بے عزّت کرکے نکال دیا گیا۔ نصف صدی کا یار جنھوں نے قدم قدم پر ان سے وفا کی تھی۔ جن کو شیخ عبداللہ کا ساتھ چھوڑنے پر وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ پیش کیا گیا تھا۔ لیکن یہ پیش کش انھوں نے دوستی کی خاطر ٹھکرادی۔

آج اُس یار اور وفادار کو داماد کی ممبری پر ایسی ٹھوکر ماری گئی کہ انھیں اپنی وفاداری پر ضرور ماتم کرنا پڑا۔

۲۹ ستمبر ۱۹۷۸ء کو مرزا افضل بیگ نے اپنی کوٹھی پر پریس کانفرنس کا انعقاد کیا۔ یہاں وہ پانچ ممبران اسمبلی بھی تھے جنھیں اسی رات زدکوب کرکے گلہ شاہ کی کوٹھی میں بند کرکے رکھدیا گیا تھا۔



بیگ صاحب نے کہا۔

"..... شیخ محمد عبداللہ بخشی غلام محمد کے طور طریقوں پر چل رہے ہیں۔ میری غیر حاضری میں میرے خلاف سازش تیار کی گئی۔ ۱۵ ممبران اسمبلی میرے ساتھ ہیں (بخشی غلام محمد و مرزا محمد افضل بیگ)

۱۹۵۳ء میں مجھے بخشی غلام محمد کی سازش کا شکار ہونا پڑا اور آج مجھے ایسے ہی حالات سے سابقہ پڑا۔

میں لوگوں کے جمہوری حقوق اور ایک خاندان کی حکومت کے خلاف لڑوں گا۔ اس سلسلے میں مجھے اہم رول ادا کرنا ہے کیونکہ شیخ خاندان اور ان کے ساتھیوں کے متعلق میرے پاس معلومات کا خزانہ ہے۔

آج بھی ممبران اسمبلی کو پولیس کے ذریعے بلاکر اُن سے جبراً شیخ صاحب کے حق میں بیان دلوایا جارہا ہے۔ ہمارے پاس وہ وائرلیس میسج موجود ہے جو پولیس کو ممبران اسمبلی لانے کے لئے دی گئی۔

عبدالغنی لون میرے پاس آئے تو شیخ صاحب ناراض ہوگئے۔ لیکن خود شیخ صاحب ڈاکٹر کرن سنگھ سے ملنے جاتے ہیں جبکہ ان کے کہنے

کے مطابق وہ ہمارے دشمن ہیں"

مرزا افضل بیگ کے اخباری بیان کے بعد نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ زیادہ سے زیادہ ممبران کا اعتماد حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ کرنے لگی۔ اب زور زبردستی کرنے کے بجائے انھوں نے خزانہ کا ڈھکن کھول دیا۔ تو بیگ صاحب کی وفاداری کا دم بھرنے والے ممبران اسمبلی بھی شیخ صاحب سے جاملے۔

چنانچہ قانون ساز اسمبلی کے ممبران عبدالصمد تیلی' غلام حسن گیلانی' عبدالعزیز پرے' حاجی بلند خاں' حکیم محمد یاسین اور مولوی یاسین ہمدانی نے ایک مشترکہ بیان میں کہا کہ وہ کبھی نیشنل کانفرنس سے علیحدہ نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی کبھی انھوں نے نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ پر کسی قسم کے شک ظاہر کئے۔

ان ممبران اسمبلی نے مجاہد منزل میں پریس نمائندوں کے سامنے بیگ صاحب کی پریس کانفرنس میں موجود ہونے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا:

"ہم نیشنل کانفرنس کے لیڈر شیخ محمد عبداللہ پر غیر متزلزل اعتماد رکھتے ہیں۔ ہم نے بیگ صاحب کی پریس کانفرنس میں حصّہ لیا تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں لیا جانا چاہیئے کہ شیخ صاحب کی لیڈر شپ پر ہمارا اعتماد اُٹھ گیا ہے۔ انھوں نے کہا۔ ہم نے بیگ صاحب کے خلاف کاروائی کی مذمت نہیں کی تھی بلکہ ایک سادہ کاغذ پر دستخط کئے تھے۔

شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کی اس لڑائی پر تبصرہ کرتے ہوئے صوفی محمد اکبر نے ان دونوں لیڈروں کی شدید نکتہ چینی کی۔ ان کے رول کو قابلِ مذمت قرار دے کر اسے کرسی کی لڑائی سے تعبیر کیا اور فرمایا:

"ان دونوں لیڈروں نے کشمیر کاز کے ساتھ غداری کرکے کشمیری عوام کا استحصال کیا۔ مسئلہ کشمیر حل طلب ہے اور اس کا حل صرف حقِ خود ارادیت کی بنیاد پر بذریعہ رائے شماری یا کسی اور متبادل طریقے پر جس سے اصل مقصد پر زد نہ پڑے"۔



اگلے روز ۴ اکتوبر کو بیگ صاحب نے گول باغ میں ایک جلسے کی منادی کرائی، جلسہ گاہ میں شامیانہ لگایا گیا۔ جگہ جگہ لاوڈ اسپیکر نصب کئے گئے۔ جس وقت گول باغ میں مرزا افضل بیگ کے حمائتی جلسہ گاہ کو سجانے میں لگے ہوئے تھے۔ ٹھیک اُسی

وقت مجاہد منزل کے ہال میں نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ اپنے ~~دیرینہ اور پالتو غنڈوں~~ کو جلسہ گاہ تباہ کرنے، مرزا افضل بیگ اور اُن کے ساتھیوں کو عبرتناک سزا دلانے کے لئے تیار کر رہی تھی۔

اُدھر بیگ صاحب اپنی کوٹھی سے جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے اِدھر اُن کو گزند پہنچانے اور جلسہ گاہ سے مار بھگانے کے لئے وہ نیشنل فوج محاذ کی طرف روانہ ہوگئی جو برسوں سے بیگ صاحب کے جلسوں اور جلوسوں کی رونق بڑھانے میں پیش پیش ہوا کرتی جلسہ گاہ پہنچ کر بیگ صاحب تالیوں کی گونج میں مائیک کے سامنے آئے۔ ابھی وہ کچھ بول ہی رہے تھے کہ نیشنل فوج نے کاروائی شروع کی، شامیانہ کی رسّیاں اور لاوڈ اسپیکروں کی تاریں بیک وقت کاٹ دی گئیں، دیکھتے ہی دیکھتے ایک کہرام مچ گیا۔ شامیانے کے نیچے زندگی اور موت کے درمیان بیگ صاحب کے ساتھ دوسرے لوگ اور پریس نمائندے تڑپنے لگے اور نیشنل فوج "لانگ لیو عبداللہ" کہتے ہوئے دھما چوکڑی مچانے لگے۔

مرزا افضل بیگ حکومت اور تنظیم سے نکالے جانے کے بعد پہلی بار عوام کے سامنے اپنا نکتہ نظر پیش کرنے والے تھے۔ یہ ۴۵ سال کے بعد پہلا پبلک جلسہ تھا جب بیگ صاحب شیخ عبداللہ کے ایک حریف کی حیثیت سے تقریر کرنے والے تھے۔

یہ تحریکِ حریت کے اُس بڑے کارواں کا آخری فرد تھا۔ جواب تک شیخ صاحب کا ساتھ نبھا رہا تھا۔ ورنہ سارا کارواں حریت ایک ایک کر کے اُن سے علیحدگی اختیار کر چکا تھا۔ شیخ صاحب نے شاید میدانِ سیاست میں آنز کر قسم لے لی تھی کہ میں زندگی کے آخری سفر تک ایک بھی فرد کو اپنے ساتھ نہیں لوں گا۔

بیگ صاحب کی آمد سے پہلے اسٹیج کی نگرانی غلام رسول زاہگیر کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ پیوپلز لیگ اور کچھ پرانی ناراض تنظیموں کے لوگ بھی موجود تھے۔

بیگ صاحب جلسہ گاہ میں آئے تو اُن کے ہمراہ اُن کے بھائی غلام قادر بیگ، داماد مرزا یعقوب بیگ اور محمد ابراہیم ڈار اور ایک گوجر لیڈر چودھری محمد اشرف بھی تھے۔

مرزا افضل بیگ کی تقریر سے پہلے ہی نیشنل کانفرنس کی منظم ٹولی جلسہ گاہ پر ٹوٹ پڑی اور انھوں نے شامیانہ گراتے ہی جلسہ گاہ کو تتر بتر کر دیا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے حق نمک کی ادائیگی کے طور پر ایک بیان جاری کیا جس میں جھگڑے کی ذمہ داری مرزا افضل بیگ کے حامیوں پر ڈال دی۔

اس طرح کی کُھلم کھلا غنڈہ گردی اور زور زبردستی کے خلاف مولوی محمد فاروق، عبدالغنی لون، مظفر حسین بیگ، عبدالرشید کابلی کے ساتھ کانگریس کے لیڈر مفتی محمد سعید، گردھاری لال ڈوگرہ اور منگت رام شرما نے احتجاج کیا اور اسے بدترین قسم کی حرکت قرار دیا۔

اپوزیشن لیڈروں کے اس واویلا کے بعد بیگم عبداللہ نے فرمایا:

"مخالفت برائے مخالفت سے ہمارے عزائم متزلزل نہیں ہوں گے۔ ہمارے سامنے جو بھی رکاوٹ آئے گی اُسے ہم ہٹا کر ہی آگے بڑھیں گے۔ کامیابی آخر ہمارے قدم چومے گی۔!"

گول باغ سرینگر میں مرزا افضل بیگ کے جلسہ کو درہم برہم کرنے اور پھر بیگ صاحب کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے روکنے کی جو کاروائی کی گئی وہ کشمیر کی جمہوری تاریخ میں ایسے دوسرے دھبّوں میں ایک اور دھبّہ بنکر اُبھر آیا۔

"ملک کے کئی برگزیدہ اخبارات کے ساتھ مقامی اخبارات نے نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ پر اس قسم کی غنڈہ گردی پر شدید نوعیت کے الزام لگائے اور اس جماعت کو غنڈوں سے تعبیر کیا۔ بعض اخبارات نے بیگ صاحب پر الزام لگایا کہ وہ بھی برسوں تک خود اس انتہا درجے کی غنڈہ گردی کے پروردہ رہے ہیں"

سرینگر میں مار کھانے کے بعد مرزا افضل بیگ نے پہلے اسلام آباد میں اور اس کے بعد سوپور میں عوامی اجتماعات سے خطاب کیا اور فرمایا:

"..... موجودہ حالات میں مرکز کو کشمیر میں مداخلت کرنی چاہیئے۔ شیخ صاحب نے خود کبھی ڈسپلن کی پابندی نہیں کی۔ غلام محمد شاہ نے کانگریس کا نمائندہ ہونے کا اعلان کیا مگر اُن کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔

شیخ صاحب آج کہہ رہے ہیں ۱۹۵۳ء میں بیگ صاحب ذیلدار بیگ کی وجہ سے حق پر رہے لیکن میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ ۱۹۵۳ء سے لے کر آج تک شیخ صاحب میرے بارے میں کیوں خاموش رہے۔ اگر شیخ صاحب میں خلوص تھا تو انھوں نے میرے متعلق یہ باتیں کیوں نہ بتائیں۔ شیخ صاحب کہہ رہے ہیں میں نے اُن کے جانی دشمنوں سے گٹھ جوڑ کیا تھا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ انھوں

نے جانی دشمنوں کے ساتھ سمجھوتہ کر کے انھیں دوست کیوں بنایا۔ شیخ صاحب کا کوئی جانی دشمن نہیں ہے۔ در اصل وہ خاندانی راج قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن ہماری گردن کٹے گی ہم یہاں خاندانی راج قائم نہیں ہونے دیں گے۔

شیخ صاحب اسمبلی کے اسپیکر ملک محی الدین کے خلاف نہایت توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ شخصی راج اور خاندانی راج میں عوام ظلم وستم میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ شیخ صاحب آمرانہ طریقوں سے عمل کرتے ہیں۔ اگر کوئی سرکاری آفیسر یا اہلکار مجھے سلام کرتا ہے تو اس کی شامت آجاتی ہے۔ اس قسم کے طریقے وہاں بھی آزمائے نہیں جاتے جہاں ڈکٹیٹر شپ ہے۔

نیشنل کانفرنس کی گرتی ساکھ کو بچانے کے لئے شیخ صاحب نے ڈاکٹر فاروق کو جنتا کے لیڈر مولانا مسعودی اور ڈاکٹر مجید کو منانے بھیجا تاکہ وہ نیشنل کانفرنس میں دوبارہ شامل ہو جائیں۔

جنتا لیڈروں کے بارے میں اُن کی رائے کو مدِ نظر رکھ کر کیا یہ ڈسپلن شکنی نہیں ہے ___ ؟

شیخ صاحب اتنے گھبرا گئے ہیں کہ انھوں نے گورنر کے ذریعے اسمبلی کو برخواست کرادیا تاکہ اسپیکر ملک محی الدین اور کونسل کے چیرمین حکیم حبیب اللہ اجلاس طلب نہ کرسکیں لیکن فروری میں وہ کیا کریں گے جب بجٹ سیشن ہوگا۔

شیخ صاحب کہتے ہیں غلام محمد شاہ، خواجہ علی شاہ اور محی الدین شاہ نے قربانیاں دی ہیں لیکن میں بہت جلد بتاؤں گا۔ ان کی قربانیوں کا معاوضہ دینے میں قوانین میں کس طرح ترمیمیں کی گئیں اور بے پناہ رقوم ان کو دی گئیں۔

مرزا افضل بیگ کے ان الزامات کا جواب شیخ عبداللہ نے پانپور جاکر دیا۔

۲۰ اکتوبر کو شیخ صاحب نے پانپور کے مقام پر عوامی اجتماع کے سامنے فرمایا:



شیخ عبداللہ

"بیگ صاحب لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ کوئی بھی سیاسی جماعت زندہ نہیں رہ سکتی جس کے صفوں میں انتشار پیدا ہو جائے۔

مولانا فاروق اُس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے پیشروں نے قوم کا سودا کیا۔ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ آپ نیشنل کانفرنس کو مضبوط بنائیں۔ یہی وہ واحد پارٹی ہے جس نے اپنے خون سے آبیاری کر کے آزادی حاصل کرلی ہے اور یہی جماعت عوام کے مفادات کی محافظ ہے۔ نیشنل کانفرنس نے مشکل حالات کے باوجود یہاں کے لوگوں کے بنیادی حقوق بحال کرائے، ہم نے ماضی کے تجربات سے سبق حاصل کیا ہے کہ اپنی صفوں کو مضبوط بنائیں کیونکہ کوئی بھی کمزوری تنظیم میں انتشار پیدا کرسکتی ہے۔ ۱۹۵۳ء کے واقعات نیشنل کانفرنس کو ختم کرنے اور لوگوں کے لئے مسائل کھڑا کرتے کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ لوگوں کے اعتماد اور بھروسے سے ہم تنظیم کا احیاء بحال کرسکے۔

تحریک مہاراجہ کے شخصی نظام کے بعد کوئی اور خاندانی حکومت قائم کرنے کے لئے شروع نہیں کی گئی تھی۔ خاندانی حکومت قائم کرنے کا ہوا لوگوں کے ذہنوں کو پراگندہ کرنے اور اصل مسائل سے توجہ ہٹانے کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ بھلا جو شخص خاندانی راج کے خلاف ہو۔ جو خاندانی راج کے خلاف میدانِ کارزار میں اتر آیا ہو وہ خاندانی راج کا تصور کرسکتا ہے ___ ؟"

میرے نزدیک کسی کو جانشین مقرر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ جانشین مقرر کرنا راجوں اور مہاراجوں کا کام ہے۔

بیگ صاحب کی طرفداری میں آج مولوی فاروق بھی بولنے لگے ہیں۔

مولوی فاروق لوگوں کی رہنمائی کرنے کا دعویٰ کیسے کرسکتے ہیں جبکہ اُن کے خاندان کے پیشروں نے حقیر مفادات کے لئے پوری قوم کا سودا کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ مولوی یوسف شاہ نے مہاراجہ کے ساتھ ساز باز کر کے اپنے لئے وظیفہ حاصل کرلیا۔"

شیخ عبداللہ کی اس تقریر کے جواب میں اگلے روز مرزا افضل بیگ نے پلوامہ کے جلسہ میں فرمایا:

"..... اگلے ہفتے تمام سیاسی جماعتوں کی پولیٹکل کانفرنس منعقد ہوگی۔ میرے لب اب خاموش نہیں رہیں گے۔ شیخ صاحب کو اب بہت کچھ سننے کے لئے

تیار رہنا چاہیئے۔ میں لوگوں سے معافی مانگتا ہوں کہ کچھ وقت تک گنہگار رہا۔ اب خاندانی راج ختم کر کے ہی دم لوں گا۔ حالیہ میونسپل اور پنچائتی انتخابات کی دھاندلیوں سے شیخ عبداللہ کی امیج خراب ہو گئی ہے اور وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے ہیں۔ آپ نے سُنا ہو گا کہ انتخابی مہم کے دوران اُنھیں اسلام آباد کے جلسہ گاہ سے بھاگنا پڑا، ڈاکٹر فاروق اور بیگم عبداللہ کو پتھراؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اب تک خاموش تھا لیکن اب خاموش نہیں رہا جا سکتا، اب شیخ صاحب کو بہت کچھ سُننے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔"

جب میں حکومت میں تھا تو میں نے چُنگی ٹرانسپورٹ اور دوسرے مسئلے اُٹھائے۔ اس وقت ٹرانسپورٹ پر ٹیکس عائد کئے گئے تھے۔ ٹرانسپورٹروں کی مشکلات زیر غور تھیں۔ میوے کی ڈھلائی ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ ٹرک والوں سے کہا جا رہا تھا کہ وہ ۳۴۰ پیٹیاں میوے کی اُٹھائیں۔

جموّں میں ٹرانسپوٹروں کا وفد مجھ سے ملا تو یہ انکشاف کیا کہ:

ٹرانسپورٹ کے وزیر نے ہم سے اڑھائی لاکھ روپے بطور رشوت لئے ہیں میں نے یہ بات وزیر اعلیٰ کے نوٹس میں لائی اور یہ معاملہ ویجی لنس کے سُپرد کرنے کی تجویز رکھدی، اُنھوں نے یہ معاملہ گول کر دیا اور مجھے اس قسم' کی کارروائی کرنے سے منع کر دیا۔' وزیر اعلیٰ نے مجھے ڈھائی لاکھ روپے کی رشوت کا ویجی لنس کے سپرد کرنے سے کیوں روکا —؟ میں اس سے اور ایسے دوسرے سنگین معاملات سے پردہ اُٹھاؤں گا اور خاندانی راج کو ننگا کر کے رکھ دوں گا۔"


(ڈاکٹر کرن سنگھ)

مرزا افضل بیگ نے اسی جلسے میں "انقلابی نیشنل کانفرنس" بنانے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے وادی میں اپوزیشن کا متحدہ محاذ بنانے کی تگ ودو کی، وہ ایک طرف کانگریس سے ملے تو دوسری طرف عوامی ایکشن کمیٹی کے ساتھ رابطہ بڑھایا۔ وہ جموّں کی اپوزیشن پارٹیوں سے بھی ملے۔ انھوں نے مرکزی سرکار کی چوکھٹ پر جا کر شیخ وزارت کے خاتمے کی حتی الامکان کوشش کی، لیکن انھیں ناکامی

کا منہ دیکھنا پڑا۔

جموّں ایجی ٹیشن کے دوران ڈاکٹر کرن سنگھ نے وہاں "پیوپلز فرنٹ" کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالدی تو مرزا افضل بیگ نے پہلی فرصت میں ڈاکٹر کرن سنگھ کو اپنا تعاون پیش کیا۔

جموّں ایجی ٹیشن میں شدت پیدا کر کے جب شیخ وزارت کے خاتمے کا مطالبہ کیا جانے لگا تو وزیر اعلیٰ سخت پریشان ہو گئے اور وہ ڈسپلن شکنی کی پرواہ کئے بغیر جموّں میں ۳ مارچ کو مرزا افضل بیگ کے پاس گئے اور اُن کے ساتھ میٹنگ کی، وزارت سے برطرفی کے بعد یہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب کی پہلی خفیہ میٹنگ تھی۔ اسی روز دن کو اسمبلی سیکریٹریٹ کے بند کمرے میں ان کی ایک اور ملاقات ہوئی۔

بقول مرزا افضل بیگ شیخ صاحب نے مجھے واپس نیشنل کانفرنس میں آنے اور ماضی کی تلخیوں کو بھول جانے کے لئے کہا۔' میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ اس کے لیے مجھے اپنی پارٹی سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ شیخ صاحب نے مجھے بعد میں تنظیم میں واپس لانے کے لئے ڈاکٹر فاروق کو میرے پیچھے لگا دیا۔ ڈاکٹر فاروق نے میرے بیٹے محبوب بیگ کو شیشے میں اُتارا جنھوں نے مجھے واپس نیشنل کانفرنس میں آنے کے لئے جتن کئے۔ اب میرے ساتھ میرے داماد اور بیٹے کو بھی کیبنٹ میں لئے جانے کے وعدے دیئے گئے۔ لیکن جس تنظیم سے مجھے ذلیل کر کے نکال دیا گیا تھا اور نصف صدی کی دوستی کا جو مجھے صلہ دیا گیا تھا اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں سیاست کو ہی خیر باد کہہ دوں اور اس تنظیم کو دوبارہ قبول نہ کروں۔

مرزا افضل بیگ کو نیشنل کانفرنس میں اگرچہ ایک اہم ستون سمجھا جاتا تھا لیکن نیشنل کانفرنس کے صدر ان سے ہمیشہ سوتیلے بھائی کا سا سلوک کرتے تھے۔ پالیسی سازی اور لین دین کے معاملات میں انھیں ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا۔

نیشنل کانفرنس میں دوسرے بڑے لیڈر کے ہوتے ہوئے بھی شیخ خاندان اُن کو خاطر میں نہیں لاتے، ابتدا سے ہی اُن میں ان بن موجود تھی لیکن دونوں اس کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے — مرحوم شمیم احمد شمیم نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے:

"میں جانتا ہوں کہ بیگ صاحب کے متعلق شیخ صاحب کی جو رائے تھی۔ وہ اس سے بالکل مختلف تھی جس کا اظہار وہ عام طور پر کیا کرتے تھے۔ بیگ صاحب

بھی شیخ صاحب کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے وہ اس رائے سے کوئی میل نہیں کھاتی جس کا وہ دوسروں کے سامنے اظہار کیا کرتے تھے۔ شیخ صاحب کی شخصیت ان کی سیاست اور اُن کی نجی زندگی کے متعلق وہ رائے نہیں رکھتے کہ جس کا اظہار وہ عوامی جلسوں میں یا اخباری بیانات میں کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں بیگ صاحب کے متعلق شیخ عبداللہ کی اصل رائے کا اظہار کروں گا تو بیگ صاحب اپنی تمام مصلحت پسندی اور عافیت کوشی کے باوجود زہر کھائیں گے اور میں انھیں زہر کھانے پر مجبور نہ کروں گا۔ شیخ صاحب کے بعد ہمیں بہت[1] دنوں تک اُن کی ضرورت پڑے گی!"

شیخ خاندان میں مرزا افضل بیگ سے زیادہ بیگم عبداللہ چڑھتی تھی۔ ۱۹۵۷ء سے ان میں زبردست اندرونی اَن بَن تھی اور یہ اَن بَن اُس وقت شروع ہوئی جب پاکستان سے آئے سات لاکھ روپے میں سے مرزا افضل بیگ نے ایک لاکھ روپے لیا۔ بیگم عبداللہ نے بار بار یہ ایک لاکھ روپے واپس کرنے کا تقاضا کیا لیکن جب انھوں نے واپس نہیں کیا تب ۱۹۵۸ء کی شیخ عبداللہ کی رہائی پر اُن سے اس کی شکایت کی گئی۔

سات لاکھ روپے میں سے چھ لاکھ روپے رکھنے کے باوجود شیخ صاحب نے مرزا افضل بیگ سے کہا "میرے بچے پردیس میں در در کی خاک چھان رہے ہیں اور خود ہم قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ نے ہمارا یہ ایک لاکھ روپے کیسے اپنے پاس رکھا ہے۔؟

در اصل ۱۹۵۷ء میں ان دونوں خاندانوں کے درمیان رقابت کا عنصر داخل ہو چکا تھا۔ جو مصالحت کے پردے میں پڑا رہا۔ آخر کار وہ پردہ اُٹھ ہی گیا۔

۱؎ شمیم صاحب نے گویا طے کر لیا تھا کہ پہلے شیخ صاحب رحلت فرمائیں گے اور اُن کے بعد بیگ صاحب۔

ہر ایک شخص پریشاں ہے اُجڑے موسم سے
حسین رت کے مگر خواب دیکھتا بھی نہیں

ریاستی حکومت پر اپوزیشن کی یلغار
جموں و کشمیر اور لداخ میں حالات مخدوش

جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں شیخ عبداللہ قدم پھونک پھونک کر اُٹھا رہے تھے یہاں تک کہ ریاستوں کے اختیارات کے معاملے میں کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ اور بنگال کے وزیر اعلیٰ جیوتی باسو کے درمیان اختلافات نے دونوں لیڈروں کو نظریاتی طور پر ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔ بنگال کے وزیر اعلیٰ کا کہنا تھا کہ شیخ عبداللہ جب حال ہی میں کلکتہ آئے تھے تو انھوں نے اس سلسلے میں میرے ساتھ مشورہ کیا اور یہ تسلیم کر لیا کہ ریاستوں کو زیادہ اختیارات ملنے چاہئیں۔ اب شیخ صاحب ہی اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ شیخ صاحب نے اپنا موقف کیوں تبدیل کیا، تعجب کی بات ہے کہ شیخ صاحب ساری زندگی اٹانومی کے لئے لڑتے آئے ہیں لیکن آج وہ ریاستوں کے لئے زیادہ اختیارات مانگنے کی تجویز مسترد کر رہے ہیں۔

شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے ریاستوں کو زیادہ اختیارات دینے کی مخالفت ابھی تازہ تھی کہ ۷ر جولائی کو انھوں نے سرینگر میں پریس کانفرنس کے سامنے فرمایا:

"کشمیر کو قومی مسئلہ تسلیم کیا جانا چاہیئے اور کشمیر کو سیاست کا میدان بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ کشمیر کا مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہو جائے۔ اس وقت تک یہ کہنا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ایک خوش فہمی ہے۔ ہندوستان نے خود شملہ معاہدہ میں کشمیر کا مسئلہ دو طرفہ بنیاد پر حل کرنا تسلیم کر لیا ہے۔ جب خود ہندوستان ایک معاہدہ میں مسئلہ

کو طے کرنے میں آمادگی ظاہر کرتا ہے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ کشمیر ایک متنازعہ معاملہ ہے جس کا تعلق دونوں ملکوں سے ہے اور اس کا حل ہمیں تلاش کرنا ہے۔"

مرکزی وزیر داخلہ چودھری چرن سنگھ نے شیخ عبداللہ کی اس پریس کانفرنس کا سخت نوٹس لیا۔ آل انڈیا ریڈیو نے جب اسی رات خبروں میں وزیر داخلہ اور اگلے روز وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپائی کے تاثرات نشر کئے تو شیخ صاحب نے آنے والے جمعہ کے روز حضرت بل جاکر وہاں اجتماع کے سامنے فرمایا:

"..... پریس نے میری باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ میں نے مسئلہ کشمیر میں پاکستان کو فریق نہیں ٹھہرایا ہے۔ کشمیر کے جس حصے پر پاکستان نے قبضہ کر لیا ہے۔ وہ ہماری ریاست کا حصہ ہے۔ مہاراجہ کشمیر نے ۱۹۴۷ء میں جو الحاق بھارت سے کیا۔ اس کو ایک بڑی جماعت کی حمایت حاصل تھی۔ اس لئے قانونی طور پر کشمیر کے دوسرے حصے پر پاکستان کا کوئی دعویٰ نہیں، ہمارے پاس اس حصے کو ریاست کا حصہ ثابت کرنے کے بہت سے دلایل موجود ہیں۔ ہم نے بھارت کے ساتھ سوچ سمجھ کر الحاق کیا ہے نہ کہ جذبات میں آکر، کشمیر بھارت کا ناقابل تنسیخ حصہ ہے۔

میں آپ لوگوں کو ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کل سنیچروار کو جب بھارت کے وزیراعظم مرارجی ڈیسائی کشمیر تشریف لائیں گے تو اُن کا عوام کی طرف سے لامثال استقبال ہوگا۔ آپ جاکر ابھی سے اس کی تیاری کریں۔"

اگلے روز وزیر اعظم کا ہوائی اڈے سے سرینگر تک شاندار استقبال کیا گیا اور اس کے بعد اُن کا دریائی جلوس نکالا گیا۔ نیشنل کانفرنس نے حسب روایت وزیر اعظم کا شایانِ شان استقبال کیا۔

وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کی پریس کانفرنس میں بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کو چیلنج دینے اور پھر حضرت بل میں الحاق کو ناقابلِ تنسیخ قرار دینے سے لوگ مشتعل ہوئے۔ چنانچہ ۱۳ جولائی ۱۹۷۸ء کو مزار شہداء پر تقریر کے دوران شیخ صاحب کی ہوٹنگ کی گئی۔ جلسہ گاہ میں افراتفری پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مزار شہداء میدانِ جنگ میں بدل گیا۔

اس جنگ نے حسب روایت شیر بکرا فساد کا رُخ اختیار کرلیا۔ طرفین کے سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے۔

مزار شہداء پر فساد کا الزام بکروں پر لگایا گیا اور بکروں سے بدلہ لینے کے لئے جامع مسجد کو پتھراؤ کا شکار بنایا گیا، اس مسجد کی یادگار جالی دار کھڑکیاں توڑ ڈالی گئیں۔

شیخ عبداللہ نے اس فساد کی ذمہ داری داڑھی والوں پر عاید کرکے داڑھی کی تذلیل کی تو سنجیدہ لوگوں نے اس کا سخت بُرا مانا اور داڑھی والوں کے خلاف ریمارکس واپس لینے کا اُن سے مطالبہ کیا گیا۔

جنتا پارٹی کے ناراض لیڈروں نے ایک میٹنگ طلب کی، انھوں نے ایک نئی سیاسی پارٹی "پیوپلز کانفرنس" کے نام سے قائم کی۔

۷ ستمبر ۱۹۷۸ء کو اس سیاسی پارٹی کا باضابطہ اعلان کیا گیا۔

پارٹی کے صدر عبدالغنی لون مقرر ہوئے اور اس کے ممبران میں مولوی افتخار حسین انصاری شمیم احمد شمیم اور کئی دوسرے شامل ہوئے۔

"پیوپلز کانفرنس" کے قیام کے ساتھ عبدالغنی لون نے اس موقعہ پر کہا۔

"نئی پارٹی میں ایک ورکنگ گروپ قائم کیا جارہا ہے جو پارٹی کے چیرمین کا انتخاب کرے گا۔"

اُنھوں نے مزید کہا:

"جنتا پارٹی میں جب ہم نے شمولیت کی تو اُمید تھی کہ یہ پارٹی عوام کی جمہوری اُمنگوں کی ترجمانی کرے گی اور اس مقصد کے لئے کام کرے گی، لیکن ایسا نہ ہوا۔ چنانچہ ہمیں مقامی طور پر اپنی پارٹی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس نئی پارٹی کے قیام سے صحت مند سیاسی رجحانات پیدا ہونگے۔ اور جمہوری روایات کو تقویت ملے گی۔"

۲۰ اگست کو "پیوپلز کانفرنس" کا پہلا اجلاس ہوا تو اس میں نیشنل کانفرنس کے روٹھے اور جنتا پارٹی سے ناراض کوئی تین سو ورکر شامل ہوئے۔

"پیوپلز کانفرنس" کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی نیشنل کانفرنس انتشار کا شکار ہوگئی۔ لداخ کے بعد جموں میں حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کا آغاز ہوا۔

دسمبر ۱۹۷۸ء کے آغاز کے ساتھ ہی جموں میں جموں کے ساتھ نابرابری کے موضوع پر اپوزیشن کی طرف سے مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا، جنھوں نے فسادات کا رُخ اختیار کرلیا۔ یہ فسادات جموں سے نکل کر اودھم پور، پونچھ، راجوری، بشناہ، کٹھوعہ اور ریاسی میں بھی پھیل گئے۔ بھیم سنگھ نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ فسادات میں کئی سرکاری عمارتوں کے ساتھ کئی گاڑیاں نذرِ آتش کی گئیں۔ مظاہرین اور پولیس کے درمیان پتھراؤ اور لاٹھی چارج سے درجنوں کی تعداد میں جوان اور سپاہی زخمی ہوگئے۔ گوجر ہوسٹل نذرِ آتش ہونے کے ساتھ ہی جموں میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کیا گیا۔ جب اس طرح حالات قابو میں نہ آسکے تو پولیس کی طرف سے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ جب شورش ختم ہونے کے بجائے تیز ہونے لگی تو کرفیو کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔


(بھیم سنگھ)

وزیر اعلیٰ نے اپوزیشن پر الزام لگاتے ہوئے فرمایا:

"شکست خوردہ لیڈر حالات کا ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ ریاست میں صدر راج نافذ کرانے کا ہوّا کھڑا کر رہے ہیں۔"

شیخ وزارت کے خلاف لداخ کے بعد جموں صوبہ کے ایجی ٹیشن کا فائدہ اُٹھانے کے لئے مرزا افضل بیگ جو "انقلابی نیشنل کانفرنس" کی قیادت کر رہے تھے۔ دہلی روانہ ہوگئے اور مرکزی سرکار کے ساتھ شیخ وزارت ڈسمس کرنے اور ریاست میں صدر راج نافذ کرانے کی تگ ودو کرنے لگے۔ ان کی حمایت ڈاکٹر کرن سنگھ، مفتی محمد سعید اور دوسرے کئی مقامی لیڈر کر رہے تھے۔

اُدھر دہلی میں یہ کارروائی ہو رہی تھی اور اِدھر جموں میں آل پارٹی ایکشن کمیٹی کی طرف سے حکومت کے خلاف مظاہروں میں شدت پیدا ہوگئی، اس تحریک کے ساتھ اسٹوڈنٹ بھی شامل ہوگئے تو حکومت نے ایجی ٹیشن دبانے کے لئے سخت اقدامات کئے۔

سرینگر میں مولوی فاروق نے جموں کی آل پارٹیز ایکشن کمیٹی کی حمایت کا اعلان کیا، مولانا فاروق نے عبدالرشید کابلی کی سربراہی میں ایک وفد جموں روانہ کیا۔ جنھوں نے جموں میں آل پارٹیز ایکشن کمیٹی کو اپنا تعاون پیش کیا۔

۲۲ دسمبر کو وزیر اعلیٰ نے اپنے ایک پریس بیان میں کہا کہ وزارتی کونسل میں کسی قسم کا ردوبدل خارج از امکان ہے۔ حکومت اس بات کا وعدہ کر چکی ہے کہ وہ علاقائی تفاوت کو ختم کرے گی، اخبارات نے جس طرح معمولی واقعات کو اُچھالا اور مبالغہ آمیزی سے پیش کیا۔ اس سے لگتا ہے کہ سارا شہر اس کی لپیٹ میں آگیا ہے ـــــ اپوزیشن خوامخواہ خاندانی راج کا ورودھ کر رہی ہے۔ میرے لئے جانشین نامزد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ لیڈر خود بخود سیاسی سطح پر اُبھر آتے ہیں۔ مجھے اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ میرے بعد کون ہوگا۔ مجھے تو ان سیاسی مسائل کی فکر ہے جس کا ہمیں اس وقت سامنا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اس ایجی ٹیشن کا ذمہ دار ڈاکٹر کرن سنگھ کو ٹھہرایا، وزیر اعلیٰ نے جموں کی اس ایجی ٹیشن کے ساتھ وابستہ پارٹیوں کو سخت الفاظ میں دھمکی دی، اس کے جواب میں عوامی ایکشن کمیٹی کے لیڈر عبدالرشید کابلی نے کہا:


(عبدالرشید کابلی)

"شیخ عبداللہ کو اس قسم کا لب و لہجہ ترک کرنا چاہیئے۔ جو جمہوری آداب و روایت کے منافی ہو، وادی کشمیر اور جموں میں حزب اختلاف کو بار بار دھمکانا اور للکارنا کہ وہ طاقت کا جواب طاقت سے دیں گے ـــ ایک وزیر اعلیٰ کا لہجہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسا وطیرہ صرف ڈکٹیٹروں کو زیب دیتا ہے ـــ جموں کے لوگوں نے ابھی تک کہیں بھی ریاست کے ساتھ علیحدگی کی بات نہیں کہی ہے البتہ حکمران جماعت کے ذمہ دار افراد کی زبان سے کسی مصلحت کے پیش نظر علیحدگی کا ہوّا کھڑا کیا جا رہا ہے اور اس طرح علیحدگی کا ہوّا کھڑا کر کے اپوزیشن کو دبایا جا رہا ہے۔ حقیقت میں ریاست کی وحدت اور سالمیت کو حکمراں طبقہ نقصان پہنچا رہا ہے۔ جو کہ ریاست کے کسی بھی طبقہ اور فرقہ کے مفاد میں نہیں ہے۔ موجودہ سرکار بظاہر کشمیریوں کی غمخوار ہے مگر پچھلے چار سالہ اقتدار میں شیخ عبداللہ ہر محاذ پر ناکام ہو چکے ہیں۔ صرف کرپشن، دھاندلی، لوٹ کھسوٹ اور کنبہ پروری میں یہ سرکار کامیاب ہوئی ہے۔ ایک طرف خوراک

سبسڈی ختم کر کے ہزاروں گھرانوں کو نان و نفقہ کا محتاج بنا دیا۔ دوسری طرف اپنے عزیز و اقارب کی مالی حالت مستحکم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔"

جموّں کی ایجی ٹیشن کے بارے میں وزیر اعلیٰ نے پریس کانفرنس میں فرمایا:

"..... حالات کی نہج ایسی نہیں کہ مرکز ریاست کے معاملوں میں مداخلت کرے، ناانصافیوں کے معاملے میں کشمیر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ریاست جموّں وکشمیر کی وحدت اور سالمیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا تصوّر ہی اتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کہ اس کا فرقہ وارانہ فسادات کی طرف رُخ کرنا لازمی بن جائے گا اور اس طرح ایک قومی ٹریجڈی کا ظہور ہو گا۔

آل پارٹیز ایکشن کمیٹی ایک خود ساختہ اور بے مقصد تنظیم کا نام ہے جس میں چند سماج دشمن عناصر شکست خوردہ اور نامراد عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ اگر جموّں کے لوگ کسی نابرابری کا شکوہ کریں گے اور صاف لفظوں میں کہیں گے کہ وہ ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتے ہیں تو اس پر جمہوری اصولوں پر بات چیت کو ٹالا نہیں جا سکتا لیکن جموّں صرف کرن سنگھ کا نام نہیں جو ڈوگرہ شاہی سے محروم ہو کر بے دست و پا ہو گیا ہے۔ یہ پہلے شخص ہیں جو جموّں کو ہماچل پردیش کے ساتھ ملانے کے لئے پہلے پنڈت نہرو سے ملے۔ پھر اندرا گاندھی سے رجوع کیا۔ اب مرارجی ڈیسائی کی چوکھٹ پر سجدہ کر رہے ہیں۔

اگر حقایق کی تہہ تک جانے کی کوشش کی جائے تو صاف پتہ چلے گا کہ نابرابری اور ناانصافی کی شکایت صرف کشمیریوں کو ہو سکتی ہے۔ ہم نے جموّں اور لدّاخ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کشمیر کو پسِ پشت ڈال دیا اور قومی مفاد کو خطرے میں نہ ڈال کر چُپ ہیں۔"

وزیر اعلیٰ کی اس پریس کانفرنس کے بعد ۱۵ر فروری ۱۹۷۹ء کو آل پارٹیز ایکشن کمیٹی کے تحت چلائی جانے والی ایجی ٹیشن میں شدت پیدا کی گئی۔

دیوی داس ٹھاکر کی سرکاری رہائش گاہ کو پتھراؤ کا نشانہ بنایا گیا۔ شہر میں دنگا فساد اور مظاہرے جاری رہے۔ سول حکام کو تحفظ دینے کے لئے فوج کو تیار رہنے کا

حُکم دیا گیا۔

وزیر اعلیٰ نے فوری طور پر نابرابری کی شکایت کی تحقیقات کے لئے ممبران قانون سازیہ کی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا۔ کمیٹی میں تمام پارٹیوں کے ممبر شامل کئے گئے وزیر اعلیٰ خود کمیٹی کے سربراہ رہے۔

جموں میں سرکاری رہائش گاہ پر پریس نمائندوں کے سامنے اس کمیٹی کا اعلان کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے اخباری نمائندوں پر الزام لگایا کہ وہ اُن کی حکومت کو بدنام کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ پریس رپورٹر اپنی رپورٹنگ میں جانبداری سے کام لے رہے ہیں بعض نامہ نگاروں کو جموّں اور لدّاخ میں عدم توازن نظر آتا ہے لیکن کشمیریوں کے ساتھ کی گئی ناانصافیاں نظر نہیں آ رہی ہیں۔"

جموّں میں تشدّد آمیز واقعات پر مولانا فاروق نے وہاں تعلیمی اداروں میں پولیس داخل ہونے اور طلبا و طالبات کو زدوکوب کرنے پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ اُنھوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ تشدد اور طاقت کا بے جا استعمال نہ کرے۔

مرزا محمد افضل بیگ نے شیخ عبداللہ پر غیر ذمہ دارانہ بیانات دے کر ریاست کے اتحاد کو درہم برہم کرنے کا الزام لگایا، اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کے لئے شیخ عبداللہ ریاست کو تقسیم کرنے سے پس و پیش نہیں کریں گے۔ ریاست میں ضرور کچھ نابرابریاں ہوئی ہیں ان پر غور کرنے کے لئے سپریم کورٹ کے کسی جج پر مشتمل کمیشن کے ذریعے تحقیقات کی جانی چاہیئے نابرابریوں کی تحقیقات قانون سازیہ کے ممبران نہیں کر سکتے — شیخ صاحب کا یہ کہنا کہ اگر ہمیں جدا ہونا پڑے تو ہمیں دو بھائیوں کی طرح جدا ہونا چاہیئے۔ یہ ان کی اس سوچ کا مظہر ہے جو ریاست کو تقسیم کرنے کی غمازی کر رہا ہے۔

نابرابری کی تحقیقات کے لئے ممبران قانون سازیہ کی کمیٹی تشکیل دینے کے ساتھ ہی وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ نے دیوی داس ٹھاکر کو سرینگر روانہ کیا، یہاں اُنھوں نے بعض اپوزیشن لیڈروں کے ساتھ ملاقات کی، اُنھوں نے کئی وکیلوں اور ادیبوں کے ساتھ بات چیت کی اور اُنھیں اس بات کی تحریک دی کہ وہ اپنی مظلومیت کا پرچار کریں۔ نابرابری کا شکار ہونے کا رونا روئیں، سرکار اعداد و شمار فراہم کر کے تمھاری دلیل کو وزن دار بنانے کا موقع فراہم کرے گی۔

دیوی داس ٹھاکر کے واپس جموں جاتے ہی جماعت اسلامی، پیوپلز لیگ، پیوپلز کانفرنس اسٹوڈنٹس یوتھ لیگ کے علاوہ یہاں کے وکیلوں اور ادیبوں وشاعروں نے کشمیر کے ساتھ نابرابری اور امتیاز کی پالیسی کے خلاف احتجاج کا سلسلہ کیا۔ یہ احتجاج بھی شروع ہوناہی تھا کہ وزیر اعلیٰ نے جموں کی آل پارٹیز ایکشن کمیٹی کے تمام مطالبات مان کر ان کے آگے سر تسلیم خم کیا۔



(دیوی داس ٹھاکر)

۶ مارچ ۱۹۷۹ء کو جموں کی آل پارٹیز ایکشن کمیٹی کے کنوینر سورج پرکاش گپتا اور کمیٹی کے دیگر ممبران کے ساتھ بات چیت کے دوران کے تمام مطالبات منظور کرکے ان کے فوری تدارک کا اعلان کیا۔

وزیر اعلیٰ نے جموں کی نابرابری کی ایجی ٹیشن کے دوران وادی کشمیر میں اپنی تنظیم نیشنل کانفرنس کے ساتھ جماعت اسلامی، پیوپلز لیگ، پولیٹکل کانفرنس، جمعیت ہمدانیہ اسٹوڈنٹس یوتھ لیگ اور بار ایسوسی ایشن کے ساتھ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو بذریعہ دیوی داس ٹھاکر "نابرابری" کا سندیسہ بھیج کر جموں والوں کے خلاف پہلے اُکسایا پھر اُن کے سامنے سجدۂ سہو کیا۔ اس طرح کی کاروائی سے اُن کی پوزیشن مضحکہ خیز توہوگئی لیکن ساتھ ہی وادی کی سیاسی اور مذہبی تنظیموں کے ساتھ بار ایسوسی ایشن کو خجالت کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن کا کہنا تھا کہ وزیر اعلیٰ کو اگر جموں والوں کے مطالبات تسلیم کرنے ہی تھے اور اُن کی چوکھٹ پر سر تسلیم خم کرنا ہی تھا تو ایسا پہلے بھی کیا جاسکتا تھا۔ وادی کشمیر کو ان کے خلاف کیوں اُکسایا۔۔؟



(شیخ محمد عبداللہ)

جموں میں آل پارٹیز ایکشن کمیٹی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور اُن کے مطالبات ماننے سے وادی کشمیر کے وکلاء، اسٹوڈنٹ، قلمکار اور دوسری سیاسی وغیر سیاسی تنظیمیں شرمندگی کا اظہار کرنے لگیں تو اُن کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے شیخ صاحب نے ۱۶ مارچ کو سرینگر میں خانیار کے آستانۂ عالیہ کے رو برو عوام سے خطاب فرمایا:۔

".....راولپنڈی روڈ کھل جائے تو کشمیریوں کی مشکلات دور ہوسکتی ہیں جب نابرابریوں کا سوال اٹھایا جاتا ہے تو جموں اور لداخ ہی کا ذکر کیوں کیا جاتا ہے۔؟ کیا کشمیری عوام نابرابری کا شکار نہیں ہورہے ہیں (اور یہ نابرابری کا شکار کرنے والے بھی آپ ہی تو ہیں) راولپنڈی روڈ کھل جاتا تو یہاں کے لوگوں کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ یہ مشکلات تب تک رہیں گی جب تک مسئلہ کشمیر حل نہیں ہوجاتا۔ دونوں ممالک ہندوستان اور پاکستان تسلیم کرتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر موجود ہے۔ یہ دونوں ممالک کے سربراہوں کا کام ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آپس میں بات چیت کریں۔

جموں کے حالیہ ایجی ٹیشن شکست خوردہ عناصر نے شروع کئے۔ انتخابات میں شکست کھانے کے بعد یہ عناصر اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ یہ عناصر حکومت کو مرعوب کرنے یا اس کے خلاف بدظنی پیدا کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں تھے۔ حکومت نے بار بار ان سے کہا۔ ایجی ٹیشن سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا (لیکن ان کا مسئلہ حل جو ہوا؟) یہ لوگ جموں اور لداخ کے لئے اقتصادی نابرابری کا رونا رو رہے ہیں۔ پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا کشمیر ہندوستان کے نقشے میں موجود نہیں ہے؟ کیا کشمیریوں نے مصائب نہیں جھیلے ہیں۔ مسلمانوں کو مرکزی محکموں میں نہیں لیا جاتا (سکولرازم کے دعویدار کو ایسا نہیں کہنا چاہیئے) مسلمانوں کا ساتھ امتیاز برتا جارہا ہے۔ اصل میں نابرابری کے شکار کشمیری ہورہے ہیں اور واویلا وہ کررہے ہیں۔"

وزیر اعلیٰ کی خانیار میں اس تقریر کا نہ صرف جموں کی اپوزیشن نے بُرا مانا۔ بلکہ مرکزی سرکار کے ساتھ ملک بھر کی سیاسی تنظیموں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا اور کہا۔

"جو مسئلہ حل ہوچکا ہے اس کو حل طلب کہنا لوگوں کے ذہنوں میں اُلجھن پیدا کرنے کے مترادف ہے۔"

مرکزی ہوم منسٹری نے وزیر اعلیٰ کے نام احتجاجی مراسلہ بھیجا تو اُنھوں نے پریس کو مورد الزام ٹھہرایا کہ اس نے میرا بیان توڑ مروڑ کر پیش کیا۔

۳۰ مارچ کو مرکزی ہوم منسٹری سے شیخ صاحب کے نام نہ صرف خانیار میں اُن کی

تقریر کا ٹیپ اور اس کشمیری زبان کی تقریر کا لفظ بہ لفظ ترجمہ بلکہ جواب طلبی بھی آگئی۔ وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ نے یکم اپریل کو مرکزی سرکار کو معذرت نامہ بھیجدیا۔ اس معذرت نامے کی اطلاع جنتا پارٹی کے ممبر قانون سازیہ کے لیڈر عبدالرشید کابلی کو ملی تو اُنھوں نے شیخ صاحب پر طنز کیا کہ وہ ایک کمزور وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے مرکز کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ معذرت نامے اور معافی نامے پیش کرکے اُنھوں نے وزیر اعلیٰ کا عہدہ بے وقار بنادیا۔

شیخ محمد عبداللہ کے اس قسم کے طریقہ کار کے خلاف "پیوپلز کانفرنس" کے چیئرمین عبدالغنی لون نے ۴ مئی کو سوپور میں جلسہ بلایا تو اسے پتھراؤ کا نشانہ بنایا گیا۔

۶ مئی کو ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ بورڈ بارہمولہ میں نیشنل کانفرنس کی غنڈہ گردی پر اُنھوں نے احتجاج کیا تو اُن پر گڑبڑ پھیلانے کا الزام لگاکر اُنھیں گرفتار کیا گیا۔

اپنی رہائی کے موقع پر اُنھوں نے اسلام آباد میں ایک عوامی اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے کہا۔

"۔۔۔۔ شیخ محمد عبداللہ اپنی ناکامیوں کو چھپانے کے لئے صدر راج کا ہوّا کھڑا کر رہے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ کہ کشمیری نابرابری کا شکار ہیں تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ مرکزی سرکار کے محکموں میں اگر مسلمانوں کو نہیں لیا جاتا تو اس کا قصوروار کون ہے؟ علی گڈھ اور جمشید پور میں مسلمانوں کے قتلِ عام جیسے حالات سے جہاں ریاست کے لوگ بالعموم اور وادی کے لوگ بالخصوص اُن بے گناہ اور کمزور انسانوں کے قتل اور مال وجان کے نقصان سے متاثر ہو رہے ہیں۔ وہاں اپنے تحفظ کی کمی کا بُری طرح احساس کر رہے ہیں۔ وہ بھارت میں اقلیتوں کے ساتھ روا رکھے گئے رویے پر سوچ کر اس الحاق پر دوبارہ غور کر رہے ہیں ۔۔ جو مہاراجہ اور عبداللہ نے مُلک کے ساتھ جوڑا ہے۔ ان اصولوں کی بنیاد آج اُکھڑ رہی ہے۔ شیخ صاحب سے یہی اختلاف ہے کہ اُنھوں نے عوام سے ووٹ لے کر اُن کے بنیادی مسائل اور احساسات کو نظرانداز کرکے اپنے اقتدار پر رہنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔

مُلک میں ظہور پذیر ہوتے والے واقعات سے وہ بالکل غافل بن رہے ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں ۔۔۔!

وہ ریاست کی اندرونی خودمختاری بحال کرنے کا وعدہ کیا ہوا؟ شیخ صاحب نے مرکز کو خوش رکھنے کی پالیسی پر چل کر ان مسائل کو نظرانداز کرنا شروع کیا جن کو وہ کشمیر کے بنیادی مسائل ظاہر کرتے تھے۔ ریاست میں اندرونی خودمختاری بحال کرنا نیشنل کانفرنس کا منشور تھا لیکن اقتدار میں آنے کے بعد اٹانومی کا مسئلہ بالکل نظرانداز کیا گیا۔ اب تو کشمیری عوام کے بنیادی جمہوری حقوق بھی ان سے چھین لئے جا رہے ہیں۔ حکمران جماعت نے آمرانہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے اور وہ اپوزیشن کو کسی بھی جگہ بولنے نہیں دیتی ہے اور نہ ہی اسے اُبھرنے کا موقع دیتی ہے۔ سوپور میں میرے جلسے پر پتھراؤ کیا گیا۔ شوپیان میں مولوی فاروق پر یلغار کیا گیا۔ مرزا افضل بیگ کو عتاب کا شکار بنایا گیا۔ کانگریس کے کارکنوں پر جگہ جگہ حملہ کرایا گیا۔ جماعت اسلامی کے ساتھ ظالمانہ اور جابرانہ برتاؤ کیا گیا۔"

نیشنل کانفرنس کی عامرانہ اور جابرانہ طرزِ عمل کے خلاف 'پیوپلز کانفرنس' عوامی ایکشن کمیٹی اور جماعت اسلامی نے مل کر مقابلہ کرنے کا تہیہ کرلیا، لیکن نیشنل کانفرنس کو حکومت کے بل بوتے پر پولیس کی جو مدد حاصل تھی اس کی وجہ سے اپوزیشن کی کمر توڑ کر رکھ دی گئی۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ عقل وشعور سے عاری لوگ حقیقت جاننے اور اصلیت سمجھنے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ اس کی وجہ سے جھوٹ نے سچائی کو ہمیشہ کی طرح دبا کر رکھ دیا۔



(مولوی فاروق   سید علی گیلانی   عبدالغنی لون)





ذوالفقار علی بھٹّو کی پھانسی پر
سرینگر میں ہنگامے کا منظر

دُنیا پیار کی نازک رسّی تیز چھری سے کاٹ گئی
تحفہ اپنی خود غرضی کا انسانوں میں بانٹ گئی

ذوالفقار علی بھٹّو کی پھانسی کا کشمیر پر اثر

فوجی ٹولے کی مارکٹائی، جمیعۃ طلباء کا ایجی ٹیشن

وادی کشمیر کے مُسلم عوام پاکستان کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں اور قائد اعظم محمد علی جناح کے بعد سب سے زیادہ لگاؤ ذوالفقار علی بھٹّو سے رکھتے تھے۔

کشمیری عوام بھٹو صاحب کو مسئلہ کشمیر کے حل کی علامت سمجھ رہے تھے۔ وزیر خارجہ کی حیثیت میں سلامتی کونسل میں ان کی بحث اور پھر وزیر اعظم کے طور پر مسئلہ کشمیر پر اُن کی جوشیلی تقریریں کشمیری عوام کے لئے روحانی غذا سے کچھ کم نہ ہوا کرتی تھیں۔ بیشتر کشمیری مسلمانوں کو اس بات کی عقیدت تھی کہ ذوالفقار علی بھٹّو کشمیر کو پاکستان کے ساتھ ملانے کا ان کا خواب تعبیر میں بدل دیں گے۔



(محمد ضیاء الحق)

اس عقیدت نے کشمیریوں کے دلوں میں واقعی گھر کر لیا تھا۔ چنانچہ پاکستان میں ضیاء الحق کی سربراہی میں ایک فوجی بغاوت کے دوران بھٹو صاحب کو نہ صرف وزارت سے برطرف کیا گیا بلکہ انھیں پابندِ سلاسل بھی کیا گیا تو کشمیری عوام اس فوجی کاروائی پر دم بخود ہو گئے۔

ذوالفقار علی بھٹّو کی گرفتاری نے کشمیریوں کو فوجی حکمرانوں سے سخت بدظن کیا۔ اس کے بعد جب اُن پر قتل کا الزام لگا۔ تو اس کاروائی نے کشمیری عوام کو اور زیادہ مشتعل کیا، ذوالفقار علی بھٹّو کے قتل کے مقدمہ کے ساتھ اکثر کشمیری وابستہ ہو گئے اور وہ مقدمہ کی کاروائی پر اپنا سارا دھیان دینے لگے۔ چنانچہ جب عدالت نے

انھیں پھانسی کا حکم سُنایا تو عام کشمیری مسلمانوں کے لئے یہ ایک ایسی خبر تھی جس نے انھیں ششدر کر کے رکھ دیا۔ البتہ انھیں یہ اُمید بھی تھی کہ انھیں پھانسی نہیں دی جاسکتی۔ اس کے ساتھ ہی جب بیرونی دُنیا کے سربراہوں نے ان کی جان بخشی کی اپیلیں بھیجنی شروع کیں تو کشمیریوں کی اُمیدیں بندھنے لگیں۔

سرینگر میں میاں غلام سرور کی سربراہی میں بھٹو بچاؤ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس کے ممبران میں، ڈاکٹر فاروق عبداللہ، عبدالغنی لون، محمد شفیع شیدا، صوفی غلام محمد، مفتی محمد سعید، جی۔ ایم۔ باون اور دوسرے قابلِ ذکر ہیں۔

اسی دوران پھانسی کی سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل داخل ہوئی تو کشمیری مسلمانوں کی اُمید نے ایک کروٹ لی، البتہ جب سپریم کورٹ نے ان کی پھانسی کی سزا برقرار رکھی تو کشمیری عوام دم بخود رہ گئے۔

پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی سب سے بڑی حلیف پارٹی جماعتِ اسلامی سمجھی جاتی تھی اور ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف اس ساری کاروائی کے پیچھے جماعتِ اسلامی کے ہاتھ ہونے کا کشمیری عوام کو پختہ یقین ہوچکا تھا۔

پاکستان میں جماعتِ اسلامی کشمیریوں کے سامنے موردِ الزام بن رہی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں کشمیر کی جماعت اسلامی کے خیالات کیا تھے؟ اور وہ اندرونی طور پر کن نظریات کے حامل تھے؟ اس کو ایک طرف رکھ کر کہا جائے تو پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے ساتھ ان کا براہ راست کوئی واسطہ نہ تھا۔ چونکہ کئی مقامی اور غیر مقامی اخبارات ان ایام میں جماعت اسلامی کو کوسنا اپنا حق سمجھ رہے تھے۔ اس لئے ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کی صبح کو جب لوگوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی پر لٹکائے جانے کی خبر سُنی تو شہر، دیہات اور قصبہ جات میں لوگ باہر نکل آئے اور پاکستان کے فوجی حکمرانوں خصوصی طور پر صدر ضیاء الحق کے خلاف ایک طوفان سا کھڑا ہوا۔

جگہ جگہ مظاہرے ہوئے۔ فوجی حکمرانوں کے پتلے جلائے گئے۔ ساری وادی میں مکمل ہڑتال ہوئی، ٹرانسپورٹ جام ہوگیا۔

بھٹو بچاؤ کمیٹی کی طرف سے ایک گاڑی میں لوگوں کو پولوگراونڈ میں جمع ہونے کی منادی کرائی گئی۔ یہاں ایک جمِ غفیر نے مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ اس موقعہ

پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ایک تقریر بھی کر ڈالی۔ انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے تئیں خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے انھیں شہیدِ اعظم کے خطاب سے نوزا۔ فاروق عبداللہ نے فوجی حکمرانوں پر پاکستان تباہ کرنے کا بھی الزام لگایا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ اپنے تعلقات کا بھی ذکر کیا۔ جب وہ کشمیر لبریشن فرنٹ کے ساتھ وابستہ تھے اور اُن کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی ہدایات دیا کرتے تھے۔ پاکستان کے دورے کے دوران بھٹو صاحب سے ملاقات کا بھی انھوں نے ذکر کیا۔

مظاہرین تشدد پر اُتر آئے تو انھوں نے جماعت اسلامی کی طرف رُخ کر لیا۔

اسلام آباد میں جماعتِ اسلامی کا ضلعی دفتر جلانے کے ساتھ ہی اس جماعت کے خلاف ایسی کاروائی شروع ہوگئی جو غیر منظم ہوکر بھی خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی انتقامی کاروائی میں مقامی جماعت اسلامی لوٹ مار کا شکار ہوگئی۔ اس جماعت کی املاک نذرِ آتش کرنے کے ساتھ ساتھ جماعت کے ساتھ وابستہ لوگوں کی مارپیٹ کرنے کے دوران بوڑھوں، بچوں اور خواتین کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ جماعت اسلامی کے نامزد افراد کے مکانات چُن چُن کر جلائے گئے۔ اُن کا اثاثہ لوٹ لیا گیا اور ان کے میوہ باغات کاٹ کر رکھ دیئے گئے۔

آرونی اور تجر میں محمد اکبر لون اور عبدالرحیم کو بڑی بے دردی سے مارا گیا۔ طوفانِ بدتمیزی پاگل پن اور درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جماعت کی مساجد نذرِ آتش کی گئیں۔ قرآن کی بے حرمتی کی گئی۔ لائبریریوں کو جلا دیا گیا۔

مسلسل چار روز تک یہ آگ اور خون کا ننگا ناچ ضلع اسلام آباد میں ہوتا رہا۔ کروڑوں کی املاک کو آگ میں جھونک دیا گیا اور حکومت ـــ گویا وہ خوابِ خرگوش میں پڑی تھی اور جب اخبارات کے ذریعے اس طوفانِ بدتمیزی، اس غنڈہ گردی اور ننگی جارحیت کی خبریں آنے لگیں تو حکومت نیند سے بیدار ہوکر اس قسم کی کاروائی کے خلاف آواز اُٹھانے لگی۔

چار روز تک بلوائیوں کو سب کچھ آسانی سے کرنے کی کُھلی چھوٹ دینے کے بعد اُن کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ ان ایام میں جماعت اسلامی پر جو قہر نازل ہوا تھا۔ جب اس کی تفصیلات آنے لگیں تو کل ہند جماعت اسلامی کے زبردست احتجاج پر مرکزی سرکار کی طرف سے مرکزی وزیر داخلہ کو کشمیر کے دورے پر بھیج دیا گیا۔

مرکزی وزیر داخلہ، وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ کے ہمراہ جب متاثرہ علاقوں کا دورہ کر

رہے تھے۔ تو وزیر داخلہ کے یہ پوچھنے پر کہ اتنا سارا مالی اور جانی نقصان ہونے کے دوران آپ کی ایڈمنسٹریشن کہاں تھی ۔۔۔؟ شیخ صاحب سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ جلے ہوئے لاتعداد مکان، کوٹھار، مساجد، کٹے ہوئے باغوں کے باغ اور لوٹا گیا اثاثہ اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ چار روز تک بلوائیوں کا ہاتھ روکنے کے لئے حکومت ناپید تھی۔

اُجڑی ہوئی بستیوں کو دیکھ کر وزیر اعلیٰ کو خود بھی یقین نہیں آیا۔ یہ سب کچھ کیا کشمیر وادی میں ہوا ہے۔؟

مرکزی وزیر داخلہ کے بعد کل ہند جماعتِ اسلامی کا ایک وفد یہاں آیا اور اُس نے تمام متاثرہ علاقوں کا دورہ کر کے نقصان کا اندازہ لگایا۔ جو کروڑوں تک جا پہنچا تھا۔

اِس طوفانِ بدتمیزی، اس ننگی جارحیت اور غنڈہ گردی کے دوران بلوائیوں کے ہاتھوں داڑھی رکھنے والے مسلمانوں کی درگت اور پیشانی پر نماز کے نشانات نظر آنے کے جرم میں زد و کوب کی شرمناک کاروائی واقعی دل ہلا رہی تھی۔

شہر سرینگر کے ساتھ بارہمولہ، سوپور، ہندوارہ، بانڈی پورہ، سویہ بگ وغیرہ میں بھی مظاہرے ہوئے، پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے ساتھ جماعتِ اسلامی کے خلاف احتجاج کیا گیا البتہ یہاں مالی اور جانی نقصان سے اجتناب کیا گیا۔

ضلع اسلام آباد میں کروڑوں کی املاک جلانے، کاٹنے اور لوٹنے پر حکومت نے صرف افسوس کا اظہار کیا۔ حالانکہ لاء اینڈ آرڈر کی مشنری سے ذرا بھی باز پُرس نہیں کی گئی۔ جو اس قسم کی کاروائی کو روکنے میں ناکام رہی ڈپٹی کمشنر سے بھی کسی قسم کی باز پُرس نہیں کی گئی۔ اس طرح ریاستی حکومت نے یقیناً جانبداری کا ثبوت فراہم کیا۔

۴ را پریل کے اس سانحۂ عظیم کے موقعہ پر جماعت اسلامی کی طرف سے سیاہ اپریل کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا گیا۔ اس میں تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے سامنے جو بات رکھی گئی تھی وہ اس اقتباس سے واضح ہے:

"..... تحریک اسلامی دوسری تمام تحریکوں کی طرح قدرتی طور پر اپنے سامنے چند مرحلے رکھتی ہے۔ یہ ایسی کوئی چیز نہیں کہ ایک دفعہ ہی بنی بنائی آسمان سے اُتری اور اپنے آپ زمین پر چھا گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عالم اسباب میں ہر کام اور واقعے کے لئے ایک اٹل قانونِ قدرت مقرر کیا ہے جس کے مطابق

درخت کے پودے سے لے کر انسان کے بچے تک کا نشوونما ہوتا ہے۔ اِس طرح انسانی سماج میں اجتماعی تحریکات بھی اپنے ارتقاء کے چند مدارج رکھتی ہیں۔ ہر دور اور مقام کی حدود میں ایک تحریک چند مرحلوں سے گزرتی ہے۔ تب ہی منزلِ مقصود پر پہنچ پاتی ہے۔ یہ مرحلے اس لئے ناگزیر ہیں کہ ان کے بغیر تحریک کے کارکنوں کی وہ ضروری آزمائش نہیں ہو سکتی جس کے بعد ہی کسی تحریک سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے زمانے اور سرزمین کے نظامِ زندگی کو پورے طور پر چلانے کی ہمت رکھتی ہے۔ ان مرحلوں اور آزمائشوں سے قدرت کے دو اہم مقاصد ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو تحریک کی اندرونی طاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کی خامیاں دور ہو جاتی ہیں اور دوسری جانب تحریک کے دوستوں اور دشمنوں کی پوری جانچ ہو جاتی ہے تاکہ وقت پر نظام کا اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد تحریک سماج کے مختلف عناصر کے ساتھ ان کی صحیح حیثیتوں کے مطابق معاملہ کرے۔"


(ذوالفقار علی بھٹو)

ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت پر عمل آوری کو کشمیری مسلمانوں کی اکثریت نے اُن کی شہادت سے تعبیر کیا۔ چنانچہ انھیں شہید ذوالفقار علی بھٹو کہا جانے لگا۔

سرینگر میں بھٹو بچاؤ کے نام سے جو کمیٹی کام کر رہی تھی وہ "بھٹو میموریل کمیٹی" میں بدل دی گئی البتہ میاں غلام سرور کو چھوڑ کر باقی سبھی ارکان رفتہ رفتہ کنارہ کش ہو گئے۔

دراصل یہ سب جس غرض و غایت کے لئے بھٹو بچاؤ کمیٹی میں شامل ہو گئے۔ جب بھٹو ہی نہ رہے تو اب وہ مقصد پورا ہونا ناممکن تھا۔

جماعتِ اسلامی کو تحفظ دینے میں حکومت قطعاً ناکام رہی۔ حکومت کی مجرمانہ غفلت میں مصلحت کا شائبہ دکھائی دے رہا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی عقیدت میں بعض لوگ اندھے ہو کر ایسی بے ہودگی پر اتر آئے جن کا ذکر کرنے سے زبان ہکلاتی ہے۔ قلم رُکتا ہے اور اظہار بہ جبر کرنا پڑتا ہے۔ بھٹو صاحب کے قتل کے ساتھ انھوں نے اپنے آپ کو کچھ ایسا وابستہ کر دیا گویا پاکستان میں بھٹو کو نہیں بلکہ اسلام کو

پھانسی دی گئی تھی۔ اپنی ناز یبا حرکات کا مظاہرہ کرنے کے دوران اُنھوں نے نہ صرف پاکستان کی مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور فوجی ٹولہ کی تضحیک کی بلکہ دین و مذہب کو بھی کوسنے سے یہ باز نہ آئے۔

یہ ساری صورت حال کئی دنوں تک جاری رہی اور کئی قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں۔

یو۔این۔او کے دفتر واقع سونوار پر حملہ کیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے والے تارا مسیح کے بارے میں پتہ چلنے کے بعد کہ یہ عیسائی ہے۔ تو سرینگر کے دو گرجا گھروں کو نذر آتش کرکے ہی دم لیا گیا۔

حالات آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگے تو ستم رسیدہ اور نقصان زدہ لوگ نئے سرے سے زندگی کی دوڑ دھوپ میں لگ گئے۔ وقت نے ان کے زخموں پر مرہم رکھ دیا اور جو لوگ جذبات سے مغلوب ہوکر پاکستان کے فوجی حکمرانوں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ رفتہ رفتہ ان کے بارے میں اپنے خیالات اور نظریات بدلنے لگے۔

سیاہ اپریل کا یہ تاثر نہ جانے کب تک وادی کے جذباتی مسلمانوں کے ذہنوں پر حاوی رہتا کہ ۲۶ جولائی کی شام کو انڈین آرمی کی ایک جماعت نے لال چوک میں اچانک پبلک پر حملہ کیا انھوں نے ہاکی اسٹکوں سے جو بھی ملا اس پر وار کیا۔ اُنھوں نے راہ چلتی گاڑیوں کے ساتھ ٹیکسی اسٹینڈ پر حملہ کرکے بہت سی کاروں کو جلا دیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے تھانہ کوٹھی باغ پر حملہ کرکے سپاہیوں کے ساتھ ایس۔ ایچ۔او تھانہ کوٹھی باغ کو بھی زخمی کر دیا۔ اس سارے حملے کی وجہ یہ تھی کہ دن کو ایک فوجی گاڑی سے ایک سائیکل سوار زخمی ہوا تھا۔ ٹریفک پولیس نے اس فوجی ڈرائیور کو پکڑ لیا۔ اس کے بدلے میں فوجی جوانوں نے جو کاروائی کی اس نے عوام کے ساتھ حکومت کو ششدر کر دیا۔ لال چوک کے علاقے میں فوجی کاروائی کے خلاف ۲۷ جولائی کو نہ صرف ہڑتال رہی بلکہ شیخ وزارت کے ساتھ حکومت ہند کے خلاف بھی زبردست مظاہرے ہوئے۔ "بھارتی فوج واپس جاؤ" کے نعروں کے ساتھ پولیس اور پبلک کے درمیان دو بدو لڑائی ہوئی۔ جب یہ لڑائی آس پاس کے علاقوں میں پھیل گئی۔ تو شیخ صاحب نے لال چوک میں آکر لوگوں سے پر امن رہنے کی اپیل کی، انھوں نے فوری طور پہ اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے کمیشن بٹھانے اور نقصان کا معاوضہ ادا کرنے کی یقین دہانی کرائی۔

البتہ اس کاروائی کا تناؤ کئی دنوں تک جاری رہا۔ اگلے روز جب اُنھوں نے کمیشن کے

تقرر کا اعلان کیا تو ہوم منسٹری کی طرف سے اُن کی جواب طلبی کی گئی کہ انھوں نے فوج کے خلاف کمیشن بٹھانے کا حکم کیسے دیا۔؟ کیا آپ اس کے نتائج نہیں جانتے ؟!

شیخ صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنی غلطی کا پرائسچت کرنے کے لئے اس بات کا یقین دلایا کہ کمیشن کی رپورٹ کو کسی بھی صورت میں واضح نہیں کیا جائے گا۔ چونکہ کمیشن کو نامزد کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو قائم کرنے کے ساتھ ہی توڑ نامناسب نہیں رہے گا۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۷۹ئہ کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ بلامقابلہ پارلیمنٹ کے ممبر بنائے گئے۔

اگست ۱۹۸۰ئہ میں ریاستی جمعیت طلباء نے "اسلامی انقلاب اور کشمیر" کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمنار کا انعقاد کیا، اس سیمنار میں شرکت کے لئے امریکہ، برطانیہ، فرانس، سویت روس، سعودی عرب، پاکستان، سری لنکا، نیپال، فجی، چین، ایران، عراق، اُردن، شیام، مصر، تیونس، الجزائر اور متحدہ عرب امارات سے نمائندے شرکت کے لئے آرہے تھے۔

چونکہ اس سیمنار کا موضوع کچھ ایسا تھا جس پر مرکزی سرکار کو نظرِ غائر سے دیکھنا پڑا۔ لہٰذا انھوں نے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ سے رابطہ قائم کرکے کشمیر جیسی حساس ریاست میں اس قسم کے سیمنار کے بارے میں دریافت کیا۔ شیخ صاحب نے ایسے موقع پر جب تمام تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں مرکزی سرکار کو یقین دلایا کہ ہم ریاست کے کسی بھی حصّے پر اس قسم کا سیمنار کی اجازت نہیں دے سکتے جس میں اسلام، انقلاب اور کشمیر جیسا موضوع شامل ہو۔

مرکزی سرکار کو یقین دہانی کرانے کے ساتھ ہی ریاستی سرکار نے جمعیتِ طلباء کے دفتر پر چھاپہ مارا۔ ان کا سارا ریکارڈ ضبط کرنے کے ساتھ ہی کئی سرکردہ طلباء کو حراست میں لے لیا۔ سرکار نے جمعیتِ طلباء کو کسی قسم کا جلسہ کرنے سے متنبہ کیا، حکومت کے اس فیصلے کے باوجود جمعیت طلباء نے ایسے موقع پر جبکہ ساری تیاریاں مکمّل ہوچکی ہیں اور بیرونی ممالک کے مہمان سرینگر کے لئے روانہ ہوچکے ہیں۔ سیمنار منسوخ کرنے سے انکار کیا اور خود، وہ روپوش ہو گئے۔

چنانچہ جس روز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی اس روز سرکار نے سرینگر کے تمام روٹوں پر ناکہ بندی کرکے بسوں میں تلاشی کے دوران جمعیت کے ساتھ وابستہ طلباء اور دوسرے بے شمار جوانوں کو راستے میں ہی گرفتار کر لیا۔

کانفرنس کو تتر بتّر کرنے اور جمعیت طلباء کو گرفتار کرانے اور باہر کے مہمانوں کو اس

سیمنار میں شرکت کرنے سے روکنے کے خلاف عوامی غم وغصہ اپنے جوش میں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فساد بھڑک اُٹھا۔ پولیس اور پبلک کے درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ بے شمار جوانوں کے ساتھ پولیس کے کئی اہلکار زخمی ہوئے۔



(عبدالرشید کابلی)

پولیس اور پبلک کے درمیان دوبدو لڑائی کے دوران عبدالرشید کابلی ایم۔ایل۔اے سامنے آئے اور وہ فسادات روکنے کے لئے پولیس اور جوانوں کو الگ کرنے لگے۔ اسی دوران ان پر فائر کیا گیا۔ ۱۷ اگست کو عبدالرشید کابلی گولی کا شکار ہوکر ہسپتال میں بھرتی کرائے گئے۔

کابلی صاحب کے کندھے پر گولی لگی تو اس کے علاج ومعالجہ میں ڈاکٹروں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، کابلی صاحب کا آپریشن کرکے اُنھیں بچا لیا گیا۔

۱۸ اگست کو میں کابلی صاحب کی عیادت کو ہسپتال گیا تو اتفاق سے اس وقت وہ سپاہی موجود تھا جس نے ان پر گولی چلائی تھی۔ یہ سپاہی سول وردی میں کابلی صاحب سے اپنی خطا کی معافی مانگنے آیا تھا۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ مجھے ہدایت مل گئی تھی کہ میں آپ کو گولی کا شکار بنا کر ہمیشہ کے لئے سلادوں مگر میں نے نشانہ ہٹا کر آپ کی زندگی بچائی۔

یاد رہے کہ عبدالرشید کابلی نہ صرف اپوزیشن لیڈر بلکہ ایوانِ اسمبلی میں اپوزیشن کے پارٹی لیڈر بھی تھے۔ وہ شیخ صاحب اور ان کی وزارت کا کچا چٹھا نکال رہے تھے۔ لہٰذا اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے جمعیت طلباء کا فساد ان کے لئے موقعہ غنیمت جان کر استعمال میں لایا گیا۔ جو سپاہی نے ناکام بنادیا۔

تحریکِ حریت کے دوران بالکل یہی طریقہ پنڈت پریم ناتھ بزاز کے ساتھ بھی اپنایا گیا۔ مگر اتفاق سے وہ بھی گولی لگنے کے باوجود جان سے بچ گئے۔

جمعیت طلباء نے حکومت کی اس کاروائی کے بارے میں اپنے ایک بیان میں کہا؛

"جو مقصد ہم کانفرنس کے انعقاد سے حاصل نہیں کر پاتے وہ مقصد ہم نے کانفرنس نہ کرنے سے حاصل کرلیا۔"

۲۲ اگست کو گاندربل میں عرس قمر صاحب کے موقعہ پر شیخ عبداللہ نے ایک عوامی اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے کہا۔

"جماعت اِسلامی جمعیت طلباء کی طرف سے مجوزہ اسلامی کانفرنس بلانے کا ارادہ ترک کرنے پر اُنھیں آمادہ کرنے کی کوشش کی، ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے نوجوان مصائب کے شکار ہوں اور ان کے خلاف کوئی کاروائی کی جائے لیکن وہ اپنے فیصلے پر بضد رہے اور ہمارے پاس کاروائی کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ ان کو پاکستان سے سرمایہ ملتا ہے جس کے بل بوتے پر یہ نت نئے فتنے جگاتے ہیں۔ ہم اپنی قوت ترقیاتی کاموں پر صرف کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ نوجوان آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کرتے ہیں۔"

۳ ستمبر کو پیوپلز کانفرنس کے چیرمین عبدالغنی لون نے پریس کانفرنس میں فرمایا:

" نیشنل کانفرنس اقتدار کو طول دینے کے لئے معمولی اقدامات کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہی ہے۔ شیخ عبداللہ اب عوام سے بالکل کٹ گئے ہیں۔ ان کی سیاست کی اساس مرکزی سرکار کی خوشنودی حاصل کرتے پر ہے۔ اگر شیخ صاحب خود کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی اور جمعیت طلباء کا لوگوں پر خاص کوئی اثر نہیں ہے تو سیاسی سطح پر ان کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ انھیں عتاب کا شکار بنانا کیا معنی رکھتا ہے۔ جمعیت طلباء کی طرف سے منعقد ہونے والی اِسلامی کانفرنس کے انعقاد پر پابندی لگانا غیر دانشمندانہ اقدام تھا۔ اگر یہ کانفرنس منعقد ہوتی تو کونسا آسمان زمین پر آجاتا، شیخ صاحب کو واضح طور پر کہنا چاہیئے کہ کس کس جماعت کو کن کن ذرایٔع سے پاکستان سے سرمایہ ملتا ہے؟ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ محاذ رائے شماری کے نام پر نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ نے پاکستان سے کروڑوں روپے حاصل کرلئے ہیں۔ بالفرضِ محال اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہاں کچھ جماعتوں کو دوسرے ممالک سے سرمایہ مل رہا ہے تو یہ بات بجائے خود اس گورنمنٹ کی نااہلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ۱۶ اگست سے چند روز تک سرینگر میں جو تشددانہ واقعات رونما ہوئے۔ اعلی سطح پر ان کی جوڈیشیل تحقیقات ہونی چاہیئے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ پولیس کی گولیوں سے جو جوان مر گئے اُن کا قصور کیا تھا۔؟ اور

۲۶ر اور ۲۷ر جولائی کے واقعات پر تحقیقات کے لئے کمیشن بٹھایا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ۱۶ر ۱۷ر اگست کے واقعات کی تحقیقات کے لئے کمیشن نہ بٹھایا جا سکے۔

جموّں وکشمیر میں اپوزیشن کمزور ہے جس کی وجہ سے حکومت کی طرف سے نافذ کئے جا رہے کالے قوانین کی مزاحمت نہیں کیجاتی، خون ریزی کی بازپرس نہیں کی جاتی، آج کا دور ریاست کا سیاہ ترین دور ہے۔"

ادھر ریاست جموّں وکشمیر واقعی فتنہ وفسادات کے دور سے گزر رہی تھی اور اُدھر مرکز میں جنتا پارٹی پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔ جنتا پارٹی دو ٹکڑے ہونے کے ساتھ ہی مرارجی ڈیسائی وزارتِ عظمیٰ کے عہدے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کانگریس نے چرن سنگھ کا وقتی ساتھ دے کر انھیں کرسی پر تو بٹھادیا لیکن اس نے کرسی کی ٹانگیں کاٹنی شروع کیں۔ نتیجہ کے طور پر وزیر اعظم چودھری چرن سنگھ دھڑام سے گر گئے۔ صدرِ مملکت مسٹر سنجیوا ریڈی نے ملک میں صدر راج نافذ کردیا۔



(مرار جی ڈیسائی)



(چرن سنگھ)

الیکشن میں بھارتی عوام نے جنتا پارٹی کو پھوٹ کا خوب مزہ چکھادیا۔ مسز اندرا گاندھی اپنی حکمتِ عملی سے دوبارہ برسرِ اقتدار آگئیں۔ مرکز میں کانگریس کے برسرِ اقتدار آنے کے ساتھ ہی ریاست جموّں وکشمیر میں شیخ وزارت سے چھیڑ چھاڑ پھر شروع ہوگئی۔ کانگریس کے یوتھ لیڈر سنجے گاندھی نے کھلم کھلا شیخ وزارت کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا — اسی دوران سنجے گاندھی ایک ہوائی حادثہ میں موت کے شکار ہوگئے۔



(سنجے گاندھی)

غلام نبی آزاد کے یوتھ کانگریس آئی کے صدر بننے سے کشمیر کانگریس نے خوشی ومسرّت کا اظہار کیا اور اس بات کا تہیہ کرلیا کہ پردیش کانگریس شیخ وزارت کو ہٹا کر ہی دم لے گی۔ غلام نبی آزاد کے اس اہم عہدے پر فائز ہو جانے سے پردیش کانگریس آئی کو

نیا جنم مل گیا اور وہ اپنی سرگرمیاں تیز تر کرنے لگی۔

۱۳ر نومبر ۱۹۸۰ء کو شیخ عبداللہ نے نامور تبصرہ نگار کلدیپ نیّر سے کہا:

"سنجے گاندھی نے میری حکومت کا تختہ الٹنے کا پلان بنایا تھا — وزیر اعلیٰ کا عہدہ قومی جھنڈے کے مانند نہیں کہ جب چاہا اُتار دیا۔"

شیخ صاحب کی اس شکایت پر کلدیپ نیّر نے اپنے تبصرے میں کہا۔

"شیخ محمد عبداللہ ریاست کے ڈکٹیٹر ہیں اور مسز اندرا گاندھی مُلک کی ڈکٹیٹر —!

شیخ صاحب مسز اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی سے جو شکایت کر رہے ہیں وہی شکایت ان سے بھی کی جاسکتی ہے، اُنھوں نے شمیم احمد شمیم، مرزا افضل بیگ، ملک محی الدین اور عبدالرشید کابلی کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟"

کانگریس نے شیخ وزارت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کی تو وزیر اعلیٰ نے اپنی کابینہ کے تمام وزیروں سے استعفیٰ طلب کیا۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ نے کہا۔

"بعض وزراء نکمے ثابت ہوئے ہیں اور کئی وزیروں کے کام کاج کا طریقہ درست نہیں تھا۔ اگلے چند روز میں نئی وزارتی کونسل تشکیل دی جا رہی ہے۔ وزارت کا سائز کم کر کے نئے چہرے سامنے لائے جائیں گے۔ ہماری ریاست اتنے سارے وزیروں کا بوجھ برداشت نہیں کر رہی ہے۔"

۱۴ر اپریل کو اُنھوں نے جو نئی کابینہ بنائی اس میں کوئی نیا چہرہ نہیں تھا۔ بلکہ پرانی ۲۱ر منسٹروں پر مشتمل کابینہ میں کمی کرنے کے بجائے ایک کا اضافہ کیا۔ غلام محمد شاہ کو کابینہ میں لے کر اُنھیں مرحوم صونم نربو کے محکمے الاٹ کئے گئے۔

شیخ عبداللہ نے مالی بوجھ اور نکمے پن کی وجوہات کی بنا پر وزارتی کونسل مختصر کرنے کا جو دعویٰ کیا تھا۔ وہ ان کے تمام دعوؤں کی طرح ٹائیں ٹائیں فش ہوگیا۔

اس موقع پر ریاست کی اپوزیشن نے متفقہ طور پر ایک آواز میں کہا:

"ریاست کی نئی کابینہ کا حجم بہت زیادہ ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ وزیر اعلیٰ نے غیر مبہم الفاظ میں کہا تھا کہ اُن کے منسٹروں کی کارکردگی تسلّی بخش نہیں ہے لیکن شیخ صاحب نے نہ صرف ان تمام منسٹروں کو بدستور رہنے دیا بلکہ اُن میں سے مشکوک وزراء کو ترقی بھی دے دی — جموّں وکشمیر جیسی چھوٹی ریاست

کے لئے اُن کی منسٹری کا سائز بہت بڑا ہے۔ چند ہی روز میں وزیراعلیٰ کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور اُنھوں نے وزارتی کونسل میں کمی کے بجائے اور ایک کا اضافہ کیا۔

شیخ عبداللہ اتنے ناقابلِ اعتبار ہیں کہ وہ اس چیز کو سفید کہہ سکتے ہیں جس کو اُنھوں نے صرف چند گھنٹے پہلے سیاہ کہا ہو، یہ ایک بدقسمت ریاست ہے جس پر ایک ایسا شخص حکمرانی کر رہا ہے جس کی کوئی سوچ اور اپروچ نہیں اور جس کو اپنے ہی کہے کا کوئی پاس نہیں۔"

شیخ عبداللہ کو اس قدر خفت کیوں اُٹھانی پڑی۔ اس سے اپوزیشن بالکل بے خبر تھی۔ دراصل مرکز میں کانگریس کے دوبارہ برسرِاقتدار آتے ہی شیخ عبداللہ پریشان ہوگئے تھے اور اُنھیں اس بات کا خدشہ لاحق ہوا کہ ان کی حکومت جارہی ہے۔ اپنی حکومت کو پائیدار بنانے کے لئے اُنھوں نے اپنی کابینہ میں کانگریس کے چار وزراء لینے کی مسز اندرا گاندھی سے رجوع کیا، لیکن اُنھوں نے ففٹی ففٹی کرنے کو کہا۔ چنانچہ اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنی ساری کابینہ سے استعفیٰ طلب کیا۔ اپنی تمام کابینہ سے استعفے حاصل کرکے اُنھوں نے وزیراعظم سے اُن کانگریسی ممبران کی لسٹ طلب کی جنھیں کابینہ میں لیا جاسکتا لیکن وزیراعظم نے اُن کا یہ پلان یہ کہہ کر نامنظور کیا کہ پہلے دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں اپنا وعدہ پورا کرو۔ اس کے بعد کانگریس کے ممبران کو کیبنٹ میں لیا جاسکتا ہے۔"

وزیراعظم مسز اندرا گاندھی دراصل اپنے کانگریسی ممبران کو دفعہ ۳۷۰ ہٹائے جانے کے معاملے سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی تاکہ کانگریسی اس الزام سے بری رہ سکیں۔

شیخ عبداللہ کے لئے ایک مشکل صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ اُنھوں نے لاچار ہوکر اپنی پُرانی کابینہ کو دوبارہ حلف دلایا اور اپنی خفت مٹانے کے لئے اُنھوں نے مقدس مقاماتِ پر جانے کا پروگرام بنایا۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج اے سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

شیخ محمدؐ عبدُاللہ کی اہلِ خانہ کے ہمراہ زیارت کیلئے روانگی اور واپسی

اپریل کے آخری ہفتے میں شیخ عبداللہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ خانہ کعبہ میں عمرہ کرنے اور سعودی عرب اور عراق کی اہم اور مُتبرک زیارت گاہوں پر حاضری دینے کے لئے روانہ ہوگئے۔ اُن کے ہمراہ بیگم عبداللہ کے علاوہ فاروق عبداللہ، غلام محمد شاہ، علی محمد متّو، خالدہ شاہ اور ثریّا متّو تھیں۔

کوئی دو ہفتے تک متبرک زیارت گاہوں پر حاضری دے کر فیضیاب ہونے کے بعد یہ لوگ واپس سرینگر آگئے۔

۱۶ مئی ۱۹۸۰ء کو آثار شریف حضرت بل میں نماز جمعہ کے موقعہ پر عوامی اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے شیخ صاحب نے فرمایا؛



(شیخ محمد عبداللہ)

"افسوس! لوگ مادی دُنیا کی چکا چوند میں کھو گئے ہیں۔ میں نے سعودی عرب اور عراق کا دورہ کرکے روحانی سکون پایا۔ میری یہ دِلی خواہش تھی کہ میں عراق اور سعودی عربیہ میں مقام مقدسہ کی زیارت کرکے اُن سے فیضیاب ہوجاؤں۔ میری یہ خواہش بالآخر خدائے برتر و بزرگ نے پوری کی اور مجھے ان مقدّس مقامات کی زیارت کا شرف حاصل



شیخ صاحب اور ان کے اہل خاندان
قصر عباسیہ بغداد میں



ہوگیا۔ کشمیری مسلمانوں کو عراق کے مقدس مقامات کے ساتھ ایک ذہنی اور جذباتی لگاؤ ہے۔ ان مقامات پر حاضر ہوکر ایک آدمی جذب و مستی میں ڈوب جاتا ہے اور روحانی کیفیت حاصل کرتا ہے۔ ہم نے عراق میں مقامِ مقدسہ کی زیارت کرنے کے علاوہ مکہ شریف میں خانۂ کعبہ میں عمرہ کیا۔ بعد میں روضۂ مطہرہ پر حاضر ہوئے۔

ایک انسان کو دُنیا میں جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں کو مدِنظر رکھنا پڑتا ہے تاکہ وہ ایک متوازی زندگی بسر کرسکے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ لوگ صرف مادی دُنیا کی چکاچوند میں کھوگئے ہیں اور اُنھوں نے روحانی اور اخلاقی قدروں کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ لوگ دولت کمانے، زمین اور جائیداد بنانے میں اتنے مصروف ہوگئے ہیں کہ اُن کو عقبیٰ یاد نہیں رہا لوگ دُنیا میں عیش پرستی کا سامان حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے مگر آخرت کے بارے میں بالکل غافل ہیں۔ دولت کمانے، جائیداد بنانے اور عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کے لئے کئی لوگ ناجائز طریقے اختیار کررہے ہیں۔ وہ موٹر کاریں، بنگلے، باغات اور دوسری جائیدادیں بنانے میں ایسے لگے ہیں کہ انھیں نہ دین کا کوئی پاس ہے نہ ہی عقبیٰ کا کوئی خیال، وہ نہیں جانتے کہ ایک دن ہمیں خدا کے گھر جانا ہے اور وہ بھی خالی ہاتھ!"


(بیگم عبداللہ)

اس سلسلے میں بیگم عبداللہ نے مسکین باغ میں خواتین سے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

"....سعودی عرب اور عراق کی زیارت گاہیں اور مقدس مقامات کی زیارت سے روحانی سکون ملتا ہے۔

مادیت کے اس دور میں لوگ روحانی اور اخلاقی قدروں سے بے بہرہ ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں تناؤ، حقارت اور بے اعتنائی بڑھ رہی ہے۔ لوگ خدا پرست کے بجائے سرمایہ پرست بن گئے ہیں۔ روپیہ کیا ہے۔ وہ تو ہاتھوں کا میل ہے۔

دُنیاوی عیش و آرام کے لئے لوگ آخرت کو خراب کررہے ہیں۔ دولت، بنگلے، موٹر کاریں کس کام کی جبکہ آخرت کے گھر خالی ہاتھ جانا ہے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ آپس میں خدا پرستی اور مخلوقِ خدا سے محبّت اور ہمدردی کو اپنا شعار بنالیں، اسلام نے یہی سبق عالمِ انسانیت کو دیا ہے۔"

شیخ محمد عبداللہ اور بیگم عبداللہ کے ان زرّیں خیالات پر کس کو ہنسی نہیں آسکتی۔ دراصل انہی کے لئے کہا گیا ہے۔ "خود کو فضیحت اور دوسروں کو نصیحت!"

حقیقت تو یہ ہے کہ جب کبھی شیخ عبداللہ، اُن کی بیگم اور اُن کے جانشین کو موقع ملا، عوام کو نفسِ امارہ سے خبردار کیا، انھیں لالچ طمع، حرص اور ہوس سے دور رہنے کی نصیحت کی!

۲۱ اگست ۱۹۸۱ء کو اپنے فرزند اپنے جانشین کی رسم تاجپوشی کے سہ روزہ جشن کے سلسلے میں اقبال پارک میں عوام سے خطاب فرماتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا تھا:۔

"......اس موقع کی عظمت سے میری آنکھیں ڈبڈبا رہی ہیں۔ میں پہلے تو خدائے بزرگ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے اس عاجز بندے کو اتنا عظیم فرض نبھانے کے لئے چُن لیا (اپنے فرزند کو ولی عہد بنانے کا فرض) اور مجھے اپنے اس پیمانِ وفا کی پاسداری کا سلیقہ عطا کیا۔ جو ۱۹۳۱ء میں میں نے اپنے دس رفیقوں کے ساتھ خانقاہ معلیٰ میں اُٹھایا تھا۔ ہماری ریاست میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو اس ریاست کی آزادی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ریاست کے بھولے بھالے عوام کے مفادات کے ساتھ کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے سیاہ ارادوں کا جواب سچی لگن اور نیک کرداری ہے۔ میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ آزادی کی حفاظت کے لئے ہوشیار اور مستعدی کی ابدی قیمت ادا کرتے رہیں گے۔ آج کی دُنیا میں سیاست خدمتِ خلق کے بجائے تجارت بن گئی ہے۔ یہ دولت کمانے کا ایک ذریعہ بن گیا ہے۔ آج کی سیاست سیاستدانوں کے لئے مکر و فریب، جھوٹ، بے ایمانی اور

بے کرداری کی زیور بن گئی ہے۔ لیکن یہ صورت پہلے نہ تھی۔ آج خداترسی انسان دوستی اور غریب نوازی چند بھولی بسری قدریں بن گئی ہیں۔ لیکن ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایسے بازیگروں کا کیا عبرتناک انجام ہوا۔ جنھیں اُن کی سیاست گری اور مال و متاع کے حصول میں ہوشیار خیال کیا جاتا تھا۔ خدا کی بارگاہ میں ایسے فریب کار جو دولت کمانے اور جائیدادیں بنانے کے لئے ناجائز طریقے استعمال کر کے سادہ لوح عوام کے ساتھ کھیل کھیلیں۔ آخر کار رسوا و خوار ہو جائیں گے اور اُن کا بُرا انجام ہو گا۔"

شیخ محمد عبداللہ اور اُن کی فیملی نے دولت کمانے، جائیدادیں بنانے اور عیش پرستی کے لئے جو کار ہائے نمایاں انجام دیئے وہ کس سے پوشیدہ تھے جو انھیں لوگوں کو ایسا درس دینے کی ضرورت پڑی۔

شیخ عبداللہ کی موجودہ حیثیت مدِ نظر رکھ کر اُن کے دولت کمانے، جائیدادیں بنانے، موٹر گاڑیوں کا ٹرانسپورٹ بناتے۔ زمینیں حاصل کرنے کے طریقے روزِ روشن کی طرح عیاں ہونے کے باوجود بھی اُنھیں عوام کو ایسا درس دینے کی کیا ضرورت تھی؟

شیخ عبداللہ پر تب سے جب سے وہ میدانِ سیاست میں اُتر آئے اب تک پارٹی فنڈس میں غبن، دھاندلی، کرپشن، کُنبہ پروری اور اقربانوازی کے جتنے بھی الزامات لگے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

شیخ عبداللہ چاہے وزارت میں رہے یا وزارت سے باہر ان پر پاکستان اور ہندوستان سے دولت حاصل کرنے کے ناقابلِ تردید الزامات لگے۔ شیخ صاحب جب میدانِ سیاست میں اُترے تو وہ کوڑی کوڑی کے محتاج تھے۔ اُنھوں نے خود کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو "انڈین ایکسپریس" ۲۵ اگست ۱۹۸۱ء)۔

"ہماری تحریک میں شامل مختلف لوگوں کے مقاصد تھے۔ صرف میں ہی فردِ واحد تھا جس نے لوگوں کی فلاح کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا۔ لیکن میرے کئی رفقاء معمولی مسافت طے کر کے ڈگمگا گئے۔

ہمارے ایسے بھی دن گزرے جب مجھے اور میرے ساتھیوں کو کھانے کے لئے کچھ

بھی نہیں ملتا تھا۔ ایک آنہ میں ژوُچہ ورُو (روٹی) خرید کر اسے پانی میں بھگو کر یا کشیری چائے کے ساتھ کھا کر گزارہ کرتے تھے۔"

آج وہی شیخ عبداللہ کروڑوں کے مالک ہیں ــ یہ سب کچھ اُنھوں نے اس سیاست گری سے حاصل کیا جس کے بارے میں خود اُن کا خیال ہے ..... آج کل کی سیاست مکر و فریب اور دھوکہ دہی کا نام ہے۔ یہ ناجائز طریقے سے مال و متاع حاصل کرنے اور جائیدادیں بنانے کا ذریعہ بن گئی ہے۔

شیخ محمد عبداللہ جو ۱۹۳۰ء میں قرضہ حسنہ حاصل کر کے لاہور سے کشمیر آئے اور یہاں کوڑی کوڑی کے محتاج رہے۔ ابتدا میں اُنھوں نے ۵ سال تک حکومت کی اور دوسرے دور میں اُن کی حکمرانی سات سال تک جاری رہی۔ کل بارہ سالہ دورِ حکمرانی میں وہ کوئی پچاس کروڑ کی نقد و جنس کے مالک بن گئے۔ صاف ظاہر ہے کہ اُن کے پاس اقتدار نہیں بلکہ الہ دین کا چراغ تھا۔

ایسا شخص جو دولت کمانے، زمینیں حاصل کرنے، جائیدادیں بنانے اور موٹر گاڑیوں کا ٹرانسپورٹ بنانے میں جُٹ گیا ہو۔ وہ عوام کو نفسِ امارہ، حرص، ہوس اور لالچ سے دور رہنے اور اُنھیں پرہیزگاری کا درس دینے میں پیش پیش رہے۔ وہ اپنے سوا باقی تمام سیاستدانوں کو مکّار، فریبی، کذاب اور دھوکے باز سمجھتے رہے؟ کیا اس طرح وہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو سچائی، نیکی، پرہیزگاری، ایمانداری اور دیانتداری کا سرٹیفکیٹ دیا کرتے تھے یا عوام کو اندھے، بہرے اور گونگے سمجھ رہے تھے؟

شیخ محمد عبداللہ اور بیگم عبداللہ کی اس قسم کی نصیحت کا جگہ جگہ چرچا ہوا۔ تو کانگریس پارٹی نے اُن کا کچا چٹھا نکالنے کا فیصلہ کر لیا اور اس بارے میں اُن کے پاس جو مواد جمع تھا اس کو ایک کتابچہ کی صورت میں منظرِ عام پر لایا گیا۔



(شیخ عبداللہ، بیگم عبداللہ)

پردیش کانگریس کمیٹی اس قسم کے الزامات سے خود بھی دغدار تھی لیکن

نیشنل کانفرنس نے واقعی اُن کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔

کانگریس کے شور وغوغا کا جواب شیخ صاحب نے ۷؍جون ۱۹۸۰ء کو ضلع ترقیاتی بورڈ بارہمولہ کی میٹنگ میں دیا:

"اقتدار کے بھوکے اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے تشدد کو ہوا دے رہے ہیں انہی لوگوں نے ماضی میں مختلف بہانے تراش کر ریاست میں گڑبڑ کرانے کی کوشش کی، کرپشن انہی عناصر کی دین ہے۔ یہ عوام کے مفادات کو اپنے مفادات پر قربان کر رہے ہیں۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ ان بیس برسوں کے دوران ان کی حالت کیا تھی۔ جب یہ لوگ برسر اقتدار تھے۔ تو یہ عناصر لوگوں سے الگ تھلگ تھے۔

اپوزیشن نے ماضی میں گڑبڑ کرانے کے لئے مذہب کا بھی استعمال کیا، اپوزیشن کی طرف سے حکومت پر رشوت ستانی کے الزامات کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ کرپشن کا پھیلاؤ ان ہی لوگوں کی دین ہے جو گزشتہ دو دہائیوں کے دوران ریاست میں برسر اقتدار تھے۔ معصوم لوگوں کے مفادات کو قربان کر کے ناجائز دولت کے انبار جمع کر کے انھوں نے غلط کاریوں کا مظاہر کیا۔

اس سلسلے میں یکم جولائی کو ضلع بڈگام کے ترقیاتی بورڈ کی میٹنگ میں شیخ صاحب نے فرمایا:

"ریاست میں رشوت ستانی کی داغ بیل کانگریس آئی نے ڈالی ہے۔ کشمیر کی انفرادیت وہ لوگ برقرار نہیں رکھ سکتے جن پر عوام کو اعتماد نہ ہو۔ لوگوں کو ان سیاسی مفاد پرستوں کی ریشہ دوانیوں سے خبردار رہنا چاہیئے جو ریاست میں پُرامن ماحول بگاڑنے کے درپے ہیں۔ اقتدار کے بھوکے عناصر اپنے معمولی فائدے کے لئے لوگوں کے مفادات کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے مذموم ارادوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔ انھیں عوام کے مفادات کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ عوام نے برسوں آلام و مصائب جھیلنے کے

بعد آزادی[1] اور کھوئے ہوئے حقوق حاصل کئے ہیں۔ ان عناصر نے ریاست میں ۲۰ سالہ حکومت کے دوران لوگوں کو ناقابلِ بیان مصائب کا شکار بنادیا اور ریاست کی معیشت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ انہی لوگوں نے ریاست میں رشوت ستانی کا زہر پھیلا دیا۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ اس بیماری کا مکمل سدباب ہو اور عوامی زندگی کو صاف ستھرا بنائیں، رشوت ستانی کے خاتمے کے لئے وقت درکار ہے۔ ان عناصر کو جو ہمیں رشوت ستانی کے الزامات دیتے ہیں۔ پہلے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیئے۔ لوگوں کو ان شکست خوردہ عناصر کی چالوں سے خبردار رہنا چاہیئے ـــ نیشنل کانفرنس کو یہاں کے عوام کی بھرپور حمایت[2] حاصل ہے۔"

نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے درمیان کرپشن کے الزامات کے دوران عوامی ایکشن کمیٹی کے صدر مولانا فاروق شیخ وزارت گرانے کے لئے کانگریس کو اپنا تعاون دے رہے تھے۔ مولانا اس حد تک بھی گئے کہ اگر کانگریس نیشنل کانفرنس کی حکومت کو گرائے گی تو وہ عوامی ایکشن کمیٹی کو کانگریس میں ضم کریں گے۔

کانگریس کے یوتھ لیڈر غلام نبی آزاد نے ۲۵؍جون ۱۹۸۰ء کو اپنے ایک انٹرویو میں بتایا:

"....میرواعظ مولوی فاروق کانگریس آئی میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن اُن کی شمولیت کے بارے میں کانگریس نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

شیخ عبداللہ کے بارے میں آزاد نے کہا:

"....شیخ عبداللہ کی اقربا پروری، لوٹ کھسوٹ اور کرپشن کے بارے

۱۔ ۱۹۶۵ء میں کشمیری عوام شیخ عبداللہ کی قیادت میں آزادی اور حقوق کے لئے لڑ رہے تھے۔ ۲۲ سال تک آلام جھیلنے کے بعد ۱۹۷۵ء میں کشمیر عوام نے اقتدار یعنی آزادی، جاہ و حشمت یعنی کھوئے ہوئے حقوق حاصل کر لئے تھے۔

۲۔ چونکہ نیشنل کانفرنس کو عوام کی حمایت حاصل ہے۔ اس لئے وہ کچھ بھی کریں کسی کو کہنے کا حق نہیں۔

میں کسی کو بھی شک نہیں۔ شیخ صاحب کشمیریوں کو ڈوگروں سے ڈراتے ہیں اور کرن سنگھ ڈوگروں کو کشمیریوں سے ڈراتے ہیں۔ اس طرح دونوں اپنا سیاسی مقصد حاصل کر رہے ہیں۔ شیخ سرکار کو گرانے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ البتہ شیخ سرکار عوام سے جس طرح کٹ رہی ہے۔ اس سے وہ ضرور گر جائے گی۔"

کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے ایک دوسرے پر کرپشن، لوٹ کھسوٹ اور دھاندلی کے الزامات کے دوران وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے حضرت بل میں نمازِ جمعہ سے قبل عوام کو ایکبار اور اپنے زریں خیالات سے محظوظ کیا:

"کشمیر کے عوام کے لئے حق مانگنا سچائی پر مبنی ہے۔ نفس امارہ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہ دوست کو دوست سے اور بھائی کو بھائی سے جُدا کرتا ہے۔ میرے ساتھ جو احباب چلے تھے اور میرے ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ لیکن نفسِ امارہ نے ان کو غلط راستے پر ڈال دیا۔ انھوں نے دولت کمانے اور جائیداد بنانے کے لئے ناجائز طریقے استعمال کئے۔ ہمیں اپنے اندر نفسِ امارہ پر قابو پانے کی قوت پیدا کرنی چاہیئے اور اس بات کا ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اس دُنیا سے ایک روز جانا ہے۔ خالی ہاتھ جانا ہے۔ وہاں دولت اور جائیداد کام نہیں آسکتی بلکہ نیک اعمال!"

اپوزیشن کی طرف سے کرپشن، دھاندلی، لوٹ کھسوٹ، کنبہ پروری کے جواب میں شیخ صاحب عوام کو نفسِ امارہ سے پرہیز کرنے کا درس، آزادی کی حفاظت کرنے کی تلقین اور اپوزیشن کی طرف سے الزامات پر کان نہ دھرنے کی ہدایات کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ ناجائز طریقے استعمال کرتے گئے۔ کرپشن کو فروغ دیتے گئے۔ دھاندلی، لوٹ کھسوٹ کی آبیاری کرتے رہے۔ کنبہ پروری اور اقربا نوازی کا پورا پورا خیال رکھتے گئے۔

اپوزیشن کے شور و غوغا کو ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُڑاتے گئے —— دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر شیخ صاحب اپنے عہدے کا ناجائز استعمال جس طریقے سے کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ اُن کے پاس ایک ٹارگیٹ تھا۔ جس ٹارگیٹ کو پورا کرنے تک وہ کسی شکایت پر کان دھرنا نہیں چاہتے تھے اور کسی الزام کو خاطر میں نہیں لانا چاہتے تھے۔

باب (۳)

نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کے

تاریخی کارنامے

اور ان کی سیاسی زندگی کا ماحصل

ناز تھا جس فہم و دانش پر کبھی اس قوم کو
کتنا عبرتناک ہے اِس فہم و دانِش کا زوال

جز :-

صفحہ نمبر

وہ ہیں تاریخ کے ماتھے پہ المناک شکن
ان سے مل کر سبھی احباب پشیماں ہوں گے

نیشنل کان فرنس کی لیڈر شپ پر کرپشن کے الزامات

جیساکہ پہلے ہی بتایا جاچکا ہے، ۱۶ مئی ۱۹۸۰ء کو حضرت بل کے آستانہ عالیہ پر شیخ محمد عبداللہ کی وہ بصیرت افروز تقریر جس میں انہوں نے لوگوں کو اس بات پر للتاڑا کہ وہ دُنیاوی عیش و آرام کے لیے آخرت کو بھول گئے ہیں، دولت زمین، جائیداد اور موٹر گاڑیاں حاصل کرنے کے لیے ناجائز طریقے استعمال میں لاتے ہیں، یہ جان کر بھی کہ خدا کے گھر خالی ہاتھ جانا ہے، ایسے لوگ مادّی دُنیا میں اپنی عقبیٰ خراب کر رہے ہیں۔

اس قسم کی شہ پاکر مقامی کانگریس نے شیخ محمد عبداللہ کا ظاہر اور باطن نکال کر عوام کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے شیخ صاحب کے بارے میں اقربا پروری، کرپشن اور عہدے کے ناجائز استعمال پر مشتمل ایک میمورنڈم کانگریس کی صدر مسز اندرا گاندھی کو ۸ جولائی ۱۹۸۰ء کو بھیجا تاکہ اُن سے اِس میمورنڈم کو مشتہر کرنے کا اذن مل سکے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے اس میں سے تھوڑا مصالحہ ری ایکشن دیکھنے کے لیے اخبار "ٹائمز آف انڈیا"، کو بھیج دیا گیا۔



اِس اخبار نے "شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے خاندان پر کرپشن کے سنگین الزامات"، کے عنوان سے ایک تبصرہ شائع کیا جو حسبِ ذیل ہے:-

"(۱) شیخ صاحب نے اپنا ذاتی مکان جو صورہ میں واقع ہے شیرِ کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کو دو ہزار تین سو روپیہ ماہانہ کرایہ پر دیا، (تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ کے لیے لوگوں سے چندہ جمع کیا گیا، اور کئی بیواؤں نے اپنے زیورات بیچ کر اس انسٹی ٹیوٹ کے لیے امداد دی ہے اور جس کے نام پر یہ انسٹی ٹیوٹ ہے وہ اپنے ذاتی مکان کا اس ادارے سے کرایہ وصول کر رہا ہے)

(۲) نیڈور ہوٹل کے احاطے میں جہاں پر شیخ صاحب کا ذاتی مکان ہے وہ گورنمنٹ سے اس لیے ایک ہزار چھ سو روپے کرایہ وصول کر رہے ہیں ان کے داماد غلام محمد شاہ بھی اپنے بنگلے کے لیے گورنمنٹ سے ایک ہزار چھ سو روپے ماہانہ وصول کر رہے ہیں۔ (اپنی ذاتی کوٹھی میں اپنی رہائش کا کرایہ وصول کرنے کا یہ انوکھا طریقہ ہے، اس قسم کی مثال اور کہیں نہیں مل سکتی)

(۳) امیرا کدل میں شیخ صاحب نے ایک قطعۂ زمین خریدا ہے۔

(۴) گاندربل کے گاؤں عمر ہیر میں انھوں نے زرعی زمین حاصل کر لی ہے۔

(۵) گلف کلب سرینگر کے متصل سرکاری زمین کا ایک حصّہ اپنے تصرّف میں لے لیا ہے۔

(۶) گپکار روڈ پر ایک بنگلہ اور اس کا باغ انھوں نے حقیر معاوضہ پر حاصل کر لیا ہے، جس کو اُن کے دو بیٹے اور ایک بیٹی استعمال کر رہے ہیں، اس زمین کے قطعہ پر ان کے خاندان کی دو اور کوٹھیاں بن رہی ہیں جن کا میٹیریل ناجائز طریقے سے حاصل کیا جا رہا ہے۔)

(۷) انھوں نے دھن جی کی پراپرٹی ایک معمولی رقم کے عوض حاصل کی ہے اگرچہ اس کی مارکیٹ قیمت کئی کروڑ روپے ہے۔

(۸) گاندربل تحصیل میں ناگہ بل کے متّصل ایک میوہ باغ حاصل کر لیا ہے،

(۹) بیگم عبداللہ کے نام ٹنگمرگ میں اسّی کنال کے قریب زمین ہے (۱۹۴۷ء میں جب شیخ صاحب نے وزارت سنبھالی، یہ قطعۂ زمین ۱۰ کنال ۷ مرلہ پر مشتمل تھا، تب سے ہر سال یہ لمبا اور چوڑا ہوتا آیا ہے)

(۱۰) اس زمین پر لاکھوں روپے کے صرفے سے ایک بنگلہ تعمیر کیا گیا ہے۔

(۱۱) شیخ صاحب کے پاس کاروں، جیپوں اور ویگنوں کا ایک ٹرانسپورٹ یارڈ ہے۔"

ٹائمز آف انڈیا میں اس مراسلے کے شائع ہونے پر شیخ محمد عبداللہ نے کانگریس آئی کو موردِ الزام ٹھہرایا اور برملا کہا:

"کانگریس آئی عوام میں میری امیج خراب کرنے کے درپے ہے۔"

اسی دوران شیخ عبداللہ اور ان کے خاندان کے بارے میں ایک کتاب "لال کتاب" کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔ اس کو ایک نام نہاد عابد حسین خاں نے مرتّب کیا تھا۔ اصل میں یہی وہ کانگریس کا میمورنڈم تھا جس کی اشاعت کی اجازت مسز اندرا گاندھی سے مانگی گئی تھی۔

۱۹۷۵ء میں شیخ محمد عبداللہ اقتدار میں آئے تو مالی اعتبار سے وہ کسی بڑی حیثیت کے مالک نہیں تھے (انھوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا کہ پیٹ پالنے کے لیے ہمیں چائے اور پانی پر گذارہ کرنا پڑتا تھا) لیکن اب انکی ذاتی جائیداد کروڑوں کی ہے، اس پر طرّہ یہ ہے کہ شیخ صاحب نے اب تک نہ تو کوئی انکم ٹیکس دیا ہے اور نہ دولت ٹیکس، اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کا بیشتر اثاثہ سرکاری زمینوں پر مشتمل ہے جو طرح طرح کے ہتھکنڈوں اور ناجائز طریقوں سے ہتھیائی گئی ہیں۔ ان زمینوں پر ایک ایک کر کے شاندار عمارتیں بھی تعمیر کی گئیں۔ ان پر بے حساب دولت خرچ کی گئی، اور یہ اخراجات سرکاری ٹھیکہ داروں اور سرکاری محکموں کے ذرائع سے پورے کیے گئے۔

راجے مہاراجے تو چلے گئے، لیکن جاگیرداری کے اس اندازِ فکر کو شیخ صاحب نے پوری طرح سے اپنا لیا ہے کہ ریاست کا پیسہ حکمرانوں کے لیے ہوتا ہے نہ کہ محکموں کے لیے؟

دھانجی بھائی بلڈنگز

سرینگر میں ایک عمارت دھانجی بھائی بلڈنگز کے نام سے مشہور ہے دو ایکڑ زمین پر بنی یہ عمارت سیٹھ دھانجی بھائی کو پٹّہ پر دی گئی تھی، مگر اب اس پر شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ قابض ہیں، اس عمارت کو حاصل کرنے کے لیے جس شخص نے تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے

کی رقم اپنی جیب سے دی اس کا اس جائیداد سے کوئی تعلق نہیں رہا، یہ سب سرکاری اثرورسوخ کا معجزہ ہے۔

سیٹھ دھانجی بھائی اور اُن کے لڑکے جب چل بسے تو اس جائیداد کا پٹہ اُن کے خاندان کی ایک خاتون کے نام منتقل ہوگیا۔ سرکار نے فیصلہ کرلیا کہ اس عمارت کو سرکاری مقاصد کے لیے واپس لیا جائے گا، چنانچہ پٹے دار کو معاوضہ ادا کرنے کے لیے جموّں وکشمیر بنک میں تین لاکھ ستّائیس ہزار روپے کی رقم جمع کروادی گئی۔ اِدھر شیخ عبداللہ اور سفرنگ مُوزِز کے شری غلام محی الدین، خاتون مذکور سے اپنے حق میں ناقابلِ تنسیخ مختار نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے، محیؔ الدّین صاحب نے مختار نامہ کے عوض اس خاتون کو جس کے نام اس عمارت کا پٹہ تھا تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے ادا کیے شیخ صاحب نے عمارت سے متعلق کابینہ کا فیصلہ بدلوا دیا چونکہ وہ وزیرِاعلیٰ ہیں اس لیے یہ کام ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

اگلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ پٹّہ شیخ عبداللہ کے نام منتقل کروایا گیا۔ سفرنگ مُوزِز کے محی الدّین صاحب کو روپے لوٹانے کا دوسرا انتظام کیا گیا۔

شیرِکشمیر کے پاس ایک اور مکان بھی ہے جسے محل کہنا موزوں رہے گا۔ اس کی مالیت کا اندازہ (۱۹۸۰ء میں) ۱۵ لاکھ لگایا گیا تھا۔ یہ حویلی نیڈوز ہوٹل کے پیچھے مولانا آزاد روڈ پر واقع ہے،

صورہ کے علاقہ میں شیخ صاحب کا جو جدّی مکان ہے اُسے "شیرِکشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ ٹرسٹ کو دو ہزار روپیہ ماہانہ کرایہ پر دے رکھا ہے، اس ٹرسٹ کے سربراہ شیخ صاحب خود ہی ہیں، دوسری طرف مولانا آزاد روڈ پر اپنی نئی حویلی میں رہنے کا کرایہ کشمیری عوام کے یہ بہی خواہ سرکاری خزانے سے خود ہی وصول کرتے ہیں۔ اس رقم پر جو انکم ٹیکس واجب الادا ہوتا ہے وہ بھی سرکار ہی ادا کرتی ہے، یہ سب کچھ شیخ صاحب کے قلم کا معجزہ ہے۔

ٹنگمرگ کا فارم ہاؤس

گلمرگ کے پاس ٹنگمرگ میں بیگم عبداللہ کا ایک فارم ہے، اس میں ایک شاندار کوٹھی بھی بنائی گئی ہے، نہ جانے کیا جادو ہے کہ یہ فارم پھیلتا ہی جاتا ہے (۱۹۴۷ء میں یہ قطعہ زمین ۱۰ کنال، مرلہ پر مشتمل تھا اِس وقت یہ اسی کنال تک پھیل گیا ہے) یہ کوئی راز کی

بات نہیں رہی کہ یہ جادو سرکاری زمینوں اور جنگلات پر قبضہ کرنے سے جگایا ہے۔

جموّں وکشمیر میں ہونے والی بدعنوانیوں کے متعلق یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے والی ہے کہ اس ریاست میں جو بھی گھپلے ہو رہے ہیں اُن میں بیشتر زمینوں کی الاٹمنٹ سے متعلق ہیں۔

یہاں کے "خداؤں" کو یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے اور اپنے پلّے سے بغیر کوئی پیسہ خرچ کیے اگر جائیداد بنانی ہے تو سب سے آسان طریقہ سرکاری زمینوں کی الاٹمنٹ ہے اس طریقے میں ہیرا پھیری اور اقربا پروری کی اتنی گنجائش ہے کہ راج دربار سے قربت رکھنے والے سب لوگوں کے گھر بھرے جاسکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بیش قیمت سرکاری زمینوں کی الاٹمنٹ کا سلسلہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

شیخ عبداللہ وزیرِاعلیٰ ہوں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بیگم عبداللہ کے پاس کوئی جائیداد نہ ہو، اس لیے اب گپکار روڈ پر واقع دو ایکڑ سے زیادہ کی سرکاری زمین کا پٹّہ شیخ صاحب کی اہلیہ بیگم اکبر جہاں کے نام ہے، زمین کی مالیت بہت ہی محتاط اندازے کے مطابق ایک کروڑ روپے ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ جائیداد بھی شیخ عبداللہ کے سرکاری اثرورسوخ سے ہی حاصل کی گئی زمین کا اصل پٹّہ دار جنگلات کا ایک ٹھیکہ دار دیوان مدن لال تھا، انہیں جنگل لوٹنے کی کھلی ڈھیل دے کر راستے سے ہٹایا گیا اور پٹہ بیگم عبداللہ کے نام منتقل ہوگیا۔ وزیرِاعلیٰ کی بیوی کے ناطے انہیں معمولی فیس دینی پڑی اس زمین پر ایک کوٹھی پہلے ہی سے موجود تھی دو نئی عالیشان عمارتیں بنوائی گئی ہیں جن کی مالیت بیس لاکھ روپے سے کسی صورت میں کم نہیں اب یہ بتانے کی ضرورت کیا ہے کہ ان دو نئی عمارتوں کے بنانے کے لیے سیمنٹ، لوہا، ٹمبر اور دوسرا سامان کہاں سے آگیا۔

شیخ صاحب کی ذاتی کوٹھی جو کوٹھی باغ کے زُمرے میں آتی ہے خسرہ نمبر ۱۸۴ کے تحت ۴ اکنال اور خسرہ نمبر ۲۰۴ خالصہ سرکار بلا استحقاق لگ بھگ ۳۰ کنال پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ سونوار میں خسرہ نمبر ۸ کے تحت جو ۱۶ کنال زمین سرکار کی ملکیت میں تھی بیگم عبداللہ کے نام سے درج کرائی گئی۔

جب سرکار شیخ صاحب کی ہے تو اُن کے کنبے کی عمارتوں پر بھی تو سرکاری مال ہی لگے گا۔ اس زمین کو بیگم عبداللہ کے نام پٹّہ بنوانے کے دوران حلقہ پٹواری کی وزیرِاعلیٰ نے اس بات پر خوب

ماریپیٹ کی کہ اس نے دو ایکڑ زمین پلاٹ میں دو کنال زمین کا ٹکڑا ایک مقامی ٹھیکہ دار کی ملکیت دکھائی ہے، چونکہ ریکارڈ میں یہی درج تھا، وزیر اعلیٰ یہ ریکارڈ ماننے کے لیے اس لیے تیار نہیں تھا کیونکہ وہ اس ایریا میں کسی بھی شخص کی ٹانگ رکھنا نہیں چاہتے تھے، حلقہ پٹواری کی ماریپیٹ کے بعد جب یہ دو کنال زمین بھی بیگم عبداللہ کے کھاتے میں ڈال دی گئی تو شیخ صاحب کی یہ تجویز تھی کہ اس زمین کی لیز کی معیاد نوّے سال کے بجائے ڈیڑھ سو سال کر دی جائے، جب کمشنر نزول نے ایسا کرنے سے معذوری ظاہر کی تو اس کی ایسی درگت بنائی گئی کہ اس کے ماتحت عملے نے کمشنر صاحب کو اپنے دفتر کے کمرے میں روتے ہوئے دیکھا۔

کمشنر نزول کا اتنا کہنا تھا کہ لیز کی معیاد نوے سال سے ڈیڑھ سو سال کرنا میرے حد اختیار میں نہیں ہے انہیں ایسی جھاڑ پلائی گئی کہ اگر یہ صاحب بھاگ نہیں جاتے تو حلقہ پٹواری کی طرح ان کی بھی شامت آجاتی۔

کاغذات مکمل ہو کر بیگم عبداللہ نے اب اپنے پٹے کے حقوق پرانی شرائط پر اپنے دو لڑکوں اور ایک لڑکی کے نام کر دیئے ہیں۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ جو اب شیخ صاحب کے جانشین نیشنل کانفرنس کے صدر اور ریاست کے وزیر اعلیٰ ہیں، اپنی اہلیہ کے ساتھ چودہ سال انگلستان میں رہے۔

غیر ملکی کاروں کا معاملہ

انگلستان میں فاروق عبداللہ نے "کشمیر لبریشن فرنٹ" اور "محاذ رائے شماری" کے فنڈ سے دو بدیشی کاریں خرید لیں، بدیش سے واپس آکر دو غیر ملکی کاریں بھی ساتھ لے لیں مگر ان کاروں کی درآمدی ڈیوٹی جو کہ لگ بھگ ایک لاکھ روپے بنتی تھی انھوں نے نہیں دی۔

ڈیوٹی سے چھوٹ حاصل کرنے کے لیے یہ کہا گیا کہ یہ دونوں گاڑیاں "شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ ٹرسٹ" کے لیے ہیں اور انہیں ذاتی کام کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس تحریر کی رو سے یہ گاڑیاں صرف مریضوں کے لانے لے جانے اور سرکاری ڈیوٹی پر تعینات عملہ کے لیے ہی استعمال کی جاسکتی تھیں مگر ایسا نہیں ہوا۔

گاڑیاں فاروق عبداللہ کے پاس ہی ہیں، ان دو غیر ملکی کاروں کے علاوہ ایک اکیلے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے پاس تقریباً ایک درجن گاڑیاں ہیں۔

دامادوں پر عنایات

ڈاکٹر علی محمد متو شیخ صاحب کے چھوٹے داماد ہیں ان کو اپنے بیسیوں افسروں کو پیچھے چھوڑ کر گورنمنٹ ہسپتال (برائے خواتین) کا سپرنٹنڈنٹ بنایا گیا، ان کے بھائی کو پارلیمنٹ کے لیے نامزد کیا گیا۔

شیر کشمیر نے جب عنانِ حکومت سنبھالی، انھوں نے لوگوں کو یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جمہوریت وہی اچھی ہے جس میں حکمراں خاندان کو سب لوگوں پر فوقیت دی جائے، مگر کچھ لوگ دیوانے ہیں، سمجھتے نہیں، خواہ مخواہ اعتراض کرتے رہتے ہیں۔

شیخ صاحب کے دوسرے داماد غلام محمد شاہ ہیں۔ آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

شیخ صاحب کی وزارت میں ان کے پاس تعمیرات و توانائی کا قلمدان رہا۔ دولت جمع کرنے میں انہوں نے جو مہارت حاصل کی ہے اس کا مقابلہ شیخ صاحب کی وزارت کا اور کوئی وزیر نہیں کرسکتا، ایک سال سے بھی کم عرصے میں انہوں نے ستر لاکھ روپے سے بھی زیادہ رقم حاصل کرلی ہے، طریقہ ان کا سیدھا سا ہے، اپنے محکمہ کے ہر انجینئر کے لیے انہوں نے ماہانہ روپے فراہم کرنے کے نشانے مقرر رکھے تھے اس نشانے کو پورا کرنا ہر انجینئر کا اوّلین فرض تھا۔ مثال کے طور پر چیف انجینئر کو پچاس ہزار روپے فراہم کرنا سپرنٹنڈنٹ انجینئر کو چالیس ہزار روپے اور ڈویژنل انجینئر کو ۲۵ ہزار روپے ادا کرنے ہوتے تھے۔

حکمراں پارٹی کے اخبار "نوائے صبح" کو شائع کرانے کی ذمہ داری ابتداء میں وزیر تعمیرات جی، ایم شاہ کے اوپر ہی رہی، یہ بھی ذریعہ ہے روپیہ اکٹھا کرنے کا۔ اخبار کے لیے جو ٹرسٹ قائم کیا گیا اس کے سربراہ بھی پہلے یہی شاہ صاحب تھے، اخبار کے دفتر کے لیے زیرو برج کے پاس نصف ایکڑ کا پلاٹ "نوائے صبح" کو نوّے سال کے پٹہ پر ۱۹۶۰ء کے لینڈ گرانٹس ایکٹ کے تحت صرف ایک روپیہ فی کنال سالانہ کے حساب سے کرایہ پر حاصل کیا گیا۔ اس پلاٹ پر جو کمپلکس تعمیر کیا گیا اس میں انجینئروں کے ذریعے پبلک ورکس اور میونسپلٹی کے ٹھیکیداروں سے میٹیریل حاصل کیا گیا۔ کمپلکس مکمل ہونے پر اس کی ایک درجن دوکانیں ۲۵ ہزار فی دوکان سے مٹھائی لینے پر اور کمپلکس کے کمرے مختلف دفاتروں کو دس ہزار سے ۱۵ ہزار کی مٹھائی کے ساتھ معقول کرایہ پر دیئے گئے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ اس فیملی کے لیے روپے حاصل کرنے کے ذرائع صرف انجنیئروں اور جنگلات کے ٹھیکہ داروں تک ہی محدود ہیں بلکہ دوسرے تاجر بھی ان کی جیب گرم کرتے رہتے ہیں۔ اس نذر و نیاز کے بدلے ٹھیکہ داروں اور تاجروں کو جو سہولیات دی جاتی ہیں وہ بذاتِ خود ایک زبردست دھاندلی ہے۔

غلام محمد شاہ نے مولانا آزاد روڈ پر ایک عالیشان کوٹھی بنوائی ہے جس پر لاکھوں روپے کی لاگت آئی ہے اس کے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح انہوں نے بھی گلمرگ میں اپنے پرائیویٹ پلاٹ سے ملحقہ سرکاری زمین کا بہت سا حصّہ اپنے قبضہ میں کر لیا ہے۔ سرکار چونکہ ان کی ہے اس لیے سرکاری زمین کو بھی وہ اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔

دھاندلیوں کے انکشافات

بارہ مولہ کی ماچس فیکٹری اور شالہ ٹینگ میں چمڑے کا کارخانہ پرائیویٹ ہاتھوں میں بیچ دینے میں جو دھاندلی کی گئی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اِن دونوں کارخانوں کی فروخت کے لیے نہ کوئی ٹینڈر طلب کیے گئے اور نہ کوئی اشتہار ہی دیا گیا۔ ریاستی اسمبلی میں حکومت کی طرف سے ایک انوکھا بیان دیا گیا کہ ان کی فروخت کے لیے اشتہار دینا پبلک مفاد میں[1] نہیں تھا۔ جیسا کہ معلوم ہوا ہے کہ ان کارخانوں کے نئے مالکوں جن کے ساتھ چوری چھپے سودا کیا گیا۔ شیخ عبداللہ اور ان کے خاندان کو موٹی رقم نذرانے کے طور پر مل گئی۔ ان مالکوں کو خام مال بھی کوڑیوں کے مول فراہم کیا گیا، جب کہ حالت یہ ہے لکڑی کا کام کرنے والی سرکار کی اپنی مِل کو یہی مال بہت گراں قیمت پر وزیرِ اعلیٰ کی ہدایت پر لینا پڑا۔

وزیرِ اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے خاندان کے افراد اور دوسرے وزراء جنگلوں کے پٹے داروں کے ایک خاص گروپ سے چالیس لا روپے کی رشوت لے کر انہیں یوں فائدہ پہنچایا کہ برفباری سے گرے ہوئے درختوں اور مزید مارکنگ کے بہانے

---

[1] صاف صاف کہنا تھا، راز افشا کرنا ہمارے مفاد میں نہیں۔ خرید و فروخت کا معاملہ نہ ہوا سکیورٹی کا مسئلہ بن گیا۔

ان کے پٹوں کی توسیع کر دی گئی، ان ٹھیکہ داروں نے ایک کروڑ سے زیادہ مالیت کی لکڑی بے حد سستے داموں ہتھیا لی۔

اس طرح جنگلات کی ایک اور پیداوار "رال" کی الاٹمنٹ میں بھی ٹھیکہ داروں سے رشوت لے کر ضابطے کی کوئی پروا نہیں کی گئی۔

مرکزی سرکار کی پالیسی کے تحت رال صرف چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے مخصوص کی گئی تھی، مگر شیر کشمیر نے اس کی پروا نہیں کی اور سرکاری اختیارات کے بل بوتے پر بیرون ریاست کے بڑے بڑے تجارتی اداروں کو رال کی الاٹمنٹ کی ہے، بازار میں رال کی قیمت ۸ روپے فی کلو ہے جبکہ چہیتے ٹھیکیداروں کو یہی رال صرف ایک روپیہ ساٹھ پیسے فی کلو کے حساب سے فروخت کی گئی، یہ سستا سودا صرف اس لیے ہوا کیونکہ ان لوگوں سے رشوت میں موٹی رقم ملی ہے۔

ریاست کے ولی عہد ڈاکٹر فاروق عبداللہ ایسی ہی ایک فرم کے حصّہ دار ہیں، جو جموں کے علاقہ میں رال کا کاروبار کرتی ہے، یہ سب اس لیے ہوا ہے کیونکہ فاروق عبداللہ نے اس حصّہ داری کے لیے فرم میں کوئی سرمایہ نہیں لگایا، انہیں فرم کا حصّہ دار اسی لیے بنایا گیا تاکہ وزیرِ اعلیٰ سے زیادہ سے فائدہ اُٹھایا جاسکے۔

دھاندلی کی ایک اور مثال سُننے لائق ہے، جس میں شیخ صاحب کے گھر والوں نے اپنے ہاتھ خوب رنگے ہیں۔ بمبئی کے مالابار ہلز پر زمین کا ایک ٹکڑا ریاست جموں و کشمیر کی ملکیت ہے یہ پہلے مہاراجہ کی جائیداد میں شمار ہوتا تھا لیکن بعد میں سرکار نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا، اس پلاٹ کا کل رقبہ پانچ ہزار آٹھ سو دو مربع گز ہے۔ اس کے کچھ حصّے پر عمارتیں بھی بنی ہیں اور اس جگہ کو "کشمیر ہاؤس" کہتے ہیں۔ اب یہ پلاٹ اور عمارات ایک سرمایہ دار گھرانے سنگھوی کنسٹرکشن کمپنی کو الاٹ کیا گیا ہے۔ الاٹمنٹ کی شرائط سے بالکل عیاں ہے کہ اس سرکاری زمین کو کوڑیوں کے مول الاٹ کیا گیا ہے، اسے اتنے سستے دام دینے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ الاٹمنٹ کے بہانے سے وزیرِ اعلیٰ کے گھرانے نے اپنی جیبیں گرم کی ہیں اس کمپنی جس کے نام اس زمین اور عمارات کی الاٹمنٹ ہوئی ہے، کشمیر میں پنسل فیکٹری کے نام پر عمارتی لکڑی بھی فراہم کی گئی، جس کے لیے ان سے مروّجہ قیمت کے چوتھے حصّہ سے بھی کم دام وصول کیے گئے۔

اس طرح مالابار ہلز میں "کشمیر ہاؤس" کو پٹے پر حاصل کرنے کے لیے سنگھوی کنسٹرکشن کو

جو رقم رشوت کے طور پر ادا کرنا پڑی وہ اس نے جنگلات کی لکڑی رعایت میں حاصل کر کے وصول کر لی۔

ریاستی اسمبلی میں حزب اختلاف نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کشمیر میں کئی ذمہ دار افراد سنگھوی گھرانے کے باضابطہ تنخواہ دار ہیں، حکومت کی طرف سے اس کی کوئی تردید نہیں کی گئی۔

سنگھوی گھرانے سے وزیر اعلیٰ نے کتنی ہی موٹی رقم رشوت میں وصول کیوں نہ کی ہو۔ لیکن ریاست سے باہر اور وہ بھی بمبئی کے مالا بار ہلز جیسے علاقے میں "کشمیر ہاؤس" سے ہماری سرکار کی دستبرداری اور اس زمین و جائیداد سے محرومی ریاست کے عوام کے ساتھ سب سے بڑا فراڈ اور سب سے بڑا دھوکہ ہے۔

اس سودا بازی میں ریاستی عوام کا جتنا بڑا نقصان کیا گیا اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا، میرے نزدیک یہ سودا سب سے بڑا فراڈ، سب سے بڑا دھوکہ اور بے انتہا نقصان کے ساتھ ایک بڑا اور عظیم گناہ بھی ہے جس کی تلافی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے، اور یہ ہمارے وزیر اعلیٰ کا ایک ایسا قصور ہے جس کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

اس الاٹمنٹ کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ بمبئی میں مالا بار ہلز جیسے مقام پر ایک انچ زمین حاصل کرنا بھی ناممکن ہے مارکیٹ کا ریٹ دیکھا جائے تو "کشمیر ہاؤس" کی مالیت تقریباً پچاس کروڑ روپے ہوگی مگر سنگھوی گھرانے کو یہ سب ننانوے برس کے پٹے پر حاصل کرنے کے لیے صرف دو کروڑ روپے کا پریمیم اور پانچ لاکھ روپے سالانہ کرایہ (گراؤنڈ رینٹ) ادا کرنا پڑا، یاد رہے یہاں دو کمرے اور ایک کچن والا سیٹ ۳۲ لاکھ کی پگڑی دے کر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھا جائے کہ جموں و کشمیر بنک نے حکومت کو پیشکش کی تھی کہ وہ پلاٹ حاصل کر کے اسے (DEVELAP) کرنے کے لیے تیار ہے، یہ پیشکش اس لحاظ سے موزوں تھی کہ ساری پراپرٹی اپنے قبضے میں رہتی مگر ایک منظور نظر گھرانے کو "کشمیر ہاؤس" جو تحفے میں دینا تھا۔ اس سے اُسے کیسے محروم رکھا جاتا۔ ان سب حقائق کے پس منظر میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ الاٹمنٹ کا فیصلہ کرنے والی سیاسی شخصیتوں نے اس سودے میں اپنے لیے کیا کیا فائدے حاصل کیے ہوں، کشمیر ہاؤس کی پراپرٹی جو پچیس سال کے بعد ایک ارب کی اور پچاس سال کے بعد ڈیڑھ اور ننانوے برس کے بعد دو ارب سے بھی زائد کی ہوگی، اگر کوئی سمجھتا ہے کہ یہ قیمتی اثاثہ تب بھی ہمارا رہا ہوگا اور یہ ہمیں واپس

ملے گا۔ وہ احمقوں کی دنیا میں رہتا ہے۔

اس سلسلے کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بمبئی کے مضافات میں کشمیر سرکار کے لیے دفاتر ایمپوریم اور جموں و کشمیر بنک جو سالانہ کرایہ ادا کرتے ہیں، وہ اس رقم سے کہیں زیادہ ہے جو ہم "کشمیر ہاؤس" سے سنگھوی کنسٹرکشن سے بطور کرایہ حاصل کرتے ہیں اور اس صورت میں بھی ہم گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں۔

اس گھاٹے کے سودے کو اگر ہم بے ایمانی، دھوکہ اور فراڈ نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔

شیخ وزارت میں ان کے خاندان کے افراد کے علاوہ جن کو ان سے گہرے مراسم ہیں وہ کوچک برادرس تھے، ان میں غلام رسول کوچک راجیہ سبھا کا ممبر رہا ہے اور غلام نبی کوچک اب غلام محمد شاہ کے ساتھی ہیں۔

شیر کشمیر خاندان نے دونوں ہاتھوں سے جو دولت لوٹی ہے اس میں غلام نبی کوچک کا بھی ہاتھ رہا ہے، جنگلات کو لٹانے کے عوض میں شیخ صاحب نے انہیں اپنے فرزندوں کے ساتھ سرکاری زمین اور اس زمین پر کوٹھی بنانے کی سہولیات فراہم کیں۔

غلام نبی کوچک نے اپنی کوٹھی کے لیے سارا مواد وہیں سے حاصل کیا جہاں سے شیخ صاحب کی اولاد کے لیے حاصل کیا گیا۔

کوچک صاحب کے فرزند جاوید کوچک پر شیخ سرکار یکے بعد دیگرے نوازشات کرتی رہی پہلے انہیں فولاد اور نالی دار چادریں درآمد کا لائسنس دیا گیا انھوں نے جو فولاد اور ٹین کا مال باہر سے منگوایا وہ سب بلیک مارکیٹ میں بیچ کر لاکھوں روپے کمائے یہاں سے فارغ ہو کر انھوں نے فرنیچر بنانے کا کارخانہ بنایا، اس کے لئے حکومت سے قرضہ اور سبسڈی حاصل کر لی۔

کھیلوں کا سامان اور فرنیچر کی سپلائی میں انھوں نے بے انتہا دھاندلی کی کئی محکموں اور کارپوریشنوں کو اس فرم سے ناقص فرنیچر اور گھٹیا کرکٹ بیٹ خریدنے کے لیے اوپر سے دباؤ ڈالا گیا، چنانچہ یہ سارا مال اور فرنیچر چند دنوں میں ٹوٹ پھوٹ کر گوداموں میں سڑ رہا ہے۔

ان بدعنوانیوں کے علاوہ غلام نبی کوچک کو فائدہ پہنچانے کے لیے پہلگام ماسٹر پلان کی دھجیاں اُڑا کر یہاں سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ کرنے کی اجازت دی گئی، غلام نبی کوچک

نے شیخ خاندان کی طرز اور شہ پر باپ دادا کی میراث سمجھ کر جو رقبہ پہلگام میں حاصل کر لیا، وہ تقریباً تین لاکھ ایکڑ پر مشتمل ہے جس میں سو کے قریب جنگلات کے درخت موجود تھے۔ اس کی مالیت ۵، لاکھ روپے سے بھی زیادہ ہے۔

کوچک برادران کو ناجائز فائدہ پہنچانے کی خاطر ماسٹر پلان کو مسخ کر کے رکھ دیا گیا اور پچاس درخواستوں میں سے صرف ایک "کوچک صاحب" کو اس زمین پر ہوٹل بنانے کی اجازت دی گئی۔

شیخ صاحب کے ایک اور نورِ نظر نیشنل کانفرنس کے ایک کارکن محمد سلطان پنڈت پوری نے اپنی بیوی کے نام "پاپولر وائر" کے نام سے ایک جعلی فرم چلائی اس کے لیے محکمہ ہارٹیکلچر سے اس فرم کو ستّر لاکھ روپے دلوائے گئے تاکہ یہ فرم اس محکمہ کو کانٹے دار تار سپلائی کرے جب اس جعلی فرم کا یہ اسکینڈل طشت از بام ہو گیا تو دیگر افراد کے خلاف نام نہاد کارروائی کی گئی مگر محمد سلطان ایم، ایل، اے کی اہلیہ کے بچاؤ کے لیے وزیر اعلیٰ کے ساتھ ان کے داماد غلام محمد شاہ نے کھلّم کھلاّ مداخلت کی، کیونکہ اس نے پہلے ہی اس رقم کا ففٹی ففٹی کر دیا تھا۔

سرکاری زمینوں پر ملکیتی حقوق

اُن سرکاری زمینوں کے پٹّے جن پر وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کے خاندان کے مختلف ممبران قابض ہیں، ان کے بچوں کے نام جن میں نابالغ بچے بھی شامل ہیں منتقل کیے گئے، اور یہ سب اس عہدے کی بدولت ہوا جس پر وہ براجمان تھے۔

فاروق عبداللہ کی تین بیٹیوں صفیہ، حنا، اور سارہ ایک بیٹے عمر کو گورنمنٹ آرڈر ۲۹۰ NDK مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۹ء کی رُو سے گپکار روڈ پر واقع سرکاری زمین میں سے دو دو کنال کے حساب سے مساوی طور پر پٹّے پر دی گئی۔

وزیر اعلیٰ کے داماد غلام محمد شاہ کے قریبی رشتہ دار محی الدین شاہ کے دو بیٹوں عرفان احمد اور اشفاق احمد کو گورنمنٹ آرڈر ۷۲ NDK مورخہ ۵ مارچ ۱۹۸۰ء مگھر مل باغ سرینگر میں واقع ۴ کنال ۸ مرلہ سرکاری زمین پٹّے پر عطا کی گئی۔

وزیر اعلیٰ کی بڑی بیٹی خالدہ شاہ کے دو بیٹوں ڈاکٹر افتخار احمد شاہ اور مظفر احمد شاہ کو گورنمنٹ آرڈر 77 NDK مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۰ء کی رو سے مگھر مل باغ سرینگر میں

۴ کنال آٹھ مرلہ سرکاری زمین عنایت کی گئی۔

غلام محمد شاہ کے بھائی معراج الدین شاہ کے دو بیٹوں عابد احمد شاہ کو بھی سرکاری زمین میں سے ۴ کنال ۸ مرلے دیئے گئے۔ اس زمین کا پٹہ 99 NDK مورخہ ۳ اپریل ۱۹۸۰ء کو ان کے حوالے کیا گیا۔

صوبہ کشمیر میں لیز کے تحت سرکاری زمین باپ دادا کی ملکیت سمجھ کر ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۲ء تک اپنے عہدے کا ناجائز استعمال کر کے اقربا نوازی اور کنبہ پروری کے تحت اپنے اور اپنے رشتے داروں دوست احباب کو جو دی گئی ایک اندازے کے مطابق ۲ ہزار ۳ سو کنال ۶ مرلہ پر مشتمل ہے۔ اس میں سے وہ ۵۵۳ کنال زمین بھی شامل ہے جو بخشی دور اور کانگریس دور میں لیز پر دی گئی ہے، یہ ساری زمین سرکاری وغیر سرکاری ۹۸۵ لیز ہولڈروں کے پاس ہے۔

محکمہ نزول، محکمہ مال اور محکمہ جنگلات کی زمینوں پر صاحبِ اقتدار و صاحبِ رسوخ افراد نے کچھ اس طرح قبضہ کر لیا گویا یہ ان کی ملکیت اور جاگیر تھی، لگ بھگ تمام دیہات کا چراگاہ کا نام و نشان مٹا دیا گیا، جنگلات پر قبضہ کر کے درخت کاٹنے کی ایسی دوڑ لگ گئی کہ پوچھنے والا بھی کوئی نہ رہا، ریاست کا سبز سونا دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر جنگلات کو تہ و بالا کیا گیا۔

رشوت کے دیگر ذرائع

رشوت کے جتنے ذرائع اوپر بیان کیے گئے ہیں، شیر کشمیر اور ان کے کنبے کے افراد انھیں کافی نہ سمجھتے تھے، اسی لیے ریاست میں تکنیکی تعلیم و تربیت کے پیشہ ورانہ اداروں میں داخلہ کے لیے امیدواروں کا انتخاب بھی دولت کمانے کا ایک ذریعہ بن گیا۔ وزیر اعلیٰ اور ان کے خاندان کے افراد اور دوسرے بارسوخ لوگ داخلوں کے معاملے میں براہِ راست مداخلت کرتے رہے، صورتحال اس حد تک بگڑ چکی ہے کہ ریاست کے میڈیکل کالجوں اور انجینیرنگ کالج میں داخلے کے لیے یکے بعد دیگرے انتخاب کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ ناجائز قرار دے چکی ہے۔

پیشہ ورانہ اداروں میں سیٹوں کی تقسیم کے عوض وزیر اعلیٰ اور اُن کے خاندان کے ممبروں کو بھاری رقوم ملتی ہیں، یہ نشستیں حالات کے مطابق ۵، ہزار سے ایک لاکھ روپے فی سیٹ کے حساب سے "فروخت ہوتی ہیں"، وزیر اعلیٰ امیدواروں کی فہرستوں کی آخری منظوری اسی وقت دیتے ہیں جبکہ اُمیدواروں سے لین دین کا معاملہ طے ہوتا ہے۔

ریاست کی کابینہ کے ارکان اور نیشنل کانفرنس کی ہائی کمان کا جب یہ حال ہو تو ظاہر ہے کہ حکمراں پارٹی کے دوسرے عہدیدار بھی ہاتھ رنگنا چاہیں گے، اس لیے اگر یہ افراد بھی بے دھڑک ہو کر بدعنوانیوں کے دریا میں ڈوب جائیں تو تعجب کی کیا بات ہے۔ پیشہ وارانہ اداروں کے ساتھ ساتھ کاروباری اداروں سے فنڈس کے نام پر رشوت لینا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

اینٹوں کے بھٹوں کے مالک، مل مالک، ٹرانسپورٹر گوشت کوٹھدار دودھ فروش وغیرہ نذرانہ پیش کر کے مال کی قیمت بڑھانے اور کرایہ میں اضافہ کرانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

ہری نواس کی الاٹمنٹ

اقربا پروری کی مثال "ہری نواس" کی الاٹمنٹ میں نمایاں ہے، یہ سرینگر میں ڈل جھیل کے کنارے دو سو ایکڑ زمین کا رقبہ ہے (اس سے متصل اوبرائے پیلس ہوٹل) ہے زمین کا یہ خطہ پہلے مہاراجہ کی ملکیت تھا۔ سرکار نے پچاس لاکھ روپے معاوضہ دے کر اسے "مخصوص عوامی مقصد" کے لیے حاصل کیا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اس مقام پر ایک جدید طرز کا میوزیم تعمیر کیا جائے گا۔ اس کے لیے ایک ماہر تعمیرات کی خدمات حاصل کی گئیں جسے اٹھائیس ہزار روپے کا معاوضہ دیا گیا مگر یہ فیصلہ بعد میں بدل دیا گیا اور فیصلہ ہوا کہ "ہری نواس" کو سیاحتی مرکز بنایا جائے گا چنانچہ سیاحوں کے لیے سستی رہائش گاہ کی سہولیات کا وزیر اعلیٰ نے خود افتتاح بھی کیا۔

قبل اس کے کہ اس رہائش گاہ کی تعمیر کا کام شروع ہو جاتا کمیشن کے ساتھ اقربا پروری کا مسئلہ سامنے آیا چنانچہ دو سو ایکڑ کے اس رقبے کو سرینگر کے متمول چار خاندانوں کے نام طویل مدت کے لیے الاٹ کر دیا گیا، جن لوگوں کو یہ الاٹمنٹ ہوئی ان کی شہرت کشمیر میں انکم ٹیکس محکمے کے چھاپے پڑنے کی وجہ سے بہت ہو چکی ہے محکمۂ انکم ٹیکس نے چھاپوں کے دوران پانچ کروڑ سے زیادہ کی ٹیکس چوری کا پتہ لگایا۔ حالانکہ چھاپہ جس مقصد کے لیے ڈالا گیا تھا وہ مقصد حاصل نہ ہو سکا۔

اس الاٹمنٹ کے لیے قواعد کے مطابق نہ تو کوئی ٹینڈر طلب کیے گئے اور نہ ان کی نیلامی کی گئی، وجہ صاف ظاہر ہے ان میں سے ایک خاندان میں شیخ صاحب کی صاحبزادی بیاہی ہوئی

ہیں۔ متو خاندان کے علاوہ دوسرے تین خاندانوں کے بارے میں وزیر اعلیٰ نے انکم ٹیکس کے چھاپوں کے فوراً بعد یہ دعویٰ کیا کہ یہ لوگ ان کے قریبی حمایتی اور حکمراں جماعت کے زبردست حامی ہیں۔

ریاستی اسمبلی میں پُرزور مطالبہ ہونے کے باوجود حکومت نے اس الاٹمنٹ کی تفصیلات اور شرائط ظاہر کرنے سے گریز کیا۔ اور یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیا کہ اس کا انکشاف پبلک کے مفاد میں نہیں ہے۔

ہری نواس پلاٹ کی مالیت ۲۵ کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہے مگر اسے کوڑیوں کے دام پر وزیر اعلیٰ کے رشتے داروں اور حمایتیوں میں معقول کمیشن پر تقسیم کیا گیا اور قومی ملکیت کو اپنے عہدے کے ناجائز استعمال سے اقربا میں تقسیم کر کے سرکاری خزانے کو بے انتہا نقصان پہنچایا گیا۔

جن لوگوں پر عنایات کی یہ بارش ہوئی ان میں ایک تو وزیر اعلیٰ کے سمدھی ہیں علاوہ ان کے ایم۔ اے رمضانا، شاہ سنز اور عبداللہ جو شامل ہیں۔

سرینگر کا نیڈوز ہوٹل

نیڈوز ہوٹل یوں تو شیخ محمد عبداللہ کے سسرال والوں کا ہے، جو سرکار سے پٹہ پر لیا گیا ہے ہوٹل کا پٹہ یکم جون ۱۹۸۰ء کو قبل از وقت ہی نوّے سال کے لیے بڑھایا گیا۔ (ملاحظہ ہو گورنمنٹ آرڈر نمبر NDK 387 مورخہ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۸۰ء) ہوٹل کی زمین کا رقبہ ۱۵ ایکڑ کے لگ بھگ ہے، قاعدے کے مطابق اس تاریخ سے پیشتر پٹے کی معیاد بڑھائی نہ جا سکتی تھی۔ یاد رہے کہ اس پلاٹ کی قیمت ڈھائی کروڑ کے قریب ہے، ظاہر ہے کہ پٹے کی معیاد قبل از وقت بڑھانے میں شیخ صاحب نے کسی قاعدے اور قانون کی پرواہ نہیں کی، پرانے قاعدوں کے مطابق نئے پٹے کی معیاد چالیس سال سے زیادہ نہیں بڑھائی جا سکتی مگر معاملہ جب شیخ صاحب کا ہو تو قاعدوں کو کون پوچھے۔

حد تو یہ ہے کہ سرکار کا آٹھ لاکھ سے زیادہ روپیہ نیڈوز ہوٹل کی طرف بطور کرایہ بھی واجب الادا تھا اگر کوئی اور ادارہ ہوتا تو اس کا پٹہ اسی وجہ سے منسوخ کر دیا جاتا، لیکن منسوخ کرنے کے بجائے اس کا پٹہ نوّے سال تک بڑھایا گیا۔

شیخ عبداللہ کے سسرال والوں کے پاس گلمرگ کا ہوٹل "ہائی لینڈ پارک" بھی ہے، اس کا پٹہ بھی کابینہ کے فیصلے کے مطابق آرڈر نمبر U.D. 673 مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو چالیس برس تک بڑھایا گیا، پٹے کے حکم نامے کو غور سے دیکھنے پر یہ حقیقت بھی کھلتی ہے کہ اس جائیداد پر شیخ صاحب کے سسرال والے ۱۹۶۱ء سے غیر قانونی طور پر قابض تھے، اب اس قبضہ کو شیخ صاحب کے طفیل باضابطہ بنا دیا گیا۔

شیخ عبداللہ اور ان کے جانشین شیخ فاروق کے دیگر کئی اہم اسکینڈل میں نیڈوز ہوٹل کا اسکینڈل ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، نیڈوز ہوٹل کی بدولت شیخ خاندان کے لیے کرپشن اور دھاندلی کا جو ذریعہ مرکزی سرکار نے رکھ دیا ہے وہ اس خاندان کی نبض کو دیکھ کر ہی رکھ دیا گیا ہے۔

۱۹۷۵ء کے ایکارڈ پر جب شیخ عبداللہ مسز اندرا گاندھی کی طرف سے ایکارڈ کی تفاصیل پارلیمنٹ میں بیان کرنے پر روٹھ گئے تھے اور حلف لینے کی تقریب میں شامل ہونے سے منکر ہو گئے تھے تو مسز اندرا گاندھی کے ساتھ جب گورنر ایل کے جھا نے اس سلسلے میں ٹیلیفون پر گفتگو کی تو مسز اندرا گاندھی نے گورنر کو بتایا تھا کہ سید میر قاسم کو کہا جائے کہ وہ CONTINEVE کریں اور جیسا کہ میں نے نیڈوز ہوٹل کے بارے میں کہا ہے اس پر اسمبلی کے اگلے سیشن میں عمل کیا جائے۔

نیڈوز ہوٹل کی لیز ۱۹۸۰ء میں ختم ہو رہی تھی اور شیخ صاحب کے سامنے یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ اگر وہ "ایکارڈ" کے تحت حکومت نہیں سنبھالیں گے تو کانگریس وزارت نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ نیڈوز ہوٹل کی لیز نہیں بڑھائی جائے گی بلکہ اسے سرکار کی طرف سے نیلام پر چڑھایا جائے گا۔ چونکہ اس طرح شیخ خاندان سے ایک بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا لہذا وہ حلفِ وفاداری کی تقریب میں شامل ہونے کے لیے راضی ہو گئے۔

آئینگر کمیشن نے بخشی غلام محمد پر جتنے بھی الزامات لگائے ان میں ایک یہ الزام بھی تھا کہ انہوں نے اپنی سرکاری پوزیشن کا استعمال کر کے اپنی بہو کو فائدہ پہنچانے کے لیے نیڈوز ہوٹل کی دس سالہ لیز کرنل غلام قادر کے نام منتقل کر کے اس لیز کو بیس سال تک بڑھا دیا تھا۔

فروری ۱۹۷۵ء میں شیخ صاحب نے عنانِ اقتدار سنبھالی تو اس وقت عمارت کے کرایہ کے علاوہ مرمّت اور سینٹری فٹنگ پر خرچ کی گئی رقومات کے عنوانات کے تحت نیڈوز ہوٹل کے نام

پر ۵۲ ہزار روپے سے زائد رقم بقایا تھی، شیخ صاحب کی حکومت نے نیڈوز ہوٹل کے نام بقایا رقومات وصول کرنے کے بجائے ۱۹۸۰ء میں ختم ہونے والی لیز کو نوّے سال کے لیے کرنل غلام قادر کی بیوہ سلیمہ نیڈوز کے نام منظور کی، اس نئی لیز کا سب سے دلچسپ اور قابلِ اعتراض پہلو یہ ہے کہ ریاستی حکومت نے اوبرائے ہوٹل کے مالکوں کے ساتھ گفت و شنید اور مفاہمت کی بنیاد پر انہیں مسز سلیمہ نیڈو کو نوے سال کے لیے دی گئی لیز کا ساجھے دار بھی بنایا اور ان سے ہوٹل کے تعمیر نو کے لیے سرکاری قرضہ فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ اوبرائے اور نیڈوز کے مالکان کے درمیان اس معاہدے کے عوض ریاستی حکومت نے اوبرائے پیلس کے قریب سرکاری زمین پر مالکان اوبرائے ہوٹل کو ایک ملحقہ عمارت تعمیر کرنے کی اجازت بھی دی۔ قانون اور ضابطے کی رُو سے بیک وقت بیس سال کی لیز یقیناً ناپسندیدہ تھی لیکن اپنے برادرِ نسبتی کی بیوہ کو مزید فائدہ پہنچانے کے لیے اور اوبرائے ہوٹل کے سرمایہ داروں کو ناجائز مراعات دینے کے لیے شیخ عبداللہ نے کچھ اور اقدامات بھی کیے اوبرائے ہوٹل کے مالکوں اور سلیمہ نیڈو کو نیڈوز عمارت گرا کر اس جگہ نئی عالیشان عمارت تعمیر کرنے کی منظوری دینے کے ساتھ یہ شرط رکھی کہ موجودہ عمارت گرانے کے لیے ریاستی حکومت کو عمارت کی قیمت کا ایک حصّہ بطور عوضانہ ادا کیا جائے۔ مسز سلیمہ نیڈو نے اس سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ نوّے سال کے بعد جب موجودہ لیز ختم ہو جائے گی تو نئی تعمیر شدہ عمارت حکومت کو بغیر کسی معاوضے کے منتقل کی جائے گی، حکومت نے بغیر کسی تامّل و اعتراض کے یہ تجویز منظور کی اس کے بعد سلیمہ نیڈو اور شری موہن سنگھ اوبرائے نے شیخ صاحب کی خفیہ ہدایت پر چیف سکریٹری سے مل کر یہ مطالبہ کیا چونکہ نیڈوز ہوٹل کی جگہ نئے ہوٹل کی تعمیر کرنے میں ڈیڑھ کروڑ روپے سے زیادہ خرچ آنے کا اندازہ ہے اور وہ اتنا بوجھ برداشت کرنے کا اہل نہیں، اس لیے انہیں ریاستی حکومت اور مختلف مالی اداروں سے حاصل کیے جانے والے قرضوں پر نو فیصدی شرح سود پر چار فیصدی کی سبسڈی دی جائے۔ یعنی قرضہ کوئی اور لے اور دے کوئی اور۔ البتہ ایک سرمایہ دار رشتہ دار کو چار فیصد سبسڈی خزانۂ عامرہ ادا کرے، سبسڈی ادا کرنے کی کیا انوکھی مثال ہے؟ ان حالات میں جبکہ اگر کسی غریب کی جھونپڑی آگ میں جل جائے تو اسے امداد کی بات تو الگ رہی قرضہ نہیں ملتا اور یہاں قرضہ پر سبسڈی، قرضہ جات پر حکمرانوں نے چار فیصد رعایت کی منظوری دے کر اپنی سسرال والوں کو سرکاری خزانہ لوٹنے کا جو اختیار دے دیا وہ اقربا پروری کی ایک ایسی

مثال ہے جو لا مثال ہے۔ نیڈوز ہوٹل کے مالکان نے ریاست سے باہر ایک بڑے سرمایہ دار کو فائیو سٹار ہوٹل تعمیر کرنے کے لیے اس جائیداد کو سبلیٹ کر دیا لیکن یہ سودا بعد میں طے نہ ہو سکا، کیونکہ غلام محمد شاہ کی حکومت اور گورنر راج میں اس سبلیٹ کے معاملے کو قانونی ہئیت دینے میں یہ لوگ ناکام رہے۔ البتہ فاروق سرکار نے دوبارہ اقتدار میں آتے ہی پُراسرار طریقے پر اس کو قانونی شکل دے کر ۸ راپریل کو اس ہوٹل کا سالانہ کرایہ ۵۲ ہزار روپے مقرر کر دیا۔

اتنا کرایہ مقرر کرنے کے بعد مالکان نیڈوز ہوٹل نے اس جائیداد کو ۹۵ سال کے لیے "انڈیا ٹمباکو کمپنی" کو سالانہ ۱۴ لاکھ روپے کرایہ پر دے دیا۔ اب اسے علیٹی برادرز کو تفویض کیا گیا ہے اس طرح ۵۲ ہزار روپے سالانہ کرایہ پر لینے والے ہوٹل کو ۱۴ لاکھ روپے سالانہ کے کرایہ پر دیا گیا اور ۱۹۸۰ء سے توثیق شدہ آرڈر کے مطابق فاروق عبداللہ نے ۱۹۸۲ء میں سلیمہ نیڈو کو یکمشت ۱۲ کروڑ ۴۱ لاکھ روپے کا فائدہ پہنچایا اور سالانہ منافع ساڑھے ۱۳ لاکھ بھی فراہم کرایا ہے۔

شیخ عبداللہ کے خاندان کا کرشمہ دیکھیے جس نیڈوز ہوٹل کا کرایہ وہ سالانہ ۵۲ ہزار روپے ادا کرتے ہیں اس ہوٹل سے یہ سالانہ ۱۴ لاکھ وصول کرتے ہیں۔

یہ بدعنوانی اور دھاندلی کا ایک ایسا کرشمہ ہے جس کا اندازہ کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس خاندان کے دورِ حکومت میں دھاندلی، کنبہ پروری، رشوت خوری اور لوٹ کھسوٹ کا کاروبار اس قدر وسعت اختیار کر چکا کہ سب کی تفصیلات جاننے کے لیے سراغرسانی کا ادارہ چاہیئے مگر یہ تو نہ ہی بتانے کے لیے کافی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں حکمران پارٹی کے رہنماؤں میں دولت حاصل کرنے کی ہوس اور اخلاق کی پستی کس حد تک پہنچ چکی ہے۔ ناجائز طریقوں سے دولت کمانے کی اس قدر گراوٹ۔ اُف توبہ۔ حکومت کی ساری مشینری اور تنظیم کے چھوٹے بڑے عہدیدار ناجائز طریقوں سے دولت کمانے پیشہ ورانہ اداروں میں نشستیں دلانے، سرکاری ملازمت دلانے، سرکاری زمین کی بندربانٹ جنگلات کو لوٹنے، ٹھیکہ داروں سے کمیشن اور کارخانہ داروں سے فنڈز لینے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں اس طرح منڈلانے لگے جس طرح گدھ اور چیلیں مُردہ جانور پر منڈلاتی ہیں۔ لگتا ہے منڈلانے والوں کو بھوک ہے۔ بھوک اور سخت بھوک۔!!!

سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ لیڈرانِ قوم ان کا خاندان کابینہ کے ارکان پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران اور دیگر عہدیداران میں لوٹ، کھسوٹ، کنبہ پروری، رشوت خوری، بدعنوانی اور دھاندلی کی تفصیلات سننے اور سُن کر آنکھیں موند لینے کا چلن اس دورِ حکمرانی میں ایسا عام ہوا گویا ان کی ایمانداری ان کی پاکبازی اور ان کے نیک کارناموں کے تعریفیں ہو رہی ہوں۔

اندازہ کیجیے اگر کسی عادی چور اور ملزم کو اس کے سامنے کہا جائے تم چور اور ملزم ہو تو اس کے چہرے کا رنگ ضرور تبدیل ہو گا اور شرمندگی و ندامت کے آثار ضرور نمایاں ہوں گے، لیکن ہمارے حکمران اور چھوٹے بڑے عہدیداران ان پر لگائے گئے الزامات پر وہ بالکل شرمندہ نہیں ہوتے ۔۔۔ اب تو حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ اگر کسی سورس کسی میڈیا، یا اخبار سے ان کی چوری اور سینہ زوری کے واقعہ کسی روز منظرِ عام پر نہیں آتے تو انہیں ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے اور انہیں لگتا ہے گویا ان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ اُن کا کوئی غمخوار نہیں۔



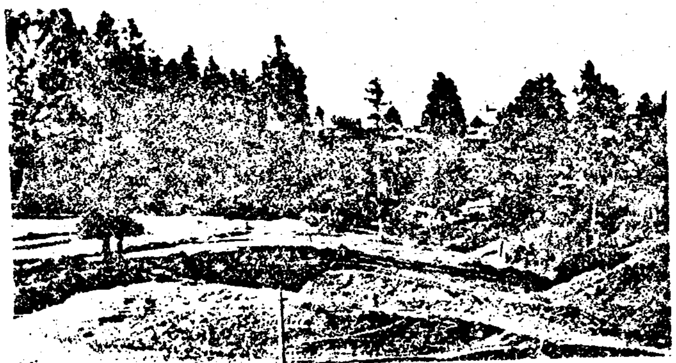
گپکر روڈ پر دو عالی شان مکانات (دائیں) فاروق عبداللہ (بائیں) ثریا متو



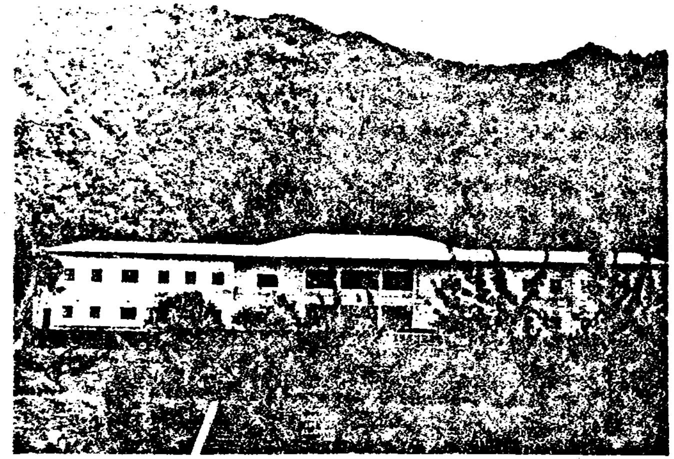
شیخ محمد عبداللہ کی نئی حاصل کی ہوئی سرکاری جائداد (دھانجی بھائی بلڈنگ) واقع بندھ - سرینگر



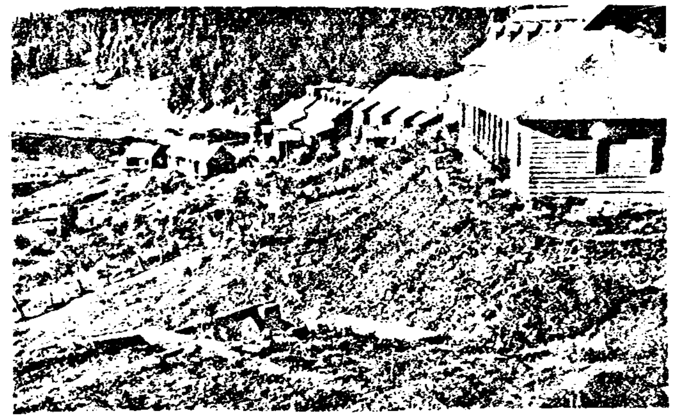
ہائی لینڈ پارک گلمرگ میں باجی نیڈوز کے ذریعہ بنائی جانے والی غیر منظور شدہ بلڈنگ



گلمرگ ہائی لینڈ پارک میں شیخ صاحب کا فارم جو مسلسل بڑھتا اور پھیلتا چلا رہا ہے



ہری نواس بلڈنگ جو سابق حکومت نے عوامی سہولیات کے لئے حاصل کی تھی۔ اس کو نوجوانوں کے کھیل
اور سیاحوں کا سستا مرکز بنانے کے بجائے شیخ عبداللہ کے نزدیکی رشتہ داروں نے لمبی لمبی لیز پر حاصل کر لیا ہے



باجی بینڈ وزکا بائی لینڈ پارک ہوٹل کے شمال میں سرکاری زمین اور عمارات پر ناجائز اور غیر قانونی قبضہ۔ اس میں جموں و کشمیر
گورنمنٹ ٹورزم ڈپارٹمنٹ کی طرف سے ۱۹۷۲ء میں بنائے گئے تین چوکیداروں کے مکانات بھی شامل ہیں۔

آس کی کشتی دریا میں ہچکولے کھاتی پڑی رہی
جوشِ جنوں میں موج اُٹھی تو سارے کنارے کاٹ گئی

نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ پر اپوزیشن کی یلغار

حسبِ معمول مزارِ شہداء پر ۱۳ر جولائی ۱۹۸۰ء کو جو تقریر شیخ عبداللہ نے کی وہ کچھ تلخ اور کچھ تیز تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے یہ بات زور دیکر فرمائی:۔



"شریمتی اندرا گاندھی ہوں یا جنرل ضیاءالحق
کشمیریوں کو دوبارہ غلام بنانے کی
اجازت نہیں دی جائے گی"



انہوں نے مزید فرمایا:۔

"آج کشمیر کا ہر نوجوان شیر کشمیر ہے، کسی کو اب غلام بنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، خواہ یہ کوشش پاکستان کے جنرل ضیاء کی طرف سے ہو یا ہندوستان کی شریمتی اندرا گاندھی کی طرف سے ۔۔۔ جب تک ہماری رگوں میں خون کا آخری قطرہ موجود ہے ہم کسی کو اپنی آزادی سلب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، وہ زمانہ گیا جب خلیل خاں فاختہ مارا کرتا تھا۔

کشمیر کے نوجوان اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کے لیے پوری طرح

تیار ہیں، ہم موت سے نہیں ڈرتے موت ہر ایک کو آتی ہے، مسلمان موت سے نہیں گھبراتا۔ یہاں کے لوگ اب کسی کو اپنی آزادی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتے، آج کل کچھ لوگ جو ٹکوں کے عوض بک چکے ہیں۔ کشمیری عوام کو پھر سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دینا چاہتے ہیں، ایسے لوگوں کو عوام نے پہلے ہی مسترد کر دیا ہے، یہ لوگ اب اس امید پر جی رہے ہیں کہ شیخ عبداللہ جب زندگی کی آخری سانس لے گا تو وہ عوام پر سوار ہو جائیں گے ان لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ کشمیر کا ایک ایک بچہ (شیر کشمیر کا اپنا ایک بچہ) اب شیر بن گیا ہے۔ ہم اپنے مقصد (یعنی خاندانی راج) پر چٹان کی طرح کھڑے ہیں، اگر ہماری عزت و آزادی (اقتدار) پر کوئی حملہ کرنے کی کوشش کی گئی تو ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے، نیشنل کانفرنس وہ جماعت ہے جس نے کشمیری عوام کو آزادی دلانے میں ایک تاریخی رول ادا کیا۔"

اس تقریر کے مشتہر ہوتے ہی جب اس کی رپورٹنگ مرکزی سرکار کو مل گئی تو شیخ صاحب کو دہلی طلب کیا گیا۔ ۲۰ر جولائی کو شیخ صاحب سرینگر سے دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔

دہلی پہنچ کر شیخ صاحب سیدھے وزیر اعظم کے دفتر میں حاضر ہوئے، لیکن دیر تک وزیر اعظم نے وزیر اعلیٰ کو شرفِ ملاقات سے محروم رکھا۔ گھنٹوں ویٹنگ روم میں اکتانے کے بعد شیخ صاحب کشمیر ہاؤس آئے تو شام کو انھوں نے وزیر اعظم کی کوٹھی پر حاضری دی لیکن یہاں بھی انہیں ملاقات کا موقع نہیں دیا گیا، ان سے وزیر داخلہ سے ملنے کو کہا گیا۔

۲۱ر جولائی کو سویرے شیخ صاحب پھر اندرا جی کی کوٹھی پر حاضر ہوئے تو اس وقت انہیں ملاقات کا موقع تو دیا گیا لیکن ایسی جھاڑ پلائی گئی کہ شیخ صاحب سکتہ میں آگئے۔ وزیر اعظم نے ان سے کہا:

"آپ استعفیٰ دیکر اپوزیشن میں بیٹھ جایئے، ایسا شخص ہماری کسی ریاست کا وزیر اعلیٰ نہیں ہو سکتا جو وزیر اعظم کو چیلنج کر سکے۔

شیرِ کشمیر ۲۲ر جولائی کو دہلی سے واپس آئے تو ہوائی اڈے پر اُن کا استقبال کرنیوالوں نے اُن کا پژمردہ چہرہ دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

کوٹھی پر آکر شیخ صاحب نے فیملی ممبران کے ساتھ اسٹاف ممبران اور نیشنل کانفرنس کے بعض عہدیداران سے کہا۔ "اندرا جی نے مجھ سے وزارت سے مستعفی ہونے کو کہا، وہ عورت نہیں ڈائن ہے، وہ مجھے کھا جائے گی۔

۲۳ر جولائی کو انھوں نے پریس کانفرنس طلب کی اور واضح الفاظ میں فرمایا:

"کشمیر ہندوستان کا ایک ناقابلِ تنسیخ حصّہ ہے، ۱۹۴۷ء میں جب کشمیر پر پاکستان نے جارحانہ حملہ کیا تو ہم نے رضاکارانہ طور پر ہندوستان کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ دیا۔ کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ کسی دباؤ کے تحت الحاق نہیں کیا بلکہ سیاسی اور نظریاتی بنیاد پر الحاق کیا گیا، یہ بات قابلِ فہم تھی کہ کشمیری عوام کی پشت پر فرقہ وارانہ بنیاد پر ہم آہنگی کی شاندار روایت تھی، ہم پاکستان کے ساتھ کیسے رشتہ جوڑ دیتے جبکہ اس کی بنیاد دو قومی نظریے پر تھی۔

۱۳ر جولائی کو میں نے مزارِ شہداء پر جو تقریر کی یہ ایک جذباتی تقریر تھی ۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کشمیری عوام کے لیے ایک بہت ہی اہم دن ہے کیونکہ اسی دن ۱۸۴۶ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے گلاب سنگھ کو ۷۵ لاکھ روپے میں کشمیر کو فروخت کیا تھا۔ میری تقریر کو پریس نے ان سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ہندوستان کے تئیں ہمارے رویے میں تبدیلی آگئی ہے یہ بالکل غلط ہے، ہم ہندوستان کے سوا کسی اور جگہ کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے قوم دشمن عناصر کو جو وارننگ دی وہ صرف کشمیر کے لیے نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے لیے تھی کیونکہ کشمیر کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ ۱۳ر جولائی کی تقریر جو میں نے مزارِ شہداء پر کی اسے پریس نے غلط انداز میں پیش کیا۔"

۲۳ر جولائی کو وزیر اعلیٰ نے یہ سب کچھ ان مقامی پریس نمائندوں کے سامنے بیان کیا جنہوں نے ۱۳ر جولائی کو مزارِ شہداء پر ان کی تقریر لفظ بہ لفظ سن کر نوٹ کر لی تھی۔ مزارِ شہداء پر وزیر اعلیٰ نے اپنی تقریر میں پاکستان کے ساتھ ہندوستان کو بھی چیلنج دیا تھا اور

کشمیر کی آزادی کا اعادہ کیا تھا، صرف دس دنوں کے بعد وزیر اعلیٰ نے ان پریس نمائندوں پر غلط بیانی کا الزام لگا کر اپنے آپ کو بری کر دیا۔ ان پریس نمائندوں میں اتنی بھی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ اپنے اخبارات میں شائع شدہ رپورٹ کو صحیح ثابت کر کے ان کی دوغلی پالیسی کو اُجاگر کرتے۔

کشمیری عوام کی یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ یہی پریس نمائندے عوام کو جاہل، تنگ نظر عقیدت کے اندھے اور ناسمجھ جیسے القاب سے نوازتے ہیں اور جب ان کی سمجھ داری، صحافتی دیانت داری اور ان کی دانشوری کا امتحان ہوتا ہے اس وقت یہ بھیگی بلی بن جاتے ہیں محض اس لیے کہ محکمہ انفارمیشن سے اشتہارات ملتے رہیں۔ اس طرح مقامی پریس اپنے مفاد کے لیے جو مشترکہ مقاصد میں بھی آنکھیں موند لیتے آئے ہیں اس سے وہ ہرگز اُن ذمہ داریوں سے بچ نہیں سکیں گے جو ایک قوم کے تئیں پریس پر عائد ہوتی ہے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ پریس کے لیے سرکار کے اشتہارات معصوم بچے کے لیے شیر مادر کے برابر ہے، لیکن ان اشتہارات کی آڑ میں جب پریس کو اپنی اُن غلطیوں کا ذمہ دار گردانا جائے جو قومی نوعیت کی غلطیاں ہوں اور جن غلطیوں کے ساتھ قوم کا مستقبل وابستہ ہو، ان غلطیوں کو اپنے مفاد کے لیے اپنے سر لینا بددیانتی سے ہرگز کم نہیں۔ ریاست جموں وکشمیر میں یہاں کے سیاستدانوں نے جو ناگفتہ بہ حالت بنا دی ہے، جو انتشار اور پراگندگی پیدا کر دی ان کے بارے میں چشم پوشی سے کام لے کر مقامی پریس نے جو رول ادا کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اگر مقامی پریس نے رہنمایانِ قوم کی صرف دس دنوں کی اس تضاد بیانی پر سرکاری اشتہارات سے بالاتر ہو کر وزیر اعلیٰ سے اس تضاد بیانی، اس دوغلی پالیسی اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کی بازپرس کی ہوتی اور عوام کو ان کے ظاہر اور باطن سے خبردار کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہوتا تو ریاستی عوام ہرگز اس قدر استحصال کا شکار نہیں ہو جاتے جس قدر وہ حکمرانوں کے ہاتھوں ہوئے ایک عام شہری جس نے مزارِ شہدا پر وزیر اعلیٰ کی تقریر بھی سنی اور پھر پریس کانفرنس میں ان کا بیان بھی پڑھا، اور بھول گیا۔ ایک عام دیہاتی جس نے مزارِ شہدا پر نہ حاکمِ اعلیٰ کی تقریر سنی اور نہ ہی پریس کانفرنس میں اس کا توڑ دیکھا۔ ان عام شہریوں، دیہاتیوں اور ہمارے صحافیوں میں کیا فرق رہتا ہے، جب وہ بھی اس تضاد کا کوئی اثر قبول نہ کریں۔ اگر کریں بھی تو اسے مصلحت کی نذر کر دیں۔

شیخ صاحب نے مزارِ شہدا پر اپنی تقریر کو غلط طریقے سے پیش کرنے کا پریس پر الزام لگایا لیکن مرکزی سرکار خاص طور پر مسز اندرا گاندھی کے نزدیک وہ بالکل صاف نہیں ہو سکے۔ اگر مسز اندرا گاندھی کو شیخ صاحب کے ہاتھوں دفعہ ۳۷۰ کو ختم کرانے کا مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ انھیں ضرور شنٹ اوٹ کرتی اس کے باوجود بھی مرکزی حکمراں ریاستی سرکار کو کمزور کرنے میں پیش پیش رہے۔



(مفتی محمد سعید) — (غلام رسول کار)

مرکزی سرکار کی شہ پر پردیش کانگریس کے عہدیداروں نے شیخ صاحب اور ان کے خاندانی راج کے خلاف ایک مہم چلائی۔

مفتی محمد سعید اور غلام رسول کار نے اقبال پارک میں کانگریس ریلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"..... موجودہ سرکار عوام کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب کشمیر ایکارڈ ہوا تو ہم نے اس مقصد سے حکومت شیخ صاحب کے حوالہ کی تھی کہ ریاست میں سیاسی استحکام پیدا ہوگا۔ ایڈمنسٹریشن ٹھیک ہو جائے گا، غریبی اور بیروزگاری کا جلد از جلد خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ حکومت نکمّی ثابت ہوئی ہے عوام کے مسائل اور مشکلات میں اضافہ ہوا ہے اگر یہ صورتِ حال اسی طرح رہنے دی گئی تو حالات بہت جلد خراب ہو جائیں گے اور یہ سب ہوتے دیکھ کر ہم خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتے۔ آج کل رشوت ستانی کا بازار گرم ہے، کنبہ پروری زوروں پر ہے، یہ لوگ صرف اپنے مفادات کی تکمیل میں لگے ہیں۔

پچھلے سات برسوں میں ریاست کے لیڈروں نے اپنے لیے بڑی بڑی بلڈنگیں بنائی ہیں۔ جائیدادیں بنائی ہیں، سب لوگ جانتے ہیں شہر میں جہاں کہیں نزول کی زمین خالی تھی وہ حکمراں جماعت نے بندر بانٹ کر کے حاصل کر لی۔ لاء اینڈ آرڈر کا یہ حال ہے کہ ۱۹۷۵ء سے پہلے ۲۲ برسوں میں پولیس کی گولیوں

سے اتنے لوگ نہیں مرے جتنے کہ پچھلے سات برسوں میں مارے گئے۔ رولنگ پارٹی جان بوجھ کر ریاست میں فرقہ وارانہ فضا خراب کر رہی ہے۔"

۲۲ مئی ۱۹۸۱ء کو اسرائیلی حکومت نے مسجد اقصیٰ کو یہودی عبادت گاہ میں تبدیل کیا۔ اس کارروائی پر وادی بھر میں احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ سرینگر میں تعلیمی اداروں، کالجوں، اسکولوں اور یونیورسٹی کے طلباء و طالبات نے پروٹسٹ کیا۔ پولیس کی مداخلت سے یہ پُرامن پروٹسٹ تشدد میں بدل گیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر سرینگر فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔

دوکانوں کو بند کیا گیا، گاڑیوں پر پتھراؤ ہوا، لاٹھی چارج اور ٹیئر گیس کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ کئی جوانوں اور طالب علموں کو گرفتار کیا گیا۔ سرینگر کے دو گرجا گھروں کو سخت نقصان پہنچایا گیا۔

سرینگر کے ساتھ ساتھ یہ فسادات دیہات اور قصبہ جات میں بھی پھیل گئے۔

اگرچہ فسادات مسجدِ ابراہیمیؑ کے واقعہ سے شروع ہوئے تھے، لیکن یہ ریاستی حکومت کے خلاف رُخ اختیار کر گئے۔ سرینگر، سوپور اور اسلام آباد میں حکمرانوں کے پتلے جلائے گئے، ان فسادات نے نیشنل کانفرنس اور کانگریس آئی کی محاذ آرائی کو وقتی طور پر روک دیا البتہ جب مسجد ابراہیمیؑ کے واقعہ کو ماضی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو کانگریس نے حکومت کے خلاف اپنی سرگرمی پھر تیز کر دی۔

اس سرگرمی کو دیکھ کر پارلیمنٹ ممبر ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنی خدمات پیش کیں تاکہ دونوں پارٹیوں میں صلح ہو سکے، چونکہ اس کی نان دہلی پر ٹوٹتی تھی اس لیے فاروق عبداللہ نے بتایا کہ "محاذ آرائی صرف اسی صورت میں ختم ہو سکتی ہے، جب شریمتی اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ کے درمیان ملاقات ہو اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے میں شریمتی اندرا گاندھی سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایک مختصر "چھٹی" منانے کے لیے اپنے آبائی وطن تشریف لائیں اور کشمیر کے ٹھنڈے موسم میں سیاسی ماحول کو بھی ٹھنڈا کریں۔ اس قسم کی محاذ آرائی کو قومی مفاد (ذاتی مفاد) کے پیشِ نظر حل کرنا ہوگا، وہ ریاست اور مرکز کے درمیان مفاہمت کے لیے کوشاں ہیں، نیشنل کانفرنس کے منتخب صدر کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے کہ میں اس بات کو یقینی بناؤں کہ مرکز اور ریاست کے مابین خوشگوار تعلقات بنے رہیں۔

میری کوشش یہی رہے گی کہ میں اس خلیج کو پُر کروں جو مفاد پرست افراد نے پیدا کی ہے۔ ہندوستان کے ساتھ ریاست کا الحاق ناقابلِ تنسیخ اور حتمی ہے اور ہر شخص کو یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیئے۔"

۲۸ مئی کو ڈاکٹر فاروق وزیر اعلیٰ کا ایک خط لے کر اندرا جی کو منانے دہلی گئے۔ پردیش کانگریس کے صدر مفتی محمد سعید نے ڈاکٹر فاروق کے جواب میں بتایا۔

"شیخ صاحب کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا ہم نے ایک سمجھوتہ کا بُرا حال دیکھا ہے، کانگریس آئی نے اپنا تاریخی رول ادا کرنے کا تہیہ کر لیا ہے یہ واحد پارٹی ہے جو ریاست کی تینوں خطوں کے درمیان اتحاد کو یقینی بنا سکتی ہے اور قومی یک جہتی برقرار رکھ سکتی ہے، کانگریس آئی کورپشن انتظامی بے ضابطگیوں غنڈہ گردی اور خاندانی راج کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھے گی۔

شیخ صاحب طے شدہ مسائل کو اُٹھا کر ایک فرقہ کو دوسرے فرقے کے خلاف اُکسا کر صورت حال کو مکمل طور پر فرقہ وارانہ رنگ دے رہے ہیں شیخ صاحب کانگریس پر مورتی چوری کا الزام لگا کر اپنی غیر ذمّہ داری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ شیخ صاحب کو یہ الزامات ثابت کرنے چاہئیں ورنہ ان کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانا چاہیئے۔"

یکم جولائی کو "انقلابی نیشنل کانفرنس کی طرف سے اقبال پارک میں جلسہ ہوا، بیگ صاحب نے جلسہ سے خطاب فرمایا:

"جب شیخ صاحب اقتدار میں نہیں تھے وہ ۱۹۵۳ء کے بعد نافذ کیے گئے قوانین ختم کرنے پر زور دے رہے تھے، جب میری مہربانی سے ان کو اقتدار مل گیا تو وہ یہ قوانین بھول گئے، حالانکہ اسمبلی میں پارٹی کو اکثریت حاصل تھی۔ شیخ صاحب کی بے اصولی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ عبدالغنی لون نے صدرِ ریاست اور وزیر اعظم کے ناموں کی بحالی سے متعلق بل اسمبلی میں پیش کیا۔ نیشنل کانفرنس والوں نے اس بل کو نہ صرف ابتدائی مرحلہ میں ہی مسترد کر دیا بلکہ عبدالغنی لون پر حملہ کیا گیا۔

موجودہ حکومت تمام محاذوں پر ناکام ہوئی ہے، آج کرپشن، کنبہ پروری اور لوٹ کھسوٹ کا بول بالا ہے۔ وہ وقت قریب آرہا ہے جب ان حکمرانوں کو ان کی دھاندلیوں، بے ایمانیوں اور لوٹ کھسوٹ کے لیے عوامی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ میرے پاس سارا ریکارڈ موجود ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جن لوگوں کو شیخ صاحب گندی نالے کے کیڑے کہتے تھے وہی کیڑے آج شیخ صاحب سے حساب مانگ رہے ہیں۔"

۱۰ رجولائی کو کانگریس کے جنرل سکریٹری راجیو گاندھی وادی کے دورے پر آئے۔ اقبال پارک میں انھوں نے کانگریس ریلی سے خطاب کیا، انھوں نے ریاست میں کانگریس کے رول پر روشنی ڈالتے ہوئے نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کی دھاندلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔



(راجیو گاندھی)

"ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ نیشنل کانفرنس کی جیب کتنی بڑی ہے، دہلی سے عوام کے لیے جو دولت یہاں آتی ہے وہ ان کی جیب میں چلی جاتی ہے، جس کی وجہ سے کشمیر میں ترقی کی رفتار رُک گئی ہے۔"

اسی روز شام کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ راجیو گاندھی سے ملاقات کے دوران انھیں اس بات کا یقین دلایا کہ نیشنل کانفرنس کانگریس کو اپنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ ہم کسی بھی صورت میں محاذ آرائی کے حق میں نہیں ہیں۔ فاروق عبداللہ نے راجیو گاندھی کو شیخ صاحب سے ملنے کی دعوت دی جو انھوں نے مسترد کی۔ البتہ اندرا گاندھی کے نام شیخ صاحب کا خط لینے میں انھوں نے کوئی عذر نہیں کیا۔

اقبال پارک میں "انقلابی نیشنل کانفرنس" کے عوامی جلسے کے بعد جب یہ پارٹی عوام میں خاص کوئی ساکھ قائم نہ کرسکی تو اس کے صدر ایک طرح سے بددل ہوگئے۔

رفتہ رفتہ بیگ صاحب کی صحت گرنے لگی۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے محبوب بیگ کو اپنانا شروع کیا۔ محبوب بیگ نے کیبنٹ میں لیے جانے کے لالچ میں فاروق عبداللہ کی ہدایت پر اپنے والد مرزا محمد افضل بیگ کی اہم دستاویزات کو ضائع کروادیا تاکہ بیگ صاحب ایسا گل نہ کھلاسکیں جو نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کی رسوائی کا باعث بن سکے کیونکہ انھیں معلوم

تھا بیگ صاحب کے پاس رازدار دستاویزات کا خزانہ موجود ہے، اس کا انکشاف خود بیگ صاحب نے اقبال پارک کے جلسہ میں کیا تھا۔

باپ کی اہم دستاویزات بیٹے کے ہاتھوں ضائع کرنے کے دوران صرف ان کی ایک ڈائری بچ سکی، جو محبوب بیگ کی نظروں سے اوجھل تھی ورنہ اس کا بھی نام و نشان باقی نہ رہتا۔

تمام ریکارڈ کو ضائع کرنے کے بعد محبوب بیگ نے والد صاحب کی بیماری کا پورا پورا فائدہ اٹھاکر ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا اور اس میں بیگ صاحب کی طرف سے پہلے ہی یہ اعلان کیا گیا کہ انقلابی نیشنل کانفرنس، کو نیشنل کانفرنس میں واپس مدغم کیا جارہا ہے، بیگ صاحب کی طرف سے کہا گیا۔ "میں شیخ عبداللہ کو اپنا لیڈر تسلیم کرتا ہوں۔"

پریس کانفرنس میں اس بیان کی کاپیاں جب محبوب بیگ تقسیم کررہے تھے اس وقت بیگ صاحب اپنے ہوش میں نہیں تھے۔



(مرحوم بیگ صاحب)

مجھے معتبر ذرائع سے پتہ چلا، پریس کانفرنس سے قبل انہیں غنودگی میں رہنے کا انجکشن دیا گیا تھا۔ اس طرح اپنے باپ کے ساتھ بیٹے نے کرسی کی خاطر جو کھلواڑ کی اس کے صلے میں انہیں اسمبلی کی ممبری ضرور مل گئی لیکن وہ ممبری کے بجائے منسٹری چاہتے تھے جو انہیں مل نہ سکی البتہ بعد میں منسٹری حاصل کرنے کے لیے انہیں جو طریقہ استعمال کرنا پڑا، اس سے وہ منسٹری ضرور حاصل کرسکے۔ لیکن ناپائیدار۔

اتفاق کی بات ہے محبوب بیگ نے کرسی کی خاطر اپنے باپ سے جو سلوک کیا وہی سلوک ڈاکٹر فاروق نے ان کے ساتھ کیا — اور حساب برابر ہوگیا۔

۱۲ رجون ۱۹۸۲ء کو مرزا محمد افضل بیگ کا انتقال ہوگیا۔

وزیراعلیٰ کی دعوت پر وزیراعظم مسز اندرا گاندھی ۲۴ رجولائی ۱۹۸۱ء کو سرینگر تشریف لائیں، نیشنل کانفرنس اور کانگریس نے مشترکہ طور پر ان کا استقبال کیا۔

۲۵ر جولائی کو مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کے بعد کانگریس اور نیشنل کانفرنس نے صلح کا راستہ اختیار کر لیا۔ شیخ صاحب نے مسز اندرا گاندھی سے گلے شکوے کیے، تکرار کا راستہ ترک کرنے کا اعادہ کیا اور اس بات کا یقین دلایا کہ مستقبل قریب میں دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا۔

مسز اندرا گاندھی کے واپس جاتے ہی کانگریس نے خم ٹھونک کر نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کے خلاف کارروائی شروع کی، چنانچہ شیخ عبداللہ نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا شروع کیا۔ شیخ عبداللہ کی طرف سے کانگریس کے خلاف زہر افشانی نے ایک نئی صورتحال پیدا کر دی، چنانچہ بھارت کی اپوزیشن پارٹیوں کے لیڈروں نے شیخ عبداللہ کو اپنی صف میں لانے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کی، اس سلسلے میں رام جیٹھ ملانی، اٹل بہاری باجپئی اور ہیموتی نندن بھوگنا۔ یہاں یکے بعد دیگرے آئے اور شیخ صاحب کے ساتھ تفصیلی بات چیت کی اور واپس چلے گئے۔

کانگریس کی مخالفت میں شیخ عبداللہ نے ایسے بھی بیانات دیئے جس سے مسئلہ الحاق زیر بحث آیا۔ کئی سینئر کانگریسی رہنماؤں نے مسز اندرا گاندھی کو شیخ مخالف رویہ ترک کرنے کا مشورہ دیا تاکہ وہ حالات پھر سے پیدا نہ ہو جائیں جس سے ۱۹۵۳ء کے حالات و واقعات پیدا ہو جائیں۔

جنوری ۱۹۸۲ء کے آغاز کے ساتھ ہی لداخ کے بعد کشتواڑ میں فسادات بھڑک اُٹھے۔ لدّاخی، لداخ کو پسماندہ علاقہ قرار دینے اور کشتواڑ کے باشندے کشتواڑ کو ڈسٹرکٹ کا درجہ دینے کے لیے میدانِ کارزار میں اُتر آئے۔

۱۵ر جنوری کو لداخ اور کشتواڑ کے فسادات نے شدت اختیار کر لی۔ یہاں روزانہ گرفتاریاں دینے کے ساتھ ساتھ جلسے جلوس اور مظاہرے ہوتے رہے۔ مطالبات کی آڑ میں شیخ سرکار کے ہٹانے کے نعرے دیئے جانے لگے۔

روز روز کے دنگا فسادات اور ہڑتالوں سے جب وہاں روزمرّہ کی زندگی متاثر ہونے لگی تو ایک ایک کر کے کئی مرکزی وزراء ان جگہوں پر آ کر حالات کا جائزہ لینے لگے۔

اس سلسلے میں ۴ر فروری کو گھریلو معاملوں کے مرکزی وزیر مملکت شری وینکٹا سُبھیہ پہلے مرحلے پر کشتواڑ گئے اور ان کے ہمراہ آل انڈیا یوتھ کانگریس کے صدر غلام نبی آزاد

اور سیکورٹی فورس کے ڈی، آئی، جی شری ڈی، ڈی گپتا بھی تھے۔

کشتواڑ کی آل پارٹی ایکشن کمیٹی نے ان کا استقبال کیا، اثر زدہ کشتواڑ کا دورہ کرنے کے بعد وفد نئی دہلی روانہ ہو گیا، وفد نے اس سلسلے میں ۷ر فروری کو لداخ جانے کا پروگرام بنایا۔

مرکزی ٹیم کے کشتواڑ اور لداخ کے دورے پر جانے پر نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا انھوں نے وفد کے اراکین کو خبردار کیا کہ اس کے سنگین نتائج نکل سکتے ہیں اور ریاست سے باہر بھی اس کا اثر پڑ سکتا ہے۔

مرکزی سرکار ایسا ظاہر کر رہی ہے جیسا کہ ریاست میں انارکی پھیلی ہوئی ہے کشتواڑ اور لداخ میں معمولی واقعات کو خوب اُچھالا جا رہا ہے جو کہ ایک غلط بات ہے، شیخ صاحب نے اس بات کو واضح کیا کہ:

"میں عوام کے ووٹوں سے برسرِ اقتدار آیا ہوں کسی کی مہربانی سے نہیں، لداخ کے لوگ اٹانومی کی بات کرتے ہیں جس کا مطلب ریاست کی سالمیت کو درہم برہم کرنا ہے۔"

شیخ عبداللہ کے بعد ان کے جانشین ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ۱۲ر فروری کو پیر دستگیرؒ کے آستانۂ عالیہ پر عوامی اجتماع سے خطاب فرمایا۔

"ریاست میں گڑبڑ کانگریس آئی کرا رہی ہے۔ کشتواڑ اور لداخ میں معمولی گڑبڑ ہوئی تو مرکز کا ایک ذمّہ دار وزیر دوڑا دوڑا آیا۔ پچھلے سال سرینگر میں فوج نے گولیاں چلائیں تو مرکزی سرکار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ کشمیری عوام کے سروں پر سوار ہونے کے لیے کانگریسی پھر سازشیں کرنے لگے ہیں جو ووٹ چوری کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرتے تھے۔ کشمیری عوام اب اپنے جمہوری حقوق سے پوری طرح واقف ہیں اور وہ اپنی آزادی کی حفاظت کرنا جانتے ہیں وہ کسی بھی ایسی کوشش کو ناکام بنا دیں گے جن کا مقصد عوام کی آزادی اور جمہوری حقوق سے محروم کرنا ہو، وہ لوگ جنہیں کشمیری عوام نے ذلّت آمیز شکست سے ہمکنار کر دیا ہے آج مختلف قسم کے حربے استعمال کرنے لگے ہیں، یہ لوگ کشتواڑ اور لداخ میں

تخریبی کارروائیوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ پچھلے دنوں مرکزی وزیر مملکت وینکٹا سبھیہ کشتواڑ گئے تو ان کے ساتھ یوتھ لیڈر غلام نبی آزاد بھی تھے جن کو اپنے حلقے میں دو سو ووٹ بھی نہیں ملے یہ صاحب رو پے کی جھولی لے کر مرکزی وزیر کے ہمراہ کشتواڑ گئے۔ جن مرکزی لیڈروں کو کشتواڑ اور لداخ کی فکر ستانے لگی ہے وہ ۲۶ اور ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ء کے واقعہ پر کہاں تھے جس دوران کشمیری عوام پر گولیاں چلائی گئیں۔ کئی گاڑیاں نذرِ آتش کی گئیں، اس وقت مرکزی وزیر نے کشمیر کا رُخ کیوں نہ کیا۔ میں نے جولائی کے اس خونی واقعہ کو پارلیمنٹ میں اُٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن مسلسل پانچ روز تک کوشش کرنے کے باوجود مجھے کہا گیا کہ اس مسئلہ پر خاموش رہنا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔"

فاروق عبداللہ شاید جانتے نہیں تھے ان کے والد صاحب کو اس واقعہ پر کمیشن بٹھانے پر ان کی کیا درگت بنائی گئی۔ اپنی وزارت بچانے کے لیے انھوں نے مرکزی سرکار کو کمیشن کی رپورٹ منظرِ عام پر نہ لانے کا یقین دلا کر مرکزی سرکار کے ایکشن سے خلاصی پائی۔

نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ نے مرکزی وزیر کا کشتواڑ اور لداخ جانا ریاست کے معاملوں میں کھلم کھلا مداخلت سے تعبیر کیا۔ انہوں نے کہا۔

"یہ دورہ دراصل اپوزیشن پارٹیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کیا گیا۔ مرکزی وزیر نے دہلی میں اس دورے کے بارے میں جو رپورٹ دی اس میں انھوں نے ریاستی سرکار پر ایک طرح کا فردِ جرم عائد کیا اور مشورہ دیا کہ ریاستی سرکار اس معاملے کو وقار کا سوال نہ بنائے بلکہ کشتواڑ اور لداخ کے معاملوں کی طرف دھیان دے ان علاقوں میں پولیس کی زیادتیاں دیکھی گئیں، جس سے کئی جانیں ضائع ہو گئیں پولیس کے طرزِ عمل سے لوگ ہراساں ہو گئے ہیں۔ میرے پاس جو لوگ شکایات کرنے آئے، جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔ انہوں نے پولیس کے بارے میں رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات بیان کیے۔"

شری وینکٹا سبھیہ کے اس بیان پر نیشنل کانفرنس کی طرف سے ایک بیان جاری کیا گیا:-

"مرکزی وزیر مملکت کا بیان گمراہ کن ہے، لداخ کے لوگوں نے ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار کر لیا۔"

لداخ اور کشتواڑ کی اس ایجی ٹیشن کے بارے میں "پیوپلز کانفرنس" کی طرف سے ایک پریس نوٹ جاری ہوا، جس میں شیخ عبداللہ پر الزام لگایا گیا کہ وہ اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کے سبب کچھ نہیں کر سکتے، کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کی بدولت وہ مرکزی سرکار کی جانب سے ریاست کے ایسے معاملات میں بھی دخل در معقولات کے سامنے گونگے پہلوان کے مانند بے بس ہو بیٹھے ہیں جو معاملات آئینی لحاظ سے صرف ریاست کے دائرۂ اختیار میں ہیں۔ پیوپلز کانفرنس کا یہ موقف ہے کہ حکومت کو عوامی مطالبات سے نپٹنے کے لیے تحمل اور بُردباری کا ثبوت دینا چاہیئے اور عوام کو زور اور زبردستی سے پامال کرنے کی روش ترک کر دینا چاہیئے۔ لیکن شیخ سرکار نے کشتواڑ اور لداخ ایجی ٹیشن کے سلسلے میں ایسی بے حسی اور ناعاقبت اندیش پالیسی اختیار کی ہے جس کے دُور رَس اور مُضر نتائج نکل سکتے ہیں۔ ریاست کی مختلف اکائیوں کے درمیان تال میل کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اور ریاست کی وحدت اور ملکی مفادات کو نقصان پہنچ سکتا ہے ایسی صورتحال نے مرکزی سرکار کو ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ لاء اینڈ آرڈر کا معاملہ ریاست کے مخصوص دائرۂ اختیار میں ہے اس لیے مرکزی سرکار آئینی طور پر اس معاملے میں دخل نہیں دے سکتی پریس نوٹ میں اس بات کو خصوصی طور پر دُہرایا گیا کہ . . . .

جب ۱۹۶۷ء میں سرینگر میں پرمیشوری نامی لڑکی کے معاملے پر پنڈت ایجی ٹیشن برپا ہوا تھا، اس وقت مرکزی سرکار کے وزیر داخلہ شری چوان حالات کا جائزہ لینے کے لیے سرینگر آئے تو صادق صاحب نے انہیں اس معاملے میں دخل دینے سے روک دیا تھا اور انہیں فوراً سرینگر سے واپس جانے پر مجبور کیا تھا۔ صادق صاحب کے اس رویے سے شیخ عبداللہ سے مقابلہ کیا جائے تو خود یہ واضح ہوگا کہ ریاست کی آئینی خود مختاری کو بچانے کے حق میں صادق صاحب تھے یا شیخ صاحب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب

اپنے اقتدار کو بچانے اور اپنے فرزند فاروق صاحب کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے اس قدر بے تاب ہیں کہ وہ مرکزی سرکار کے دخل در معقولات کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے تیار نہیں کہ کہیں اس سے مرکزی آقا ناراض نہ ہو جائیں پریس نوٹ میں اس بات پر سخت اظہار افسوس کیا گیا کہ — ۲۶ اور ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ء کے واقعات کے دوران سرینگر میں کچھ فوجیوں نے یہاں کے شہریوں پر شدید مظالم ڈھائے تھے اور لاکھوں روپے کا نقصان کیا تھا۔ اس وقت معاملہ چونکہ فوجیوں کے رویے اور کارکردگی سے تعلق رکھتا تھا اس لیے مرکزی سرکار کا فرض بن جاتا تھا کہ اس سلسلے میں تحقیقات کر کے مجرم فوجیوں کو سزا اور ان معصوم شہریوں کی امداد کرے جنہیں اس واقعہ کے دوران مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس وقت مرکزی سرکار خاموش رہی ۔ اس بات میں کوئی دو رائیں نہیں کہ ریاستی سرکار مفلوج اور بے اثر ہوتی جا رہی ہے اور اپنے رویے سے یہ اپنا وقار کھو رہی ہے، ریاست کی آئینی وحدت، خود مختاری اور مفادات کو نقصان پہنچا رہی ہے۔"

اس پریس نوٹ کے شائع ہونے کے بعد حکومت کی طرف سے اس کے ترجمان نے اپنے بیان میں کہا۔

"۹ اگست ۱۹۵۳ء سے برابر فروری ۱۹۷۵ء تک کشمیری عوام پر بے پناہ ظلم و ستم ڈھائے گئے۔ مرکز کی کٹھ پتلی کانگریس کی حکومت نے پرامن لوگوں کو گولیوں اور ڈنڈوں کا شکار بنا دیا، ہزاروں لوگ بغیر کسی قصور کے جیلوں میں بھر دیئے گئے، اس پر آشوب دور میں کسی مرکزی وزیر نے یہاں آکر لوگوں کی حالت دیکھنے کی تکلیف گوارہ نہ کی، سوائے جب "پنڈت ایجی ٹیشن" شروع ہوئی تو مرکزی وزیر مسٹر چوہان دوڑتے دوڑتے ان پنڈتوں کی حالت دیکھنے آئے جنہیں ان کے خیال میں شاید یہاں مار دیا گیا تھا۔ آج مرکزی لیڈر کشتواڑ اور لداخ جا کر وہاں امن خراب کرنے والے لوگوں کی حمایت کر رہے ہیں اور ان کے حق میں بیانات جاری کر رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے جس طرح کشمیری عوام کو ظلم و ستم کا شکار بنایا جا رہا تھا۔ اس جمہوری دور میں پھر سے وہی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی

جا رہی ہے۔ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں ریاستی عوام نے اس بنا پر ہمیں ووٹ دیے تھے کہ اب وہ ظلم و جبر کا دور ختم ہو گا جو کانگریس نے یہاں رائج کیا تھا لیکن کانگریس اب بھی وہی ہتھکنڈے آزما رہی ہے حصول اقتدار کے لیے کانگریس اوچھے ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئی ہے لیکن ہم اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ اور یہاں کانگریس کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیں گے۔"

نیشنل کانفرنس اور کانگریس ایک دوسرے سے برسرپیکار رہی۔ بیان اور جوابی بیانات سے عام لوگ کچھ دور ہی رہے۔

اسی دوران شیخ صاحب دہلی روانہ ہو گئے ۲ دنوں تک دہلی میں قیام کرنے کے بعد جب وہ واپس آئے تو وہ بالکل بدلے ہوئے تھے، انھوں نے نیشنل کانفرنس اور کانگریس کو مل کر ریاست کی ترقی میں حصّہ لینے کی تلقین کی۔

شیخ صاحب کی دہلی سے واپسی پر کانگریس کا رویّہ بھی بدلا بدلا لگنے لگا۔



شیخ محمد عبداللہ بحیثیت لیڈر اور بحیثیتِ حکمراں

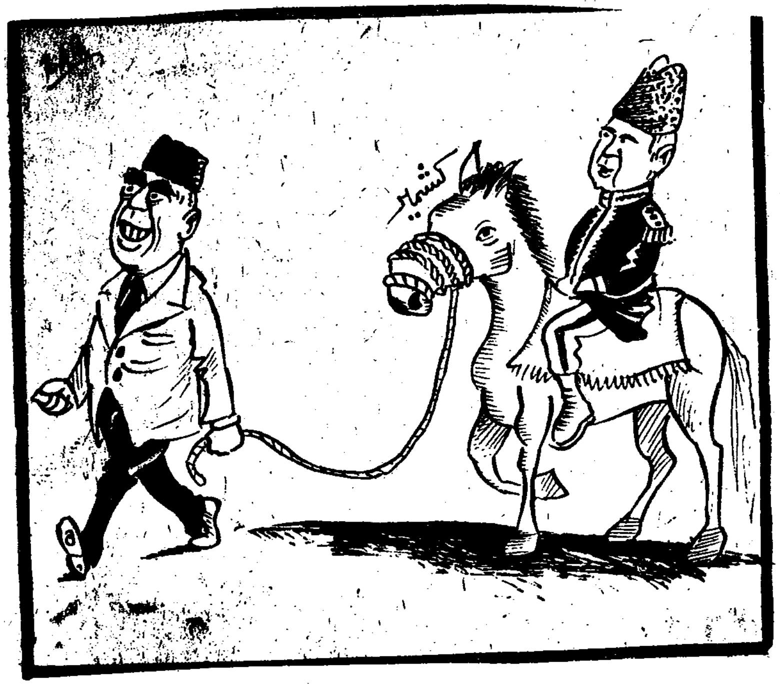




ولی عہد شہزادہ فاروق عبداللہ کی تاجپوشی کا جلوس گزر رہا ہے اور
اوپر سے شہنشاہ ولی عہد پر پھول نچھاور کر رہے ہیں۔ چندر جیت
یادو اور ایچ، این بہوگنا دیکھے جا سکتے ہیں۔



وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ اپنے فرزند کو اپنا جانشین ہونے کا اعلان کر کے بیگم عبداللہ سے
نیشنل کانفرنس کی کارکردگی کا چارٹر سن رہے ہیں



مہاراجہ عبداللہ اپنے ولی عہد کو تاجپوشی کے لیے لے جا رہے ہیں

دل میں تھا خواہشات کا چھوٹا سا ایک سماج
اب مجھ سے چاہتا ہے وہی خون کا خراج

شخصی راج کے خلاف لڑنے والے
حکمراں کا خاندانی راج

ایک جمہوری نظام میں خاندانی راج کی کوئی گنجائش نہیں ہے خاندانی راج شخصی راج اور مطلق العنانہ دورِ اقتدار میں قائم کیا جا رہا تھا۔ کسی شخص کو وراثت کے طور پر حکومت ملتی وہ شخص چاہے اس عہدے کے لایق ہوتا یا نہیں لیکن وراثت میں اس کو جو حکومت مل جاتی تھی وہ اسے ایک خاندانی جائیداد سمجھ کر اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق چلاتا تھا۔ ایسی حکومت کو قائم کرنے میں عوامی رائے یا لوگوں کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

آج وہ زمانہ گزر گیا ہے آج اگر کسی حکمراں خاندان کا کوئی فرد بھی حکومت کے کسی بڑے یا چھوٹے عہدے پر کام کرنا چاہے تو اس کو پہلے عوام کی تائید حاصل کرنا ضروری ہے عوام کی مرضی کے بغیر کوئی شخص محض پدرم سلطان بود کے مصداق حکمرانی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

جمہوری نظام میں سیاسی جماعتیں اقتدار حاصل کر کے ہی اپنے نظریات کو عملی شکل میں پیش کر سکتی ہیں، جمہوریت میں اقتدار ایک وراثت بن کر ایک شخص سے دوسرے شخص میں منتقل نہیں کیا جاتا۔

جس شخص نے اپنی زندگی میں شخصی راج کے خلاف لڑا ہو اس کے لیے خاندانی راج کا تصور بھی معیوب ہے۔ میں تو کہوں گا شرم کی بات ہے۔

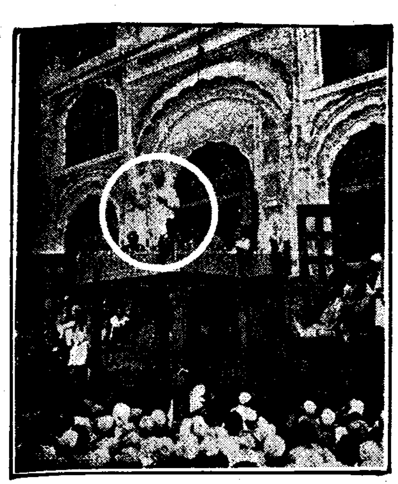
شیخ محمد عبداللہ نے اپنے بیٹے فاروق عبداللہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۱ء کو درگاہ حضرت بل میں مقدس تقریب کے سلسلے میں لوگ خاصی تعداد میں یہاں آئے ہوئے تھے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے حسبِ معمول



ایڈیٹر سرینگر ٹائمز ''صوفی غلام محمد'' نے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ سے پوچھا: ''آپ کا جانشین کون ہوگا؟''
شیخ صاحب نے جواب دیا ''جانشین مقرر کرنا ان کا کام ہے میں عوامی آدمی ہوں میں جانشین مقرر
کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہاں تقریر فرمائی دوران تقریر انہوں نے اچانک یہ انکشاف کیا۔



(درگاہ شریف حضرت بل)

"میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔"

اس کے بعد انھوں نے مزید فرمایا:

"میں پچاس سال سے کشمیری قوم کی قیادت کی ذمہ داریاں انجام دے رہا ہوں۔ اور اب وہ وقت آیا ہے جب میں قیادت کی ذمہ داری نوجوان پود کے ہاتھ میں سپرد کرنا چاہتا ہوں تاکہ نوجوان ہماری موجودگی میں قوم کے تئیں اپنے فرائض سمجھ لیں جو اس تحریک کو آگے لے جانے کے لیے انہیں پوری کرنی ہیں جس کا آغاز ہم نے ۱۹۳۱ء میں کیا۔ ہم نے جو تحریک شروع کی۔ وہ مختلف مراحل سے گزر کر ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے نئی پود کو ذمہ داری قبول کرنا ہے، ہم نے اس تحریک کو کافی مشکلات کے باوجود آگے بڑھایا۔ تحریک کی ابتداء سے ہی تحریک کے دشمن پیدا ہوگئے۔ قوم کے بھرپور اعتماد سے ہم کامیابی کی منزلیں طے کرتے گئے۔ آج ہماری تحریک ایک اور مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ اور دشمن عناصر نے سر اٹھانا شروع کیا ہے۔ اور وہ پھر ہماری اس تحریک کو زک پہنچانے کی کوشش میں منہمک ہوگئے ہیں، ہماری اس پچاس سالہ تحریک حق خود ارادیت کے دشمن آج پانی کی طرح روپے بہا رہے ہیں۔ آپ لوگ دشمنوں کو پہچان[1] لیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک کریں جو آنحضرت صلعم نے

[1] کشمیری عوام کو دوست اور دشمن کو پہچاننے کی تمیز ہوتی تو ہم انسان ہو کر بھیڑ بکریاں کیوں بن جاتے، دُنیا میں آزادی کے تصوّر کو رُسوا کیوں کرتے ؟۔ رہزن کو رہبر کیوں مانتے ؟

اپنے دشمنوں سے کیا۔

۱۹۳۱ء میں خانقاہ معلیٰ میں، میں نے آپ کو حلف دلایا تھا اور کہا تھا میں اس تحریک، تحریک حق خود ارادیت سے دغا نہیں کروں گا جس کے لیے کشمیر کے جوانوں نے جان کی بازی لگا دی اور اپنا خون بہایا، میں نے کہا تھا، میں ذاتی مقاصد کے لیے آپ کے مفادات کا سودا نہیں کروں گا۔ اقتدار کے لیے اپنا ایمان نہیں بیچوں گا۔ آپ اور میرے درمیان یہ ایک معاہدہ تھا، میں نے اپنی طرف سے مقدور بھر کوشش کی کہ میں اس وعدہ کو نبھاؤں گا۔ میری سیاسی زندگی میں کافی اتار چڑھاؤ آئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں استعاعت عطا کی اور یہ تحریک دشمنانہ کارروائیوں کے باوجود زندہ رہی، ۱۹۵۳ء کے انقلاب کے پیچھے یہ مقصد تھا کہ جن غلامی کی زنجیروں کو ہم نے توڑ دیا تھا۔ ان کو دوبارہ ہمارے ہاتھوں میں ڈال دیا جائے ۲۰ سال کی جدوجہد کے بعد ہماری فتح ہوئی اور ہم کامران (حکمران) ہوگئے۔ اقتدار پھر ہمارے ہاتھ آگیا، وہ سب لوگ ناکام ہوگئے جو ہماری آزادی کے دشمن تھے۔

ہم نے نیشنل کانفرنس کو ایک قلعہ بنایا ہے، جب تک نیشنل کانفرنس ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے کوئی یہاں کے لوگوں کو غلام نہیں بنا سکتا یہ لوگ اس وقت روپے بہتات سے خرچ کر رہے ہیں اور ہمارا اقتدار ہم سے چھین رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں کی چالیں کامیاب ہوگئیں تو سب برباد ہوجائے گا شہیدوں کا خون بیکار ہو جائے گا۔ کشمیری عوام کو ان شہیدوں کے خون کا خیال رکھنا چاہیئے، جنہوں نے اپنی زندگی قربان کر کے ہمیں زندگی دی۔

میں نے نوجوان پود کے ہاتھ میں قیادت کی ذمہ داریاں سونپ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں عوام سے اس بارے میں رائے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

اس موقع پر شیخ عبداللہ نے لوگوں سے کہا کہ اگر وہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں تو ہاتھ بلند کریں ـــ بیشتر لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ بلند کیے۔

شیخ عبداللہ نے اسی دوران فاروق عبداللہ زندہ باد کا نعرہ لگایا۔

وزیراعلیٰ کے حضرت بل میں مقدّس تقریب کے دوران اچانک اس اعلان سے جب دُور دُور تک اس کا چرچا ہوا تو مختلف خیالات کے لوگ اس کی مختلف تاویلیں کرنے لگے۔ بعض سیاست داں شیخ صاحب کے اس اعلان سے دنگ رہ گئے۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی جانشینی پر کانگریس پارٹی نے مجموعی طور پر محتاط رویہ اختیار کیا کیونکہ مرکز میں مسز اندرا گاندھی اسی ڈگر پر چل رہی تھیں البتہ سابق وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے اپنے ایک بیان میں کہا۔

"شیخ صاحب نے اپنے فرزند کو جانشین بنا کر اپنے مشن کی تکذیب اور اپنے خیالات کی تردید کی، لیکن میں اس کے لیے محاذ آرائی کا قائل نہیں۔



(عبدالغنی لون اور مظفر حسین بیگ)

میرے وزارت چھوڑنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ شیخ صاحب الحاق کا مسئلہ بھول کر قومی دھارے میں آ گئے۔ اور شیخ صاحب کے بارے میں جو لوگ غلط فہمی میں مبتلا تھے، اُن کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ شیخ صاحب کیا تھے اور کیا ہیں ان کے بارے میں ہماری جو رائے پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔"

اس بارے میں ۲۴ر جنوری ۱۹۸۱ء کو پیوپلز کانفرنس کے لیڈر عبدالغنی لون اور مظفر حسین بیگ نے اخبارات کے لیے ایک بیان جاری کیا۔

"جمہوری نظام میں جانشینی کے تصوّر کی کوئی گنجائش نہیں

شیخ عبداللہ نے اپنے فرزند شیخ فاروق کو اپنا جانشین نامزد کر کے کشمیری قوم سے ایک زیادتی کی ہے، اس وقت ہمیں اس بات سے غرض نہیں کہ شیخ

فاروق ذاتی طور پر کس سوچ کے انسان ہیں اور سیاست میں ان کی نہج تجربہ یا مقام کیا ہے؟ بلکہ ہماری توجہ اس امر پر ہے کہ شیخ صاحب نے انہیں جانشین مقرر کر کے ایک ایسا سیاسی ماحول پیدا کیا ہے جس میں جمہوری مزاج اور صحت مند سیاسی قدریں قائم نہیں ہو سکتیں، اس امر سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دراصل سیاست میں شیخ صاحب کا منتہائے مقصد مہاراجہ کے شخصی راج کو ختم کر کے اپنا شخصی راج قائم کرنا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ وقتاً فوقتاً اپنے قریبی ساتھیوں کا سیاسی طور پر قلع قمع کرتے رہے ہیں تاکہ اقتدار میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہ ہو۔ وہ اقتدار کی مسند کو اپنے افرادِ خانہ کے لیے بچائے رکھنا چاہتے تھے۔

بدقسمتی تو یہ ہے کہ شیخ صاحب نے اپنے فرزند کو اپنا جانشین مقرر کرنے کے لیے حضرت بل کی مقدّس جگہ اور ایک مقدّس تقریب کو استعمال کیا، یہ ان کی پرانی عادت ہے کہ وہ معصوم کشمیری عوام کے مذہبی جذبات کو اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے آئے ہیں اور جہاں ان کے ذاتی اغراض و مقاصد کا سوال ہو وہ اپنے رفقاء اور اپنی جماعت کو بھی اعتماد میں نہیں لیتے، افسوس کا مقام ہے کہ شیخ فاروق نے بھی اپنے باپ کے آزمائے ہوئے سیاسی ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے ہیں۔

چنانچہ کچھ عرصے سے وہ یوتھ فیڈریشن کے ذریعے ریاست کی اندرونی خودمختاری بحال کرنے اور راولپنڈی روڈ کھولنے کا مطالبہ کرنے لگے جبکہ پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے وہ "آزاد کشمیر" کو پاکستان کے چنگل سے چھڑانے کی باتیں کرتے ہیں۔ شاید ان کا مقصد عوام کے جذبات کو اُبھار کر مقبولیت حاصل کرنا ہے، اور ان نعروں سے وہ اندرا گاندھی کو اسی طرح بلیک میل کرنا چاہتے ہیں جس طرح ان کا والد کرتا آیا ہے۔"

۳۱ر جنوری ۱۹۸۱ء کو کانگریس پارٹی نے اسمبلی میں ایک بل پیش کیا جس کا مقصد اسمبلی کی میعاد ایک سال کم کرنا تھا۔ اور اس کی مدت پہلے کی طرح پانچ سال رکھنا تھا۔ نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ نے اس بل کی مخالفت کی تو پردیش کانگریس آئی کے صدر مفتی محمد سعید نے

پریس کے لیے ایک بیان جاری کیا۔

"ہماری بنیادی مشکل یہ ہے کہ ۱۹۷۵ء میں جو ایکارڈ شیخ صاحب سے ہوا اس میں سید میر قاسم تفاصیل طے کیے بغیر شیخ عبداللہ کے حق میں دستبردار ہو گئے یہ سٹیٹ لیڈرشپ کی طرف۔ شیخ عبداللہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے برابر تھا۔ شیخ عبداللہ کا اپنے بیٹے کو جانشین نامزد کرنا انتہا درجے کی کنبہ پروری ہے، اپنے بیٹے کو راجوں مہاراجوں کی طرح جانشین مقرر کرنا اور پھر حضرت بل کی زیارت میں لوگوں سے اس کی تائید کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھانے کو کہنا بالکل عجیب بات ہے۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ ۱۹۵۳ء کی بحالی راولپنڈی روڈ کھولنے اور اٹانومی کی جو باتیں کر رہے ہیں وہ اپنے باپ کی تقلید میں یہاں کے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے کیا جا رہا ہے۔"

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی طرف سے جانشین بننے کے فوراً بعد ۱۹۵۳ء کی بحالی کے بارے میں ان کے بار بار دُہرائے گئے مطالبے کے بارے میں پیوپلز کانفرنس کے صدر عبدالغنی لون اور پارٹی کے نائب صدر مظفر حسین بیگ نے ۸ فروری ۱۹۸۱ء کو ایک پریس کانفرنس میں بتایا۔



(فاروق عبداللہ)

"ڈاکٹر فاروق اپنے پاپا سے کہیں کہ ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کرے اس مطالبہ کو لے کر عوام کے پاس جانے میں کیا تُک ہے ــــ کانگریس اور نیشنل کانفرنس دونوں عوام کے مسائل حل کرنے کے بجائے اقتدار کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور ان دونوں جماعتوں کی محاذ آرائی محض اقتدار کوشی ہے، ایک جماعت حکومت پر قابض رہنا چاہتی ہے اور دوسری جماعت حکومت میں اپنا

حصّہ حاصل کرنا چاہتی ہے ایک کو کنبہ پروری، دھاندلیوں اور بے ایمانیوں پر تکیہ ہے اور دوسرے کو مرکزی سرکار کی پشت پناہی، ڈاکٹر فاروق عبداللہ جو آئے دن ۱۹۵۳ء کی بحالی کا واویلا کرتے ہیں یہ محض فراڈ ہے، ڈاکٹر فاروق کو اپنے پاپا سے کہنا چاہیئے کہ وہ ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کرے کیونکہ اس بات پر انھوں نے عوام سے ووٹ حاصل کر لیے ہیں۔ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے عوام سے ہمیشہ دھوکہ کیا ہے جب وہ رائے شماری کا نعرہ لگاتے تھے اس وقت بھی یہ نہ کہتے تھے کہ لوگوں کو پاکستان اور ہندوستان میں سے کس کے حق میں ووٹ دینا چاہیے دراصل وہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے عوام کو دھوکہ میں رکھنا چاہتے تھے ــــ شیخ صاحب کے پاس اسمبلی میں اکثریت حاصل ہے، وہ ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کیوں نہیں کراتے، بیٹے کے ہاتھوں ڈول کیوں پٹواتے ہیں۔"

پیوپلز کانفرنس کے اس پریس کانفرنس کے بعد ریاستی کانگریس اور جنتا پارٹی نے بھی یہی بات دہرائی کہ شیخ عبداللہ نے جن باتوں پر عوام سے ووٹ لیے ان باتوں کو وہ پورا کیوں نہیں کر رہے ہیں جبکہ اسمبلی میں انہیں اکثریت حاصل ہے۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی جانشینی جب پریس اور پلیٹ فارم پر تبصرہ نگاروں اور اخباری نمائندوں اور دانشوروں نے شیخ صاحب کے اس فیصلے پر مایوسی اور ناراضگی کا اظہار کیا تو شیخ صاحب نے جواب دیا۔

"نیشنل کانفرنس کے تنظیمی انتخابات ہونے والے ہیں اور مارچ کے آخر میں تنظیم نئے صدر کا انتخاب کرے گی، اگر فاروق عبداللہ کے مقابلے میں کوئی کھڑا ہوا تو مقابلہ ہوگا۔"

انھوں نے مزید فرمایا:۔

"درگاہ حضرت بل میں انھوں نے ڈاکٹر فاروق کی جانشینی کا جو اعلان کیا وہ محض اس وجہ سے ہوا کہ موقع پر موجود لوگوں نے ان پر زور دیا کہ وہ فاروق عبداللہ کو اپنا جانشین مقرر کریں۔"

ڈاکٹر فاروق کو جانشین مقرر کیے جانے پر اسمبلی میں حزب اختلاف کے لیڈر عبدالرشید

کابلی نے اپنے بیان میں کہا۔



(عبدالرشید کابلی)

"یہ ایک غیر جمہوری اقدام ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ شیخ صاحب نے خالص سیاسی مسئلہ کو درگاہ حضرت بل کے مقدس مقام پر لایا اور ایک ایسے دن جب وادی بھر کے ہزاروں مسلمان نماز پڑھنے اور موئے مقدس صلعم کے دیدار کرنے درگاہ حضرت بل آگئے تھے۔" شیخ صاحب کو اگر اپنی جانشینی کا اعلان کرنا ہی تھا تو اس کے لیے مجاہد منزل موزوں جگہ تھی۔"

اس بارے میں "سرینگر ٹائمز" کے مدیر صوفی غلام محمد نے اپنے اخبار کے ایڈیٹوریل میں لکھا:-

"نیشنل کانفرنس کا نیا صدر بنانا ایک تنظیمی معاملہ ہے اگر شیخ صاحب پہلے یہ معاملہ تنظیم کے سامنے رکھتے اور پھر عوام سے اس کی تائید و توثیق کراتے تو زیادہ بہتر رہتا وزیر اعلیٰ کا مجاہد منزل کے بجائے حضرت بل جانا اور وہاں زائرین کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اچانک ان کے سامنے فاروق عبداللہ کو جانشین نامزد کرنا نامناسب اور ناموزوں ہے، یہ دوسری بات ہے کہ جمہوریت میں جانشین مقرر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے ان کے بڑے فرزند کو جانشین مقرر کرنے پر پریس اور پلیٹ فارم سے مخالفت کے گولے پھینکے جانے لگے تو ڈاکٹر فاروق عبداللہ عوامی ایکشن کمیٹی کے صدر مولوی محمد فاروق سے دہلی کے کشمیر ہاؤس میں ملے۔ مولانا فاروق اُن دِنوں دہلی میں قیام پذیر تھے اِن دونوں کی ملاقات رات دیر گئے تک جاری رہی۔

اگلے روز مولانا نے دہلی میں ایک بیان جاری کیا جو اخباروں میں آیا۔

"ڈاکٹر فاروق کا جانشین بننا حق بجانب

مولوی فاروق نے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کے اس فیصلے کو حق بجانب قرار دیا ہے جس کے تحت انھوں نے ڈاکٹر فاروق کو اپنا

جانشین بنایا ہے، شیخ صاحب کا یہ فیصلہ حیران کن نہیں ہے۔ شیخ صاحب اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے ادا کر رہے ہیں اور اب انہیں جانشینی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔"

دہلی میں مولانا فاروق کا یہ بیان جاری ہوا تو سرینگر میں شیخ عبداللہ کی طرف سے مولانا فاروق کی نگین میں ان کی نئی کوٹھی کی تعمیر کے لیے سیمنٹ، لوہا اور ٹمبر فراہم کیے جانے کے لیے متعلقہ انجینئروں کو ہدایت دی گئی جن کی نگرانی میں کئی سرکاری عمارتیں بن رہی تھیں۔

پریس اور پلیٹ فارم سے جانشینی کی مخالفت کی یہ جنگ جاری تھی کہ شیخ محمد عبداللہ نے ایک تقریب میں ریاست کی اٹانومی کا ذکر خیر کیا چنانچہ نامزد ولی عہد نے والد صاحب کی ہاں میں ہاں ملا کر ۱۳ فروری کو ترال میں ایک اجتماع سے خطاب فرمایا۔

"ہم ۱۹۵۳ء کی بحالی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء کے بعد جو مرکزی قوانین ریاست پر نافذ کیے گئے ہیں، ان میں تمام اچھے قوانین رکھ کر باقی قوانین منسوخ کیے جائیں، روالپنڈی روڈ کھول دی جائے اور ریاست کو اٹانومی دی جائے۔"

اس بیان کی روشنی میں حزب اختلاف کے لیڈر عبدالرشید کابلی نے اسمبلی میں شیخ صاحب سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"اگر آپ سے آپ کا بیٹا ۱۹۵۳ء کی بحالی کا مطالبہ کرتا ہے، اگر وہ اٹانومی چاہتا ہے تو ان کے یہ مطالبے قبول کیوں نہیں کیے جاتے؟"

جب انہیں اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ تو کابلی صاحب نے شیخ عبداللہ پر اپنے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو عوام پر ٹھونسنے، کرپشن کو بڑھاوا دینے اور اپوزیشن کو دبانے کے الزامات عائد کیے۔

آپ نے مرکزی سرکار پر زور دیا کہ وہ اس بات کی چھان بین کرے کہ مرکز سے جو امداد دی جا رہی ہے اس کا صحیح طور پر مصرف ہوتا ہے کہ نہیں مرکزی سرکار جو رقومات ریاست کو مہیا کرتی ہے، اس کا اکثر حصہ شیخ خاندان کی جیبوں میں چلا جاتا ہے شیخ عبداللہ نے اپنے بیٹے کو مسندِ اقتدار پر براجمان کرنے کے لیے ناجائز طریقہ اپنایا اور

اس مقصد کے لیے آثار شریف حضرت بل جیسی مقدس جگہ کا غلط استعمال کیا۔ پارٹی کے قواعد وضوابط کو بالائے طاق رکھ کر ڈاکٹر فاروق کو تنظیم کی صدارت کی پیش کش کر کے شیخ صاحب نے انتظامیہ میں انتشار کے جراثیم داخل کیے ہیں، جب سے شیخ صاحب نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی ہے، ریاست کی اندرونی خود مختاری کو زبردست نقصان پہنچا ہے، شیخ صاحب نہ تو اٹانومی کے قائل ہیں نہ رہیں گے لیکن اپنی کرسی کو مضبوط اور محفوظ بنانے کے لیے وہ اس نعرے کو بہر حال زندہ رکھنا چاہتے ہیں اب انھوں نے ایسا ہی سبق اپنے بیٹے کو پڑھایا ہے۔

رائے شماری کا نعرہ بھی ایک سراب تھا اور آج اٹانومی کا نعرہ ایک فریب ہے۔ اقتدار کے لیے شیخ صاحب نے ایکارڈ پر دستخط کر کے ۱۹۵۳ء کی خصوصی پوزیشن سے ہی دستبرداری کا اعلان کیا۔

شیخ صاحب کے دورِ اقتدار میں کرپشن انتہا کو پہنچ گئی ہے، بخشی غلام محمد کے خلاف جن الزامات کے تحت آئینگر کمیشن بٹھایا گیا تھا وہ آج کی کرپشن کے سامنے ہیچ ہے۔"

جانشینی کے بارے میں مخالفت کے شور و غوغا کے بارے میں شیخ عبداللہ نے پچاس سالہ سیاسی زندگی کے دفتر میں ہزاروں مخالفتوں کے ساتھ ان مخالفتوں کو بھی داخلِ دفتر کر دیا، اور اپنا کام جاری رکھا۔ اگست کے آخری ہفتے میں پورے تین دنوں تک ولی عہد کی تاجپوشی کا جشن بھی منایا۔

۲۰ اگست ۱۹۸۱ء کا تاجپوشی کا جلوس اپنی مثال آپ تھا۔ اس روز ڈاکٹر فاروق عبداللہ مجاہد منزل سے اقبال پارک تک ایک جلوس کی صورت میں لائے گئے، ولی عہد کی سواری جس راستے سے گزری لوگوں نے شاندار طریقے پر ان کا سواگت کیا۔

مہاراجہ عبداللہ نے اپنی مہارانی بیگم اکبر جہاں اور چند مرکزی لیڈروں کی موجودگی میں امیراکدل کے لالہ رخ ہوٹل کی بالکنی سے ولی عہد پر پھولوں کی ورشا کی۔

ولی عہد ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی تاجپوشی کی رسم ریاست جموں وکشمیر کی پہلی اور واحد رسم تھی جس میں نہ صرف مہاراجہ اور مہارانی نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، بلکہ ان لوگوں نے بھی اس جشن میں بھرپور حصّہ لیا، جنہوں نے شیخ عبداللہ کی سربراہی میں شخصی راج اور خاندانی راج کے خلاف لڑا تھا، جو قید بھی ہوئے تھے اور اپنے جسموں پر زخم بھی لیے ہوئے تھے۔

اس جشن میں ان لوگوں نے بھی بھرپور حصّہ لیا جن کو معلوم ہی نہیں کہ عوامی راج کیا ہوتا ہے؟ اور شخصی راج کسے کہتے ہیں؟

اس جشن تاجپوشی میں نیشنل کانفرنس کے اُن لیڈروں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا جنہوں نے شخصی راج کے خلاف قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ ٹکٹکی کھائی تھی اور جو نیشنل کانفرنس کے منشور سے واقفیت رکھتے تھے، جو شخصی راج کے بارے میں شیخ عبداللہ کے خیالات سے متفق تھے، اور شخصی راج کے خلاف شیر کشمیر کی پچاس سالہ تقریروں کے اجتماع میں پیش پیش ہوا کرتے تھے۔

شہنشاہ کی یہ رعایا ٹیڑھے برتنوں کے اُلٹے ڈھکّن ہونے کا خوب مظاہرہ کر رہی تھی اور قومی رہنما بلند بانگ دعوؤں کی پرواہ کیے بغیر اپنے اصول اور آدرش خود ہی مٹا رہے تھے۔

نیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ۲۱، ۲۲، ۲۳ر اگست ۱۹۸۱ء کے دوران فاروق عبداللہ کو نیشنل کانفرنس کی صدارت سونپی گئی۔ اس موقع پر پارٹی کی طرف سے "نیا کشمیر" کے پروگرام نظرِ ثانی شدہ مسودہ کتابی صورت میں پیش کیا گیا۔ اس مسودہ سے نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کی نیت کے بارے میں واضح اشارے ملتے تھے۔ اس میں دو اہم باب حذف کیے گئے اور دیگر ابواب میں اہم تبدیلیاں کی گئیں۔

"نیا کشمیر" کے لیے مسودہ کا دیباچہ نیشنل کانفرنس کے جنرل سکریٹری غلام محی الدین شاہ نے لکھا تھا جس میں کہا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں منعقد ہوئے نیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی قرارداد کے مطابق "نیا کشمیر" کے منشور کو نئے تقاضوں سے تشکیل اور ترتیب دیا گیا ہے۔ نئے تقاضوں کے مطابق نیشنل اسمبلی اور انصاف (عدالتیں اور ایڈووکیٹ) اور ریاست کے آئین سے متعلق تین باب حذف کیے گئے یا ان میں اس حد تک ترمیم کی گئی کہ نیشنل کانفرنس نے ۱۹۳۸ء سے لے کر اب تک برابر ریاست کی انفرادیت اور اٹانومی کا جو تصوّر عوام کو دیا وہ بالکل ختم کر دیا گیا۔ "نیا کشمیر" کے نظرِ ثانی مسودہ میں بعض اہم باتیں حذف کرنے کے ساتھ بعض نئی باتیں شامل کی گئیں۔

"نیا کشمیر" کے پرانے مسوّدہ میں درج تھا کہ جموں وکشمیر ہائیکورٹ سب سے اعلیٰ جوڈیشل ٹریبونل ہے اس میں سپریم کورٹ اور آئین ہند کا کہیں پر کوئی ذکر نہ تھا لیکن نئے مسودے میں کہا گیا ہے کہ ریاست میں ہائی کورٹ عدلیہ کا سب سے

بڑا ادارہ ہوگا، مرکز اور ریاستی آئین کے تحت عدلیہ آزاد رہے گی اور اس پر صرف سپریم کورٹ کا دائرہ ان معاملات پر حاوی ہوگا جو ریاست نے تسلیم کئے ہوں (حالانکہ بعض قوانین کے ساتھ انہیں سخت اختلاف تھا) نئے مسودے میں ریاست کے اپنے ریڈیو اسٹیشن کا ذکر حذف کیا گیا۔" نیا کشمیر" کے پرانے مسودہ میں کشمیر کا تصور ایک علیحدہ ملک کا سا تھا اس میں کرنسی، خارجہ پالیسی اور ڈیفینس وغیرہ تمام باتوں کا تفصیلی ذکر تھا نئے مسودے میں سے یہ تمام باتیں نکال دی گئیں۔

وزیر اعلیٰ نے اپنے بیٹے کو پہلے یوتھ نیشنل کانفرنس کا لیڈر بنایا پھر ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو انہیں پارلیمنٹ کا بلا مقابلہ ممبر منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد انہیں ۲۳ر مارچ ۱۹۸۱ء کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

ریاست کا حکمراں اپنا جانشین مقرر کرنے سے قبل جو کچھ اس بارے میں کہا کرتے تھے آیئے کچھ دیر کے لیے اس کا بھی جائزہ لیں۔ ۱۹۴۲ء میں قوم کے لیے " نیا کشمیر" کا پروگرام پیش کرتے ہوئے شیخ صاحب نے فرمایا تھا۔

" ہمیں وہ شخصی راج کسی بھی صورت میں منظور نہیں، جو راج وراثت میں باپ کے بعد بیٹے کو ملتا ہے چاہے یہ بیٹا نالائق اور ناقابل ہی کیوں نہ ہو۔"

ستمبر ۱۹۷۸ء میں مرزا افضل بیگ نے جب ان کے داماد کو کونسل کی ممبری کا منڈیٹ دینے کی استدعا کی تو شیخ صاحب نے اپنی بیگم، داماد اور بیٹے کو سیاسی عہدے تفویض کرنے کے باوجود فرمایا تھا:

" ہمارے گھر اور خاندان سے باہر بھی ایسے قابل لوگ ہیں جو ان عہدوں کے مستحق ہیں اگر ہم صرف اپنے گھر کے افراد کو ہی ان عہدوں پر لیں گے تو لوگ کیا کہیں گے۔ ؟"

۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو پانپور کے مقام پر جلسہ عام سے خطاب فرماتے ہوئے کہا تھا:

" تحریک مہاراجہ کے شخصی نظام کے بعد کوئی اور خاندانی حکومت قائم کرنے کے لیے شروع نہیں کی گئی تھی، خاندانی حکومت قائم کرنے کا ہوا لوگوں کے ذہنوں کو پراگندہ کرنے اور اصل مسائل سے توجہ ہٹانے کے لیے کھڑا کیا گیا ہے، بھلا جو شخص خاندانی راج کے خلاف ہو وہ کیسے

خاندانی راج کا تصور کر سکتا ہے، میرے نزدیک کسی کو جانشین مقرر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، جانشین مقرر کرنا راجوں اور مہاراجوں کا کام ہے۔

۲۲ر دسمبر ۱۹۷۸ء کو جموں میں اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا۔

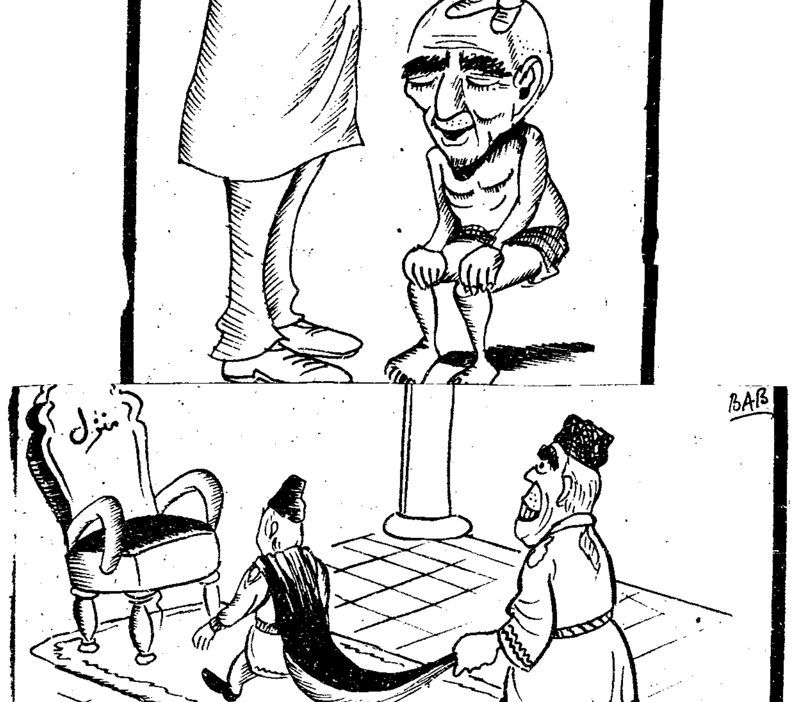
" وزارتی کونسل میں کسی قسم کا ردوبدل خارج ازمکان ہے حکومت اس بات کا وعدہ کر چکی ہے کہ وہ علاقائی تفاوت ختم کرے گی۔

اپوزیشن خواہ مخواہ خاندانی راج کا ورد کر رہی ہے، میرے نزدیک جانشین مقرر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ لیڈر خود بخود سیاسی سطح پر اُبھر آتے ہیں، مجھے اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ میرے بعد کون ہوگا مجھے تو ان سیاسی مسائل کی فکر ہے جن کا ہمیں اس وقت سامنا ہے۔"

شیر کشمیر کے ان بیانات سے جو انھوں نے مختلف مقامات اور اوقات پر دیئے۔ صاف طور پر لگتا ہے کہ وہ اس بات کا کبھی کوئی خیال نہیں رکھتے تھے کہ کل کو اگر میں نے کسی چیز کو سیاہ کہا اور آج اُسے سفید کہوں تو کہیں میں جھوٹا ثابت نہ ہو جاؤں۔

دراصل ان کے سامنے سچ اور جھوٹ، سیاہ اور سفید، صحیح اور غلط کی کوئی تمیز نہ تھی انہیں بس اپنے اور اپنے خاندان کے مفادات عزیز تھے اور اس کے حصول کے لیے چاہے وہ غلط کریں یا جھوٹ بولیں یا اپنے اصولوں کے منافی کام کریں اس کی ان کے پاس کوئی اہمیت نہ تھی اہمیت اگر تھی تو بس اپنے مشن کی تکمیل کی ان کا مشن اوّل اور آخر اقتدار ہے ——— وہ اقتدار جو اُن کے بعد ان کے جانشین کو ملے۔







شیخ عبداللہ کشمیری عوام کے عقل و شعور پر خندہ زن ہیں





کون جانے —!
نصف صدی تک شخصی راج کے خلاف کشمیری عوام کا خون بہانے والا خاندان ولی عہد کی تاجپوشی پر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں یا نادان کشمیریوں پر ہنس رہے ہیں

یہ عالم ایجاد اک دھوکا تو نہیں ہے
یہ بت کسی اندھے نے تراشا تو نہیں ہے

سرینگر کے چند سرمایہ دار بزنس گھرانوں پر انفورسمنٹ کے چھاپے

مرکزی محکمۂ انکم ٹیکس کی انفورسمنٹ ٹیم نے ۱۲؍اپریل ۱۹۸۱ء کو سرینگر میں ایک درجن کے قریب سرمایہ دار تاجر گھرانوں پر چھاپے مارے جن پر یہ چھاپے مارے گئے ان میں: (۱) متو برادرس (۲) عبدالاحد خانیاری (۳) حبیب اللہ خانیاری (۴) شاہ اینڈ سنز (۵) او، ٹی، سی (۶) کرشنا فلور ملز (۷) انڈو کشمیر کارپٹس (۸) ایم رمضانا اینڈ سنز (۹) ڈار سنز قابل ذکر ہیں، اس کے علاوہ متو برادرس انڈو کشمیر کارپٹس اور خانیاری برادرس کی دہلی بمبئی کی دکانوں پر بھی اسی دوران چھاپے مارے گئے۔

یہ چھاپے متواتر تین دنوں تک جاری رہے۔ چھاپے ڈائریکٹر آف انسپکشن اینڈ انوسٹیگیشن کی طرف سے انکم ٹیکس ایکٹ کی دفعہ ۱۳۲ کے تحت ڈالے گئے، چھاپے قالین سازی اور اس صنعت سے وابستہ فرموں پر ڈالنا مطلوب تھا، البتہ وزن شعر کے لیے او، ٹی۔سی اور کرشنا فلور ملز کو بھی شامل رکھا گیا۔ تاکہ مسلمانوں کے ساتھ امتیاز کا الزام نہ لگ سکے۔

وادیٔ کشمیر میں اس قسم کے یہ چھاپے پہلی بار ڈالے گئے اور اس کے لیے محکمہ انکم ٹیکس کی انفورسمنٹ ٹیم ڈیڑھ مہینے سے خفیہ طور پر تیاری کر رہی تھی۔

اس قسم کی کارروائی کی شروعات فروری ۱۹۸۱ء میں اُن شکایات پر ہونے لگی، جو فرانس اور بلجیم سے مرکزی وزارت انڈسٹری کو موصول ہوئی تھی۔ فرانس کی نکلسن ایکسپورٹ کمپنی اور اس کے برانچ آفس بلجیم نے ہندوستان کی انڈسٹریز منسٹری سے شکایت کی تھی کہ متو برادرس، انڈو کشمیر کارپٹس اور خانیاری برادرس سے جو قالین فراہم

ہو رہے ہیں وہ کوالٹی اور معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ بیشتر قالینوں میں ریشم کے بدلے اسٹیپل کا استعمال کیا گیا ہے، چونکہ یہ فرمیں ہمارے ساتھ دھوکا کر رہی ہیں، لہذا ان سے اس کی باز پرس کی جائے۔ مرکزی انڈسٹریز منسٹری نے یہ معاملہ انفورسمنٹ کے سپرد کیا تو اس محکمہ کے ذمہ دار آفیسر دہلی بمبئی میں ان دوکانوں پر گئے اور ان سے ناقص مال سپلائی کرنے کی وجوہات دریافت کرلیں۔ تحقیقات کے دوران متعلقہ آفیسر سے جب کہا گیا، اس مال میں ہم اتنا منافع نہیں کماتے جتنا کہ ہم سے کمیشن لیا جاتا ہے تو اُن سے باز پرس کی گئی کہ یہ کمیشن کون لیتا ہے؟ کس حساب سے لیتا ہے؟ اور کہاں لیتا ہے؟

ان سوالات نے جب سنگین صورت اختیار کرلی تو وہ کمیشن کی بات کو سدھارنے لگے لیکن انفورسمنٹ آفیسر کچّی گولیاں کھانے والا نہیں تھا۔ اس نے دھمکی دی اگر ہمیں سب کچھ ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا جائے گا تو ہم تمہاری دکانوں کو بلیک لسٹ کریں گے۔

مرتا کیا نہ کرتا انھوں نے کمیشن ایجنٹ کا نام بتایا لیکن ان سے یہ وعدہ لیا کہ اس انکشاف میں ان کو ملوث نہ کیا جائے گا۔

۲۲ر فروری ۱۹۸۱ء کو انڈسٹریز محکمہ کے انفورسمنٹ آفیسر نے محکمۂ انکم ٹیکس کے ساتھ رابطہ قائم کیا تو اس سلسلے میں دو سرکردہ ارکان سرینگر آئے اور وہ یہاں بزنس گھرانوں کی لسٹ بنانے کے ساتھ ان کے کاروبار اور دوسری باتوں کا پتہ لگانے لگے۔

ان ارکان نے یہاں ۴۵، ایسے بزنس گھرانوں کی لسٹ مرتّب کی جو ہر دور میں ریاستی حکومت کو اپنے اثر میں رکھتے آئے ہیں، اصل میں یہی بزنس ہاؤس یہاں حکومت کی پالیسیاں بناتے ہیں حکومت کو اہم معاملوں میں مشورے دے رہے ہیں۔ یہ بزنس ہاؤس نیشنل کانفرنس کی حکومت میں کلیدی رول ادا کرکے کانگریس کی بھی مالی مدد کرتے ہیں کسی بھی حکومت کو بنانے اور بگاڑنے میں ان بزنس ہاؤسوں کو بڑا گہرا ہاتھ ہوتا ہے، ان کے مشوروں پر نہ صرف وزراء کا انتخاب ہوتا ہے، بلکہ کس منسٹر کو کونسا پورٹ فولیو دیا جائے اس میں ان کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔

حکومت کے پالیسی ساز اصل میں یہی بزنس گھرانے ہیں، جن کی یہاں لسٹ مرتب کی گئی۔

سرینگر میں ایک ہفتہ تک قیام کرنے کے دوران یہ ارکان ان فرموں کا پتہ لگانے

میں کامیاب ہوئے جو سرکار کے ساتھ قریبی تعلق رکھتے ہیں، ایسی فرموں کی نشاندہی کرنے میں ڈی، پی در کے فرزند وجے در نے اہم رول ادا کیا۔ مرکزی سرکار کے ارکان نے فرموں کی نشاندہی کرنے کے بعد قالینوں کے ایکسپورٹ پر کمیشن کا تخمینہ لگایا تو پتہ چلا کہ تیس کروڑ کے مال پر تین کروڑ کا کمیشن وصول کرلیا گیا ہے اور ان تین کروڑ کو نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ نے الیکشن فنڈ کا نام دیا ہے۔



(وجے در)

جب یہ ساری تفصیلات دہلی پہنچائی گئی تو اس کی رپورٹ وزیر خزانہ شری وینکٹارمن کو بھی بھیجدی گئی، وزیر خزانہ نے رپورٹ وزیر اعظم کو ضروری ہدایات کے لیے بھیجدی، وزیر اعظم کے دفتر سے جب ان فرموں پر کارروائی کرنے کی ہری جھنڈی دکھائی گئی تو ۷ر اپریل کو محکمہ انکم ٹیکس کی انفورسمنٹ ٹیم سرینگر آئی انھوں نے چھاپہ ڈالنے والی فرموں اور ان کے گھروں کے مکمل نقشے اور فوٹوگراف لے لیے۔ ۱۰ر اپریل کو یہ لوگ واپس دہلی گئے چونکہ لسٹ میں سبھی مسلمان بزنس ہاؤس تھے، لہذا دہلی میں دو مسلم فرموں کو کاٹ کر ان کی جگہ دو غیر مسلم فرمیں درج کی گئیں۔

۱۲ر اپریل کو انکم ٹیکس کی انفورسمنٹ ونگ کے کئی آفیسر دہلی سے ایک اسپیشل جہاز کے ذریعے سرینگر پہنچ گئے، سرینگر آتے ہی انھوں نے سی، آر، پی لیکر پلان کے مطابق اپنی کارروائی شروع کی۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ بات سارے شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔

وزیر اعلیٰ کو جب اس کارروائی کی اطلاع مل گئی تو انھوں نے ڈائرکٹر جنرل پولیس پیر غلام حسن شاہ کو طلب کیا اور انہیں ہدایت دی کہ وہ پولیس فورس لے کر ان متعلقہ فرموں کے بچاؤ کی کارروائی کریں۔

ڈائریکٹر جنرل پولیس جب اپنے مشن پر روانہ ہوگئے تو سی، آر، پی کے ڈی، آئی، جی نے انہیں مداخلت سے روک لیا۔ اس کی اطلاع وزیر اعلیٰ کو مل گئی تو وہ سخت بوکھلاہٹ کے شکار ہوگئے اور وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے بزنس گھرانوں کو بچانے کے لیے سامنے آنے لگے لیکن انفورسمنٹ ٹیم نے ان کی ایک بھی چلنے نہیں دی۔

وزیر اعلیٰ شیخ صاحب کو جب اطلاع ملی کہ انفورسمنٹ ٹیم کا لادھن ضبط کرنے کے

ساتھ ساتھ حساب وکتاب کے [illegible]ات اپنے قبضے میں کر رہی ہے تو وہ سخت پریشان ہو گئے انہوں نے پھر پولیس آفیسروں کو مداخلت کرنے کے لیے کہا لیکن وہ کوئی مداخلت کرنے سے روک دیئے گئے۔

شیخ عبداللہ نے فاروق عبداللہ کو طلب کر کے جب انہیں انفورسمنٹ ٹیم کی طرف سے فرموں کے حساب وکتاب کے کاغذات ضبط کرنے کی اطلاع دی تو ان کے گویا ہوش ہی اُڑ گئے۔

مرتا کیا نہ کرتا انہوں نے بھی اپنی طرف سے ان چھاپوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن ان کی بھی ایک نہ سُنی گئی، جب انہوں نے دیکھا چھاپہ مار ٹیم کالے دھن کے ساتھ کاغذات کی چھان بین کر کے ان کو اپنے قبضے میں کر رہی ہے۔ تا کہ تین کروڑ کے کمیشن کا سراغ مل سکے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور وہ جیپ میں سوار ہو کر رشید ٹیچو، حسن پاچہ، اے، آر، وانی اور حلقہ پریذیڈنٹ امیرا کدل محلہ، پریذیڈنٹ مائسمہ کو لیکر لال چوک کے لیبر یونین کے دفتر میں آکر مشورہ کرنے لگے۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی ہدایت پر چیدہ چیدہ اور نامور غنڈوں اور سینماؤں کے بلیک میلروں کو جمع کیا گیا۔ ان میں ہر ایک فرد کو پچاس پچاس روپے ایڈوانس دیکر یہ ہدایت دی گئی کہ وہ انفورسمنٹ ٹیم پر چھاپہ مار کر ان سے وہ کاغذات چھین لیں جن پر انھوں نے قبضہ کر لیا ہے، ان کاغذات کو فوری طور پر تلف کرنے اور جلانے کی تاکید کے ساتھ اس فورس کو محاذ پر بھیجدیا گیا، جانے سے پہلے ان کو کہدیا گیا کہ اگر تم اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں مالا مال کیا جائے گا، اگر اس مہم کے دوران کسی کو چوٹ لگے تو اُسے اس چوٹ کا پورا معاوضہ دیا جائے گا۔ کسی کو گرفتار کر لیا گیا تو اسے چھڑا لیا جائے گا۔ کشمیر پولیس کے جوان سول وردی میں تمہاری مدد کریں گے۔

ڈائریکٹر آف انسپکشن اینڈ انوسٹی گیشن انکم ٹیکس مسٹر کے، آر، راگھون کالا دھن اور حساب وکتاب کے کاغذات بر آمد کرنے کے سلسلے میں ۱۲ اپریل کو ۸ بجے شام علی محمد متّو کی کوٹھی میں عملے کو لے کر آئے تو انہیں خوب دھمکایا گیا لیکن جب وہ ان دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوئے تو جن کمروں میں وہ تلاشیاں لینے آئے ان کمروں کو باہر سے تالا لگا کر ایک طرح سے انہیں محبوس کیا گیا۔ پورے ۲۴ گھنٹوں تک کمروں میں

قیدی بنا کر رکھنے کے بعد جب ان کے تالے کھولے گئے تو سول وردی میں پولیس کے سپاہیوں اور کرایہ کے جوانوں کی مدد سے ان سے کاغذات لے کر ضائع کر دیئے گئے۔ کرایہ کے جوانوں نے کاغذات کو توڑ پھوڑ کرنے کے ساتھ خاتون آفیسروں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ضبط تحریر میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔

سی۔ آر، پی کے جوان جو گیٹ پر اور پارک میں کسی کو اندر جانے اور اندر سے باہر آنے سے روک رہے تھے، کوٹھی کے اندر کے حالات سے بالکل بے خبر رکھے گئے متّو برادرس کی کوٹھی پر کارروائی کے دوران ایک اور ٹیم ڈلگیٹ میں ایم، اے رمضانا کی فرم کی چھان بین کر رہی تھی۔ ایم، اے رمضانا کے گیٹ کے پاس ایک جیپ گاڑی میں وہ سارا ریکارڈ تھا جو انفورسمنٹ ٹیم نے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔

یکایک ایک ہنگامہ سا ہوا اور اس ہنگامے میں جیپ گاڑی سے تمام فائلیں اور کاغذات نکال کر توڑ پھوڑ کر جھیل ڈل میں پھینکے گئے۔ انفورسمنٹ ٹیم پر حملہ کیا گیا سی، آر، پی کی موجودگی میں کئی آفیسر زخمی کر دیئے گئے۔

یہ ساری کارروائی اچانک کچھ اس انداز سے کی گئی کہ جس کا کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا، کاغذات تلف ہونے پر نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کسی قدر مطمئن ہوئی، لیکن پھر بھی یہ خدشہ دامنگیر رہا کہ کہیں کمیشن کا ثبوت انہیں مل نہ گیا ہو۔ تیسرے روز انفورسمنٹ کی یہ ٹیم زخمی حالت میں واپس دہلی روانہ ہو گئی البتہ انھوں نے ایک کروڑ کے قریب کالا دھن بر آمد کر ہی لیا۔

دہلی پہنچ کر ایرپورٹ پر جب ٹیم میں شامل بعض آفیسروں کو زخمی حالت میں اسٹریچروں کے ذریعے باہر لایا گیا تو مرکزی سرکار کے ساتھ اپوزیشن نے اس کا سخت نوٹس لیا۔

انفورسمنٹ ٹیم کے ساتھ اس قسم کا واقعہ پہلی بار پیش آیا تھا۔

وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ نے مرکزی سرکار کی اس کارروائی پر سخت ترین الفاظ میں مذمّت کی اور کہا۔

" انہوں نے دہلی واپس جا کر زخمی ہونے کا ایک ڈرامہ رچایا وہ اپنے حقیقی مقصد سے حکومت اور کسی آفیسر کو آگاہ کرنے میں ناکام رہے، وہ

چھاپوں کی تفصیل بیان کیے بغیر مقاصد سے ہمیں مطلع کر سکتے تھے، اس کے بجائے انھوں نے سی، آر، پی سے مدد مانگی ایسا کرنے کا اُن کو حق نہ تھا۔ کیوں کہ سی، آر، پی کی جو بٹالین یہاں تعینات ہیں وہ اسٹیٹ کنٹرول کے تحت کام کرتی ہیں، جب مختلف بزنس ہاؤسوں میں چھاپے شروع ہوئے اُن کے ملازم اور دوسرے لوگ دیکھتے رہے بچوں اور عورتوں کے ساتھ چھاپہ مار ٹیموں کا سلوک بہت ہی بُرا اور زور و زبردستی کا تھا۔ جب لوکل پولیس کو خبر کی گئی تو وہ تحقیقات کرنے موقع پر گئی تو ان کے ساتھ بھی بُرا سلوک کیا گیا۔

اگر چھاپہ مار ٹیم قالین بنانے والوں سے کالا دھن برآمد کرنا اور حساب و کتاب دیکھنا چاہتی تھی تو ایسا چند ایک مینوفیکچروں کے ساتھ ہی کیوں کیا گیا؟ ان سے پوچھا گیا، شیخ عبداللہ کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے یہ سب کچھ ظاہر کرتا ہے کہ چھاپوں کے پیچھے کوئی مذموم سیاسی مقصد تھا۔"

وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ کے اس بیان کے جواب میں وزیر خزانہ شری وینکٹارمن (موجودہ صدر مملکت ہندوستان) نے فرمایا:۔



"یہ صحیح نہیں ہے کہ سرینگر میں چھاپے سیاسی مقاصد کے لیے ڈالے گئے ہیں، دراصل چھاپے ان اطلاعات کی بنا پر ڈالے گئے جو محکمہ کو ملی تھیں، چھاپوں کے دوران جو بے حساب ہندوستانی اور غیر ملکی کرنسی سونا اور دوسری چیزیں ضبط کی گئیں ان کی مالیت ایک کروڑ ہے۔

(وینکٹارمن)

انکم ٹیکس آفیسروں کو معلوم نہیں تھا کہ شیخ صاحب کے ساتھ ان کا کیا رشتہ ہے اور نہ ہی انھوں نے شیخ صاحب کے ساتھ رشتہ کے بارے میں کوئی تحقیقات کی، ہمیں اس بات سے غرض نہیں کہ ان کا تعلق کس جماعت سے ہے اور کن کے ساتھ ان کے رشتے ہیں۔ شیخ عبداللہ کچھ بھی کہیں ان لوگوں کے بارے میں جو اطلاعات محکمہ کو ملی تھیں

انہوں نے اسی کے مطابق اپنی کاروائی کی اور یہ ضروری نہیں کہ مرکزی سرکار چھاپوں کے بارے میں ریاستی حکومت کو مطلع کرے، اگر ہم ایسا کرتے تو سارا راز فاش ہو جاتا، جب انکم ٹیکس حکام نے پولیس کے ڈی، آئی، جی سے مدد مانگی تو اس نے کوئی مدد نہ دی ان کو لوکل پولیس یا سی، آر، پی سے حفاظت کے لیے مدد مانگنے کا حق ہے اور یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کس سے مدد مانگیں۔ انکم ٹیکس آفیسروں نے کوئی ڈراما نہیں کیا بلکہ ان کے جسموں پر زخم لگے ہیں وہ سچائی ظاہر کرتے ہیں۔ زنانہ آفیسروں کو بھی نہیں چھوڑا گیا — تمام ہندوستان نے اس کاروائی کی حمایت کی حتیٰ کہ کشمیر میں بھی سوائے شیخ عبداللہ اور ان کے خاندان کے کسی اور نے اس کاروائی کی مخالفت نہیں کی ہے۔"

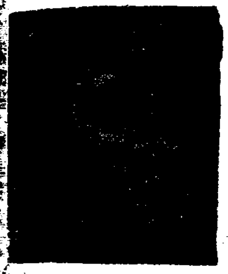
ی سرکار دراصل تین کروڑ کے کمیشن کا ثبوت لے کر شیخ صاحب کو بلیک میل کرنا چاہتی تھی دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں وہ اپنا وعدہ پورا کر سکے، کیونکہ اس بارے میں وہ آئے دن ٹول سے کام لے رہے تھے۔ یکم مئی کو شیخ محمد عبداللہ نے اقبال پارک میں عوامی جلسہ کر مرکزی سرکار کو بُرا بھلا کہنے کا خوب مظاہرہ کیا — کل تک جو بھارت کے ساتھ الحاق یاست کے لیے ناقابلِ تنسیخ اور اٹوٹ الحاق کی قسمیں کھا رہا تھا اور دفعہ ۳۷۰ ختم کر کے وستان کے سمندر میں ریاست کو غرق کرنے کا سامان مہیا کر رہا تھا۔ انکم ٹیکس کے وں سے بوکھلاہٹ کا ایسا شکار ہوا کہ وہ ایسی بولی بولنے لگے جو ۲۲ سالہ جدوجہد اقتدار بھی ہمیں سننے کو نہیں ملی تھی۔

اس روز عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"ہم نے ہندوستان کے ساتھ صرف تین چیزوں کا معاہدہ کیا ہے۔ دفاع، امور خارجہ اور رسل و رسائل — کشمیر ہندوستان کا حصّہ ہے لیکن کالونی نہیں۔ انکم ٹیکس چھاپوں سے پہلے ریاستی سرکار کو مطلع کرنا تھا۔ انکم ٹیکس والوں کو دلی میں اسٹریچروں پر لٹا کر ہمیں بدنام کیا گیا اس طرح کا ڈراما کھیلنے کا مقصد یہ تھا کہ نیشنل کانفرنس کو پورے ملک میں بدنام کیا جائے لیکن ہندوستان کے لوگ اتنے بے وقوف نہیں کہ وہ ایسی

باتوں کا اعتبار کریں، چھاپہ مارنے والوں سے پوچھا گیا، شیخ عبداللہ سے تمہارا
کیا رشتہ ہے وہ چھاپہ مارنے آئے تھے یا رشتہ معلوم کرنے، انکم ٹیکس
چھاپوں کے دوران کالا دھن برآمد کرنے کا مقصد نہیں تھا، مقصد کچھ
اور ہی تھا۔ یہ سب ہم پر دباؤ ڈالنے کے لیے کیا جا رہا تھا۔"

سرینگر میں اقبال پارک کے جلسہ کے بعد انھوں نے سوپور جا کر وہاں بھی عوام کے سامنے اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:



"ہم نے الحاق کیا ہے عزت و آبرو
کا سودا نہیں کیا ہے۔

موئے مقدس کے ملزم کہاں ہیں؟ اتنے سال گزرنے کے باوجود یہ معاملہ راز کیوں؟ کوئی بھی ہستی ریاست کے لوگوں پر اپنا فیصلہ ٹھونس نہیں سکتی، صدیوں کی محکومی اور تسلط کے بعد ریاست کے لوگ اب اپنی تقدیر کے خود مالک ہیں وہ کسی کو بھی اپنی تقدیر سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیں گے (ان کی تقدیر کے ساتھ کھیلنے کے جملہ حقوق میرے پاس محفوظ ہیں) بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی آزادی (اقتدار) کی ہمیں رکھوالی کرنی ہے اس آزادی (اقتدار) کو متحد ہو کر اور قربانیاں دے کر محفوظ رکھنا ہے، موجودہ حکومت کو عوام کی (بھیڑ، بکریوں کی) مکمل حمایت حاصل ہے، اسی میں عوام کا استحکام مضمر ہے۔"

انکم ٹیکس چھاپوں کے بعد شیخ عبداللہ کا اس قسم کا واویلا بتا رہا تھا، جہاں وہ ہندوستان کے حکمرانوں کو بلیک میل کر رہا ہے، وہاں کشمیر کے نادان اور ناسمجھ عوام کو ہندوستان کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کر رہا ہے، یہاں کی انسانی صورت کی بھیڑ بکریوں کو بھارت کے خلاف اُکسا رہا ہے۔

۱۹۷۵ء کے ایکارڈ کے بعد جن کا ہندوستان دین و ایمان تھا، جس کی عظمت کی وہ قسمیں کھا رہا تھا۔ صرف ایک چھاپہ میں کمیشن کی چوری پکڑنے کے ڈر سے وہ اس قدر بوکھلائے کہ انہیں شیر مادر کی طرح وہ معاہدہ یاد آگیا جس میں صرف تین چیزوں کے ساتھ الحاق کیا گیا

۱۹۷۵ء کے بعد وہ کونسا دن نہیں گزرا جب شیخ عبداللہ نے یہ نہ کہا ہو ہندوستان ساتھ ہمارا الحاق ناقابلِ تنسیخ ہے۔ آج وہ کہہ رہے ہیں ہم نے الحاق کیا ہے عزت و آبرو سودا نہیں کیا ہے۔ یہاں بھی وہ نادان لوگوں کو لفظوں کے پھیر میں الجھا رہے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے ساتھ الحاق نہیں کیا ہے بلکہ باضابطہ ایک سودا کیا ہے۔

انکم ٹیکس چھاپوں کے بارے میں واویلا کرنے کے لیے وزیر اعلیٰ نے وادی کا دورہ شروع کیا، اُدھر پارلیمنٹ میں وزیر خزانہ نے انکم ٹیکس چھاپوں اور چھاپہ مار ٹیم پر مارپیٹ کرانے اور ضبط شدہ کاغذات ضائع کرانے کی تفصیلات بتا کر اس ساری کارروائی کا الزام ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر فاروق عبداللہ پر عائد کیا۔ اس کے جواب میں فاروق عبداللہ نے کہا۔

"وہ کشمیر اور ملک کے کسی اور حصے میں کالا دھن برآمد کرنے یا فرموں کا حساب و کتاب دیکھنے کے خلاف نہیں، جس دن چھاپے پڑے میں سرینگر میں موجود نہیں تھا، لہٰذا یہ کہنا کہ میں نے انفورسمنٹ ٹیم پر حملہ کروایا، غلط ہے۔ وزیر خزانہ نے مجھ پر اس قسم کا الزام غلط اطلاعات پر لگایا ہے۔"

پیپلز کانفرنس کے لیڈر نے ۵ مئی کو پریس کانفرنس میں بتایا۔

"وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ عوام کے جذبات کا استحصال کر رہے ہیں شیخ صاحب نے یکم مئی کو اقبال پارک میں جو تقریر کی یہ تقریر جہاں اکثریت کو گمراہ کرنے کے لیے کی گئی وہاں اقلیت کے لیے توہین آمیز ہے اور اس سے وہ عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا ہو گئے ہیں، بالکل اسی طرح مسز اندرا گاندھی کے جموں والی تقریر ریاست کے اکثریتی فرقہ کے دلوں میں اندیشے اور وسوسے پیدا کر ڈالتے ہیں۔

پچھلے سال جب انڈین آرمی نے بے گناہ اور نہتے عوام پر حملہ کیا تو شیخ صاحب کی دلیل یہ تھی کہ اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور آج جب انکم ٹیکس والوں نے ان کے بعض رشتہ داروں اور ان کے حمایتیوں پر چھاپے مارے تو وہ بوکھلا گئے ہیں، وہ عوام کو ایک بار اور مسئلہ الحاق میں الجھانے لگے ہیں اور اس کارروائی کو کشمیر کی

اٹانومی میں مداخلت قرار دینے لگے ہیں۔ شیخ صاحب آج ۱۹۵۳ء کی آئینی پوزیشن کا بھی ذکر کرنے لگے ہیں آج انہیں برسوں کے بعد خیال آیا ہم نے مرکز سے صرف دفاع امور خارجہ اور رسل ورسائل کا معاہدہ کیا ہے اور بس ۔!

شیخ صاحب آج آٹانومی کی بات کر رہے ہیں لیکن جب ہماری پارٹی نے اس سلسلے میں اسمبلی میں بل پیش کیا تو اس وقت اس بل کی شدید مخالفت کی اور ہم پر فتنہ جگانے کا الزام لگایا۔

شیخ صاحب جب اقتدار سے محروم ہوتے ہیں یا ہونے لگتے ہیں تو دوسری بولی بول کر مرکزی سرکار کو بلیک میل کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر فاروق عبداللہ دہلی سے جموں آئے تو ۱۱ مئی کو شیر کشمیر بھون میں شہری استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے منعقدہ اجلاس میں انھوں نے اور باتوں کے علاوہ فرمایا۔

"لوک سبھا میں، میں نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے اسپیکر نے مجھے اپنا نقطۂ نگاہ واضح کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دیا۔ سرینگر میں ایک خاص منصوبے اور مقصد کے لیے چھاپے ڈالے گئے ایک محدود سطح کے چھاپے کالا دھن ڈھونڈ نکالنے میں کسی طرح مددگار ثابت نہیں ہو سکتے کیونکہ کالا دھن نے سارے ملک کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے، انتخابات بھی تو کالے دھن سے لڑے جاتے ہیں اور جو کوئی بھی شخص اقتدار میں آجاتا ہے وہ کالا دھن رکھنے والوں کا تحفظ کرتا ہے۔"

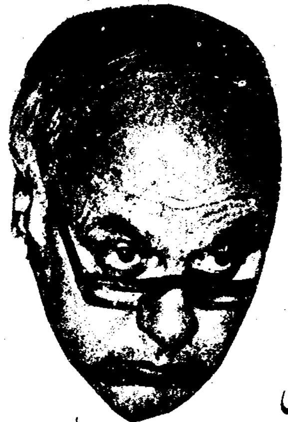
ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے اس بیان نے بزنس گھرانوں سے الیکشن فنڈس کے نام پر کمیشن وصول کرنے کی تصدیق کر دی جس کمیشن کی شہ پا کر انفورسمنٹ کی ٹیم کے ساتھ مرکزی سرکار پر جو الزامات لگائے تھے وہ فاروق عبداللہ کے اس بیان سے بے وزن ہو گئے۔

فاروق عبداللہ کی طرف سے جموں کی شہری کونسل میں اس بیان کو جہاں اپوزیشن نے خوب اچھالا، وہاں شیخ عبداللہ بے حد سیخ پا ہو گئے۔

اگلے روز جب فاروق عبداللہ جموں سے سرینگر آئے تو گھر میں قدم رکھتے ہی والد صاحب نے انہیں اپنے پاس بھٹکنے بھی نہیں دیا۔ انھوں نے اپنی بیگم کو کہدیا وہ

اس کپوت کو یہاں سے چلے جانے کو کہے جس نے سرِ راہ ہمارا بھانڈا پھوڑ دیا، اور مجھے کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رکھا۔

اس مسئلے پر باپ بیٹے کے درمیان چند روز تک بول چال بالکل بند رہی، چوتھے روز جب بیگم عبداللہ اپنے بیٹے کو لے کر شیخ صاحب کے سامنے حاضر ہوئیں اور اُن سے بیٹے کو معاف کرنے کی استدعا کی،


(فاروق عبداللہ)

اس موقع پر شیخ صاحب نے بیٹے سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"کل جب تم میری کرسی پر بیٹھو گے تو کیا اسی قسم کی بیہودہ باتیں کرو گے۔؟

بیٹے نے شرم سے گردن جھکا لی، البتہ باپ کو خوش کرنے کے لیے وہ مجاہد منزل گئے اور وہاں حاضرین سے خطاب فرمایا۔

"کشمیر پر کٹھ پتلی حکومتیں مسلط کرنے کا زمانہ ختم ہوا ہے ہماری ریاست کانگریس کی جاگیر نہیں، مرکزی سرکار کو یہ ذہن نشین کرنا چاہیے وہ وقت اب دوبارہ نہیں آسکتا جب کشمیر پر نئی دہلی سے حکومتیں ٹھونسی جاتی تھیں، پردیش کانگریس آئی کے لیڈروں کو جاننا چاہیے کہ ہم کانگریس کو کسی بھی صورت میں یہاں ٹکنے نہیں دیں گے نیشنل کانفرنس اس بات کی حامی ہے کہ کالا دھن جہاں کہیں بھی ہو اس کی کھوج لگائی جانی چاہیے لیکن جس طریقے پر مرکزی سرکار نے کشمیر پر دھاوا بول دیا اس نے یہ بات کسی شک وشبہ کی گنجائش کے بغیر ثابت کر دی کہ اس مہم کے سیاسی مقاصد ہیں۔"

شیخ عبداللہ نے مرکزی سرکار کی اس قسم کی کارروائی پر اپنی جاری مہم کے تحت ۵ رجون ۱۹۸۱ء کو معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی افتتاحی تقریب کے موقع پر حضرت بل کے آستانۂ عالیہ پر عوام سے خطاب فرماتے ہوئے کہا۔

"عوام ان لوگوں سے ہوشیار رہیں جو ایکبار پھر ان کے سروں پر سوار ہوکر ان کی آزادی چھین لینا چاہتے ہیں جو آزادی انھوں نے کافی جدّوجہد سے حاصل کی ہے۔ آج روپے اور لالچ کے ذریعے نیشنل کانفرنس کے اس قلعہ میں درار پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو قلعہ اس ریاست کے عوام نے اپنی کوششوں سے تعمیر کیا ہے، یہ قلعہ اگر مسمار ہوگیا تو اب تک کی آزادی کا سارا ماحصل مٹ جائے گا، جو لوگ ریاست کے لوگوں کی آزادی کے بعد دشمن ہیں وہ مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں، کشمیری عوام نے صدیوں کی مصیبتوں کے بعد جب اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا شروع کیا اور انھوں نے اپنی حکومت میں ترقی کرنا شروع کی تو مخالف (یعنی ہندوستان کے حکمران) اس ترقی سے گھبرا گئے، آپ نے دیکھا پچھلے دنوں کچھ کاروباری گھرانوں پر چھاپے مارے گئے۔ اس سے ریاست کی کاروباری زندگی بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔ ان کے کاروبار پر حملہ کرنے کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں ان کی دوکانوں پر بھی یلغار کی گئی۔ اُن کا مال ضبط کیا گیا۔ ان کے پاس ضروریاتِ زندگی کا سامان بھی نہیں رکھا گیا۔

ان گھرانوں پر چھاپہ کیوں مارا گیا؟

وہ قوم جو صدیوں سے افلاس وجہالت میں زندگی گزار رہی تھی اور جس نے اب چلنے کا سلیقہ اختیار کرکے ترقی کرنا شروع کی تھی ان کو پریشان کر دیا گیا۔

اور ان لوگوں کو کشمیر کی ترقّی ایک آنکھ نہیں بھائی وہ ان کی ترقی سے خائف اور پریشان ہیں جو لوگ کشمیری عوام کو پریشان رکھنے کے ارادے رکھتے ہیں، وہ خود پریشان ہوں گے۔ ہم نے ابتداء سے ہی یہ عزم کر رکھا ہے، ہم اپنی تقدیر سے کسی کو کھیلنے نہیں دیں گے، یہ ہمارا آج کا نعرہ نہیں، ہم نے ابتداء میں ہی اس عزم کے ساتھ میدان میں

قدم رکھا، ہم نے اپنی جدوجہد سے وہ مقام (اقتدار) حاصل کر لیا جس مقام تک پہنچنے کی ہم سعی کر رہے تھے، لیکن ہماری آزادی کے دشمنوں نے اپنے ہتھکنڈے استعمال کرنے کا سلسلہ جاری رکھا وہ مختلف روپ دھار کر لوگوں کے سامنے آگئے۔ ان میں سے ایک روپ وہ بھی تھا جو آپ نے دیکھ لیا۔"

وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کا یہ بیان زبانِ حال سے کہہ رہا ہے۔ بڑا خطرناک ہے یہ ہندوستان جس کے ساتھ ہم نے سوچ سمجھ کر الحاق کیا، جس کے اصول اور آدرش ہمیں بڑے عزیز تھے۔ ہندوستان اور ہندوستانی حکمران کشمیری عوام کے سخت ترین دشمن نکلے کیونکہ وہ ہماری ترقی سے خائف اور پریشان ہیں۔ وہ کشمیری عوام کو پریشان رکھنے کے ارادے رکھتے ہیں۔

شیخ صاحب! کشمیری عوام کے سامنے ہندوستان کو خطرناک دشمن کے طور پر پیش کرنے اور اس کا مکروہ چہرہ دکھانے کے بعد آپ کو ان سے دُور بھاگنا چاہیئے تھا۔ آپ کو پل بھر کے لیے بھی ایسے دشمن کا ساتھ نہیں دیا جانا چاہیئے جو ہماری آزادی کے خلاف مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ کشمیری عوام کو ہندوستان جیسے دشمن ملک کے خلاف بھڑکانے کے بعد آپ کے پاس اس بات کا کیا جواز ہے کہ آپ اسے قابلِ اعتبار دوست کہیں اور ہمیں ہندوستان میں غرق ہونے کا نیک مشورہ دیں تاکہ ہم ترقی سے ہمکنار ہو سکیں۔

چند بزنس گھرانوں پر چھاپہ مارنے کی کاروائی سے مشتعل ہوکر ہندوستان کے حکمرانوں کا مکروہ چہرہ دکھانے کے بعد جب آپ کی کرسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی گئی۔ تو دونوں طرف کی اس بلیک میلنگ میں آپ نے اقتدار کے لیے اپنی ہار تسلیم کر لی اور دفعہ ۳۷۰ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کا آغاز کیا۔

آپ نے ایوانِ اسمبلی میں فرمایا:

"مرکز کے ساتھ ریاست کے تعلقات پوری طرح واضح ہیں، ریاست کے عوام نے ہند یونین کے ساتھ اپنا مقدر وابستہ کیا ہے اور یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں تھا بلکہ شعوری طور پر کیا گیا تھا۔ تاہم آئین میں

یہ بات درج ہے کہ اگر ریاست کے لوگ چاہیں تو وہ مرکز کو زیادہ اختیارات منتقل کر سکتے ہیں۔ ریاست کی ترقی کے لیے ایسا کرنا چاہیئے، کوئی بھی بات چاہے وہ دفعہ ۳۷۰ ہی کیوں نہ ہو حرفِ آخر نہیں ہے، موجودہ حالات کو مستحکم کرنے کے لیے ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے، دفعہ ۳۷۰ اتنی مقدس نہیں کہ اسے بدلا نہ جائے۔"

ریاست کے سب سے بڑے حاکم کا کل اور آج کا بیان ناقابلِ غور اور قابلِ توجہ ہے، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی شخص جو ذرا بھی عقل و شعور رکھتا ہو جس کے پاس تھوڑی سی بھی غیرت اور ضمیر ہو وہ ایسے شخص کو حاکم قبول کرے اور لیڈر تسلیم کر سکے۔ انسانوں کی دنیا میں انہیں ایک بھی حمایتی ڈھونڈھ کر بھی نہیں ملتا جو کل کی بات آج بھول جائے۔ ان کی بات چھوڑیئے جو اَن پڑھ اور جاہل ہیں، میں یہاں ان کی بات کر رہا ہوں جو پڑھے لکھے ہیں، ایم، ایل اے ہیں منسٹر ہیں تنظیم کے چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز ہیں نیشنل کانفرنس اور اس کی لیڈر شپ کو اپنا اعتماد دے کر اس کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر کے سات نکات کے وہ جوہر کہاں رکھ چھوڑ آتے ہیں جو باری تعالیٰ نے خاص طور پر حضرت انسان کو عطا کیے ہیں، اور جن کی بنا پر ایک انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔

(۱) زبان (۲) سوچ (۳) شعور (۴) جرأت (۵) اصول (۶) غیرت (۷) ضمیر

صاف ظاہر ہے نیشنل کانفرنس کے ساتھ وابستہ اشخاص ان جواہرات سے محروم نہ ہوتے تو ان کی لیڈر شپ آئے دن ایسے رنگ نہ بدلتی جس سے گرگٹ بھی شرما جائے۔ بیشک یہ لوگ نیشنل کانفرنس کے ساتھ وابستہ رہ کر مختلف عہدے حاصل کر کے لاکھوں روپے معاوضے کے طور پر حاصل کر رہے ہوں اور عیش و عشرت کی زندگی بھی گزار رہے ہوں لیکن تاریخ ان لوگوں کو کس نام سے یاد کرے گی اور انہیں کونسا درجہ دے گی، آنیوالی پود ان لوگوں کے بارے میں کیا تصوّر کرے گی یہ ایک غور طلب بات ہے۔





کشمیر کے بزنس گھرانوں پر
انفورسمنٹ ٹیم کے چھاپے کا منظر



ڈلگیٹ میں واقع بلیوارڈ پر انکم ٹیکس ٹیم سے تمام کاغذات چھین کر پرزے پرزے کیے گئے
اور ان پرزوں کو جھیل ڈل کے سپرد کیا گیا

جو مخملیں سبھاؤں میں خوش رنگ پھول تھے
چھو کر جو اُن کو دیکھا تو چبھتے ببول تھے

ریاست کی خصوصی پوزیشن دفعہ ۳۷۰ کے محافظ اپنے اصلی رُوپ میں

ریاست کی خصوصی پوزیشن دفعہ ۳۷۰ کو ۱۹۵۲ء میں دہلی ایگریمنٹ کے تحت جب آئینِ ہند میں درج کیا گیا اُسی وقت اس کے خلاف ایک محاذ کھڑا ہو گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے گوپالا سوامی آئینگر اگر اُس وقت اپوزیشن کے ساتھ مرکز کے دیگر رہنماؤں کو یقین دہانی نہیں کراتے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس دفعہ کو ختم کر دیا جائے گا اور ریاست جموں و کشمیر کو دوسری ریاستوں کے ہم پلّہ لایا جائے گا تو ہنگامہ نہ جانے کونسی صورت اختیار کر جاتا۔

چنانچہ اس دفعہ کے جنم کے ساتھ ہی اس کی موت کا آغاز کیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو جب تک حیات تھے وہ اس بارے میں صبر سے رہنے کی تلقین کیا کرتے۔ ان کا نظریہ تھا کہ اس بارے میں جلد بازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جبکہ پارلیمنٹ کے ہر سیشن میں انہیں اس کے بارے میں مطالبات سُننے پڑتے، مرکزی سرکار کی اس کارروائی میں بخشی غلام محمد زبردست رکاوٹ تھے۔



بخشی غلام محمد

پنڈت نہرو کی وفات کو ابھی صرف ساڑھے تین مہینے ہوئے تھے کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۴ء کو لوک سبھا میں پہلی بار ایک غیر سرکاری بل پیش کیا گیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ بھارتیہ آئین کی دفعہ ۳۷۰ کو ہٹا دیا جائے۔

یہ بل لوک سبھا کے ایک آزاد ممبر وید پرکاش شاستری نے پیش کیا۔ اس بل پر جو تقریریں کی گئیں اس نے یہ بات واضح کر دی کہ اسے

پورے ایوان کی تائید و حمایت حاصل ہے، ایچ، وی کامتھ نے حکومت کو یاد دلایا کہ شیخ عبداللہ کی رہائی کا معاملہ جب اس ایوان کے سامنے آیا تو شری گلزاری لال نندہ نے جو اُس وقت وزیر داخلہ تھے اور لال بہادر شاستری وزیر بے محکمہ تھے ان دونوں نے اپنے اپنے انداز میں ایوان کو یقین دلایا تھا کہ دفعہ ۳۷۰ جلدی ہی منسوخ نہ بھی کی گئی تو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ اپنی موت آپ مر جائے گی۔ کیونکہ شق نمبر ۲۱ میں اسے عارضی دفعہ درج کیا گیا ہے۔

اس وعدے کے پیش نظر آزاد ممبر نے مطالبہ کیا کہ اس دفعہ کو دستور سے حذف کرنے کا وقت اس لیے آگیا ہے کہ . . .

کابینہ، کانگریس پارٹی، پارلیمنٹ یا پورے ملک میں اس دفعہ کو قلم زد یا حذف کرنے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

ایک ذمہ دار کانگریسی ممبر ہنو منتھیا نے کہا۔

"میں وزیر داخلہ سے اپیل کروں گا کہ اس مسئلے کو جمہوری نقطۂ نظر سے دیکھیں کشمیر ہی کے ممبر پارلیمنٹ کا نہیں بلکہ ہم جملہ ممبران کا بلا لحاظ پارٹی، انتہا پسند دائیں بازو سے لے کر بائیں بازو تک کا خیال ہے کہ دفعہ ۳۷۰ کے حذف کرنے کے اس بل کو قانون میں تبدیل کر دیا جائے، اس کی مخالفت کرنا یا اس کے خلاف کچھ کہنا دستور سے انکار کرنے کے مترادف ہے"

ان سب تقریروں کو سننے کے بعد این سی، چٹرجی نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گورنمنٹ کو فوری طور پر اعلان کر دینے میں کیا قباحت محسوس ہو رہی ہے ہم اس مطالبے کی مکمل طور پر حمایت کرتے ہیں کیونکہ یہ فرقہ وارانہ مطالبہ نہیں ہے بلکہ قومی مطالبہ ہے"

قبل اس کے کہ اس دفعہ کے بارے میں کوئی کاروائی کی جاتی پارلیمنٹ ممبر مسٹر کھڈ لکر نے فرمایا:

"میں اس سے متفق ہوں کہ کشمیر اور اہل کشمیر کو قومی زندگی کے دھاروں میں ضرور ملا دینا چاہیئے اور اب دستوری یا کسی اور دیوار (کشمیر اور ہندوستان کے درمیان) حائل ہونے کی ضرورت نہیں ہے

لیکن اس وقت ہم خود ہی دفعہ ۳۷۰ کو اگر کالعدم قرار دیتے ہیں تو یہ قدم اٹھانے سے پہلے اس فیصلے کے مختلف پہلوؤں پر بھی ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا مجھے اس میں شک ہے کہ یہ ایوان ایسا کرنے کا مجاز بھی ہے، مجھے دستوری نگاہ سے اس میں شبہ ہے کہ یہ ایوان ایسا قدم اٹھا بھی سکتا ہے، دفعہ ۳۷۰ کو حذف کرنے کی کاروائی پارلیمنٹ سے نہیں بلکہ کشمیر اسمبلی کی طرف سے ہونی چاہیئے، جو ممبران اس دفعہ کو ہٹانے کی کاروائی پارلیمنٹ سے کرانا چاہتے ہیں، وہ اس دفعہ کی نوعیت سے غیر واقف ہیں"

کھڈ لکر کی یہ دلیل سن کر اس بل پر کاروائی روک دی گئی۔

اس کے بعد کشمیر اسمبلی کے ذریعے ریاست کے وزیر اعلیٰ پر دباؤ ڈالا جانے لگا خواجہ غلام محمد صادق اپنی وزارت بچانے کی خاطر دفعہ ۳۷۰ کو کھوکھلا کرنے پر راضی ہو گئے، انہوں نے جو کسر چھوڑی تھی وہ میر قاسم نے پوری کر دی انکے بعد شیخ عبداللہ رہی سہی کسر پوری کر گئے۔

کشمیر ایکارڈ کی بات چیت کے دوران جب مسز اندرا گاندھی نے کشمیری عوام کے ہما شیر کشمیر کو تولا، ٹٹولا تو انہیں بخوبی پتہ چلا اگر دفعہ ۳۷۰ کو مکمل طور پر کوئی ختم کر سکتا ہے تو یہی وہ شخص ہے اور کوئی نہیں۔

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر شیخ محمد عبداللہ مجھ سے وعدہ نہ کرتے کہ میں اس دفعہ کو ختم کر کے دوں گا تو میں ان کے ساتھ سمجھوتہ کر کے انہیں دوبارہ اقتدار حوالہ نہیں کرتی۔



(مرارجی اور اندرا)

جنتا دورِ حکومت میں مسز اندرا گاندھی کے وزارت عظمیٰ کے عہدے سے محروم ہونے پر وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے اگرچہ اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اب مجھ پر دفعہ ۳۷۰ ختم کرنے کا دباؤ نہیں ہوگا لیکن ان کا یہ اطمینان ایک سراب ثابت ہوا، اس لیے کہ جنتا سرکار نے ان سے یہ دفعہ ہٹانے کا تقاضا کرنا شروع کیا در اصل اس کی ڈور مسز اندرا گاندھی

نے ہی کھینچی تھی۔

مرکز میں جنتا سرکار کے برسرِ اقتدار آتے ہی وزیرِ اعظم مرار جی ڈیسائی مسز اندرا گاندھی سے ملنے گئے۔ اور اُن سے کشمیر اور شیخ عبداللہ کے بارے میں مشورہ حاصل کر لیا جنھوں نے جموّں و کشمیر کے شیر کے مُنہ سے سارے دانت نکال دیئے تھے۔

مرار جی ڈیسائی مسز اندرا گاندھی سے کشمیر اور شیخ عبداللہ کے بارے میں ضروری ہدایات حاصل کرنے گئے تو اندرا جی نے انھیں بتایا۔

"کشمیر کو شیخ عبداللہ کے ذمّے چھوڑ دو، وہ جیسا کرتے ہیں انھیں کرنے دو، شیخ عبداللہ سے بڑھ کر وہاں کوئی اور ہمارے لیے مفید آدمی نہیں ہے۔ شیخ عبداللہ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہم اتنا بڑا کام نہیں کر سکتے جو ہم نے ایکارڈ میں کیا ہے۔ شیخ عبداللہ واحد شخص ہے جو دفعہ ۳۷۰ ختم کر کے دے سکتا ہے۔ مجھے حسبِ وعدہ اُن سے یہ کام لینا تھا۔ اب آپ چاہیں تو اُن سے یہ کام لے سکتے ہیں۔"

مسز اندرا گاندھی سے اس قسم کا مشورہ حاصل کرنے کے بعد جنتا سرکار نے شیخ عبداللہ کو اس دفعہ کے ہٹائے جانے کا تقاضا ضرور کیا لیکن کوئی زور زبردستی نہیں کی۔ البتہ ۱۹۸۰ء میں جب جنتا سرکار کے خاتمے کے بعد مسز اندرا گاندھی اور ان کی کانگریس دوبارہ برسرِ اقتدار آئی تو شیخ عبداللہ سے اس وعدے پر عمل کرنے کو کہا گیا جو وعدہ ۱۹۷۵ء میں ایکارڈ کے دوران اس دفعہ کو ہٹانے سے متعلق اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ کے درمیان ہوا تھا۔

کشمیر ایکارڈ کی بات چیت کے دوران وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی اس بات پر مُصر تھی کہ ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کو حتمی ماننے کے بعد اب دفعہ ۳۷۰ کی دیوار رکھنے کا کیا جواز ہے؟

شیخ عبداللہ کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ میں اپنا کوئی بھی مطالبہ منوانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لہٰذا اس موقع پر دفعہ ۳۷۰ ہٹانا مناسب نہیں رہے گا۔ ایک ہی بار سارا کام نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس کام کو کسی وقت تک کے لیے اٹھا رکھا جائے۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ کام بھی میں اسی طرح کر کے دوں گا جس طرح میں نے آپ کے ہندوستان کے

ساتھ اپنی ریاست کا الحاق ناقابلِ تنسیخ بنا کر دیا۔ آپ نے مجھ پر جو بھروسہ کیا اس کی قدر کر کے دکھاؤں گا۔ میں دفعہ ۳۷۰ کو ہٹا کر ریاست کو ہندوستان کے قریب لاؤں گا۔"

مسز اندرا گاندھی نے شیخ صاحب کی زبان پر اعتبار کر کے کشمیر ایکارڈ میں دفعہ ۳۷۰ کو ہٹانے کے بجائے اس کے مستحکم رکھنے کا اعادہ کیا تاکہ کل کو جب اس کے ہٹانے کا بندوبست کیا جائے اس وقت ہم پر کوئی الزام نہ آسکے۔

شریمتی اندرا گاندھی کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے ساتھ ہی ریاستی کانگریس یونٹ شیخ عبداللہ کے اقتدار کے لیے مشکلات پیدا کرنے لگا، یہ سب کچھ دہلی کے اشارے پر ہو رہا تھا، اور ریاستی کانگریس پارٹی سمجھ رہی تھی، مسز اندرا گاندھی ہمارے لیے میدان ہموار کر رہی ہے، لیکن بات یہ نہیں کچھ اور ہی تھی۔

اسی دوران نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی باتوں کی جنگ ہاتھوں میں بدل گئی تو دونوں پارٹیاں ایک دوسرے پر غنڈہ گردی کے الزامات لگانے لگے۔

شیخ عبداللہ نے جب دیکھا کہ کانگریس میری حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے لگی ہے تو انھوں نے اسمبلی کے اگلے سیشن میں دفعہ ۳۷۰ کو مکمّل طور پر ہٹانے کا مطالبہ مان لیا۔ لیکن اس کے لیے یہ شرط رکھ دی کہ کانگریس پارٹی لڑائی بند کر کے ان کے ساتھ تعاون کرے۔

مسز اندرا گاندھی نے پردیش کانگریس کے صدر مفتی محمد سعید کو لڑائی بند کر کے شیخ عبداللہ کو تعاون دینے کی ہدایات بھیجدی تو مفتی صاحب کے ساتھ کانگریس کے دوسرے عہدیدار اور کارکن مسز اندرا گاندھی کی اس اچانک تبدیلی سے دم بخود ہو گئے یہ لوگ وزارت حاصل کرنے کے جو خواب دیکھ رہے تھے، اور پورٹ فولیوز کا حساب طے کر چکے تھے، وہ اس ہدایت پر عمل کرنے سے دم بخود ہو گئے۔

بہرحال جموں میں اسمبلی کا سیشن شروع ہوا تو گورنر کے ایڈریس پر شکریے کی تحریک پر بولتے ہوئے انھوں نے ۲۷ فروری ۱۹۸۱ء کو ایوان اسمبلی میں فرمایا:-

"ریاست کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپوزیشن حکومت کے ساتھ تعاون کرے۔ ... مجھ پر رشی کمار کوشل نے الزام لگایا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جنگ کے دوران میں نے بھارتی

فوجوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے اوڑی کی طرف جنگ بند کرائی کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا۔ ہماری فوج ان علاقوں پر قبضہ کرے جو کشمیر کے اپنے علاقے ہیں اور جو میری قیادت قبول نہیں کرتے، میں کہتا ہوں اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جو جنگ بندی کی گئی، اگر اس پر میری بات مانی جاتی تو ہندوستان کی فوج بہت آگے بڑھ گئی ہوتی پاکستان کے ساتھ دوسری جنگ کے بعد تاشقند معاہدے کی میں نے مخالفت کی کیونکہ اس کے تحت ہمیں وہ علاقے پاکستان کو واپس کرنے پڑے جن پر ہم نے قبضہ کرلیا تھا.... دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں ہم کھلا ذہن رکھتے ہیں۔ کوئی بھی بات حرفِ آخر نہیں، دفعہ ۳۷۰ بھی حرف آخر نہیں ہو سکتی، عوام چاہیں تو مرکز کو زیادہ اختیارات دے سکتے ہیں۔"

کشمیر ایکارڈ کے بارے میں شیخ عبداللہ نے بار بار اس بات کو دہرایا تھا کہ مرکز کے ساتھ جو بھی بات چیت ہوگی اس کے بارے میں پہلے لوگوں سے رائے لی جائے گی، اگر لوگوں کو منظور نہیں ہوگا تو بات آگے بڑھائی جائے گی ورنہ نہیں۔

اب دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں بھی انہوں نے لوگوں سے پوچھنے کا نسخہ آزمایا۔ ۱۲ مارچ کو اسمبلی میں حزب اختلاف کے لیڈر عبدالرشید کابلی نے جب یہ کہا کہ دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں وزیر اعلیٰ کا بیان غیر ذمہ دارانہ ہے تو وزیر اعلیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"لوگوں کی رائے ہی مقدم ہے، لوگ تعلقات میں تبدیلی لا سکتے ہیں مرکز کے ساتھ ریاست کے تعلقات پوری طرح واضح ہیں، ریاست کے عوام نے ہند یونین کے ساتھ اپنا مقدر وابستہ کیا ہے اور یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں تھا بلکہ شعوری طور پر کیا گیا تھا تاہم آئین میں یہ بات درج ہے کہ اگر ریاست کے لوگ چاہیں تو وہ مرکز کو زیادہ اختیارات منتقل کر سکتے ہیں، ریاست کی ترقی کے لیے ایسا کرنا چاہیے، کوئی بھی بات چاہے وہ دفعہ ۳۷۰ ہی کیوں نہ ہو حرف آخر نہیں ہے۔ موجودہ تعلقات کو مستحکم کرنے کے لیے ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ دفعہ ۳۷۰ اتنی مقدس نہیں کہ اسے بدلا نہ جائے۔"

ریاستی اسمبلی میں وزیر اعلیٰ کی طرف سے دفعہ ۳۷۰ کے متعلق اس بیان نے وادی میں ایک ہلچل سی پیدا کردی۔

پیوپلز کانفرنس نے دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت کے لیے احتجاجی مظاہرے کیے پولیس نے لاٹھی چارج کرکے ان کے جلسے اور جلوس تتر بتر کر دیئے، پیوپلز کانفرنس کے کئی لیڈر گرفتار کیے گئے۔ پیوپلز کانفرنس کی دیکھا دیکھی جماعت اسلامی پیوپلز لیگ، جمعیۃ الطلبہ اور اسٹوڈنٹس یوتھ لیگ نے احتجاجی مظاہرے کیے، لیکن پولیس کی طرف سے ان مظاہروں کو سختی سے دبا دیا گیا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۸۱ء کو پیوپلز لیگ نے اخبارات کے لیے بیان جاری کیا۔

" دفعہ ۳۷۰ کا کانگریس کے دور حکومت میں کھوکھلا کر دیا گیا۔ کشمیر میں جو بھی مرکزی قوانین نافذ کیے گئے وہ کانگریس آئی کے زمانے میں نافذ کیے گئے، امید یہ تھی کہ شیخ صاحب کے برسر اقتدار آنے کے بعد ان قوانین کو منسوخ کیا جائے گا ایسا کرنے کے بجائے شیخ صاحب دفعہ ۳۷۰ کو منسوخ کرنے کی باتیں کر رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کانگریس نے جو کسر رکھی تھی وہ شیخ صاحب اب پوری کرنا چاہتے ہیں، شیخ صاحب اپنے نظریے سے مکمل طور پر منحرف ہو گئے ہیں۔"

جماعت اسلامی کے مقامی لیڈروں نے دفعہ ۳۷۰ کے متعلق شیخ عبداللہ کے بیان پر بارہمولہ میں احتجاجی مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر سیّد علی شاہ گیلانی نے فرمایا:۔



(سید علی شاہ گیلانی)

"شیخ صاحب کا یہ بیان موقع پرستی کی ایک بدترین مثال ہے۔ شیخ صاحب اب اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو گئے ہیں۔ شیخ صاحب اب ہندو فرقہ پرستوں کی بولی بولنے لگے ہیں کشمیری عوام کو عزت و آبرو دلانے کا دعویٰ کرنے والے لیڈر اب کشمیر کی انفرادیت ختم کرنے کے درپے ہیں۔"

پیوپلز کانفرنس نے اخباروں کے لیے ایک بیان جاری کیا:

"شیخ صاحب محض ایک فرد ہیں، دفعہ ۳۷۰ کے متعلق انہوں نے جو کچھ کہا وہ ان کی ذاتی رائے ہو سکتی ہے، لیکن کشمیری عوام اس دفعہ کو ختم کرانے کی

کسی بھی سازش کو کامیاب ہونے نہیں دیں گے۔"

عوامی ایکشن کمیٹی کے صدر نے شیخ عبداللہ کے دفعہ ۳۷۰ کے متعلق بیان کو افسوسناک قرار دیا اور کہا" اس بیان سے کشمیری عوام سخت مایوس ہو گئے ہیں۔"



مولوی فاروق



ڈاکٹر کرن سنگھ

جنتا پارٹی اور لوک دل جموں شاخ نے شیخ عبداللہ کے اس دلیرانہ اقدام کی سراہنا کی اور شیخ عبداللہ کو اس اقدام پر ایڈوانس مبارکباد دی۔

ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنے بیان میں فرمایا:

"میں وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کے اس بیان سے متفق ہوں کہ دفعہ ۳۷۰ ایسی مقدس چیز نہیں ہے کہ جس کو بدلا نہیں جا سکتا اس دفعہ کو ہٹانے سے ریاست ترقی کی طرف گامزن ہو سکتی ہے مجھے اس بات کا احترام ہے کہ وادی کشمیر میں رائے عامہ دفعہ ۳۷۰ کے قائم رہنے کے حق میں ہے چونکہ کشمیری عوام کے پسندیدہ لیڈر اس دفعہ کو ختم کرنے کے حق میں ہیں ہمیں ان کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔"

ریاست جموں وکشمیر کی سبھی سیاسی وغیر سیاسی پارٹیوں نے شیخ صاحب کے اس بیان پر اپنے اپنے نظریات کے مطابق تبصرہ کیا۔ جہاں جموں کے بعض اخبارات نے شیخ صاحب کے اس اقدام کو ایک جرأت مندانہ اقدام سے تعبیر کیا وہاں وادی کے اخباروں جن میں آفتاب، سرینگر ٹائمز، ہمدرد، خدمت، روشنی، آئینہ وغیرہ نے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کے دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں ان کے بیانات پر سخت موقف اختیار کر کے ان پر عوام کا وشواس گھات کرنے کا الزام لگایا، اس بات پر مدیر آفتاب خواجہ ثناء اللہ بٹ نے "خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے" کے کالموں میں وزیر اعلیٰ کا کچا چٹھا نکال کر رکھ دیا۔ البتہ اس سلسلے میں "سرینگر ٹائمز" کے مدیر اعلیٰ صوفی غلام محمد نے اپنے اخبار کے ۱۴ مارچ ۱۹۸۱ء کے شمارے میں جو اداریہ لکھا اور جس نے وزیر اعلیٰ کو یہ کام ملتوی رکھنے کے لیے مجبور کیا حسب ذیل ہے:۔

"شیخ صاحب نے کہا" دفعہ ۳۷۰ اتنی مقدس نہیں کہ اسے بدلا نہ جائے"

شیخ صاحب کا یہ اظہار خود اس دفعہ ۳۷۰ کے متعلق ان کے اپنے خیالات کے بالکل منافی ہے، دفعہ ۳۷۰ کے متعلق ریاستی عوام کو شیخ عبداللہ نے خود اتنا حساس بنا دیا کہ یہ دفعہ کشمیری عوام کے لیے مقدس ہی نہیں بلکہ بہت ہی مقدس بن گئی ہے، شیخ صاحب کے اپنے نظریے کے مطابق دفعہ ۳۷۰ کا وجود ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے بہت ضروری ہے۔ ۱۹۵۳ء کے بعد شیخ صاحب نے متعدد بار کہا الحاق اور اٹانومی لازم وملزوم ہیں، اگر اٹانومی ختم کی جاتی ہے تو الحاق بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اس تشریح کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آئندہ کوئی حکومت ہند کے آئین سے دفعہ ۳۷۰ ختم کرانے کی کوشش کرے تو کیا ریاست کا الحاق ہندوستان کے ساتھ رہ سکے گا۔ شیخ صاحب پورے ۲۰ سال سے دفعہ ۳۷۰ کے زبردست محافظ رہے ہیں، اس دفعہ کی حفاظت کرنے کی پاداش میں ہی ان کو ۱۹۵۳ء میں ایک سازش کے ذریعے حکومت سے ہٹایا گیا اور ایک کٹھ پتلی اسمبلی قائم کر کے دفعہ ۳۷۰ میں رخنہ اندازی کی گئی۔ ہندوستان سے شیخ عبداللہ کی ساری جنگ اس دفعہ کے دفاع کے لیے ہی تھی۔

۱۹۵۲ء میں جموں کی پرجا پریشد نے دفعہ ۳۷۰ کو ختم کرنے کے خلاف ایک زبردست ایجی ٹیشن شروع کیا، شیخ صاحب نے پرجا پریشد کا مقابلہ کیا اس کے بعد نئی دہلی میں ریاست کی اٹانومی کے مخالفوں نے ایک مضبوط لابی قائم کی جس نے پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی اپنے شیشے میں اتار کر دفعہ ۳۷۰ کو ختم کرنے کی خاطر ریاست میں شیخ عبداللہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ۱۹۵۳ء کے بعد اگر الحاق کا مسئلہ زور سے ابھارا گیا، لیکن اندرونی لڑائی ریاست کی اٹانومی پر ہی تھی ۱۹۵۲ء کا دہلی ایگریمنٹ ریاست کی اٹانومی کی حدیں مقرر کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

۱۹۵۳ء کے انقلاب کے بعد بار بار کہا گیا کہ الحاق اٹامی پر قائم ہے۔ دفعہ ۳۷۰ ریاست کو ایک خصوصی درجہ دینے کے لیے آئینِ ہند میں درج کی گئی۔

بیگ صاحب نے ۱۹۷۲ء میں کہا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ ہمارا جھگڑا الحاق پر نہیں بلکہ اٹانومی کی مقدار پر ہے اس کے بعد ہی شیخ عبداللہ اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان کشمیر ایکارڈ کی صورت میں جو سمجھوتہ ہوا اس میں ریاست کی اٹانومی کے متعلق معاملات ہی طے ہوئے اس سمجھوتے میں مسز اندرا گاندھی نے تسلیم کیا کہ ۱۹۵۳ء کے بعد ریاست پر جو مرکزی قوانین حاوی کر دیئے گئے ہیں ان پر نظرثانی کی جا سکتی ہے، ۱۹۷۶ء میں کانگریس آئی کے لیڈروں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ایکارڈ کے ذریعہ شیخ صاحب نے کچھ حاصل کرنے کے بجائے مزید اختیارات مرکز کو تفویض کیے ہیں اس پر شیخ عبداللہ نے برہم ہو کر جواب دیا تھا۔ میں نے حکومت کی ذمّہ داریاں قبول کرتے وقت مرکز کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ میں ۸ راگست ۱۹۵۳ء کی پوزیشن کو حاصل کروں گا شیخ عبداللہ اس پوزیشن کو حاصل کرنا ہی اپنی جدوجہد کا ماحصل سمجھ رہے تھے۔

جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں ایک جنتا لیڈر شری سبھرامنیم سوامی نے جموں میں کہا ان کی پارٹی آئینِ ہند سے دفعہ ۳۷۰ حذف کرانے کا بل پیش کرے گی۔ سبھرامنیم سوامی کے اس بیان پر شیخ عبداللہ نے اپنے شدید ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس وقت وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی سے کہا کہ وہ دفعہ ۳۷۰ سے متعلق اپنی پالیسی واضح کرے، شری ڈیسائی اور وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپئی نے اس وقت ریاستی عوام کو یقین دلایا کہ ان کی حکومت آئینِ ہند سے دفعہ ۳۷۰ ختم کرنے کی کوشش نہیں کرے گی، اس کے بعد ساری انتخابی مہم کے دوران نیشنل کانفرنس اور یوتھ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے نہ صرف دفعہ ۳۷۰ کے تحفظ کو اپنا منشور بنایا بلکہ اپنے اس منشور پر ہی لوگوں سے ووٹ حاصل کیے ـــــ

شیخ صاحب کی جنگ مرکزی لیڈروں کے ساتھ دفعہ ۳۷۰ کے تحفّظ کے لیے شروع ہوئی، آج شیخ صاحب کہتے ہیں، کہ یہ دفعہ اتنی مقدس نہیں کہ اسے رفع نہ کیا جا سکے یہ دفعہ ممکن ہے کہ ابتدا میں مقدس نہ رہی ہو لیکن آج یہ دفعہ کشمیری عوام کے لیے بہت ہی مقدس ہے، خود شیخ صاحب کی پارٹی نیشنل کانفرنس کو اگر کشمیری عوام میں ایک مقبولیت حاصل ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جماعت نے دفعہ ۳۷۰ کو اپنی حمایت کا بنیادی مقصد بنایا ہے۔

شیخ عبداللہ نے اگرچہ کہا ہے کہ ریاست کی اسمبلی کو ہی دفعہ ۳۷۰ ختم کرنے کا اختیار ہے لیکن شاید وہ بھول چکے ہیں کہ ۱۹۵۳ء کے بعد کٹھ پتلی اسمبلی قائم کر کے اس دفعہ کو کھوکھلا کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء کے تلخ تجربے کے بعد شیخ عبداللہ کی ذمّہ داری تھی کہ وہ آیندہ اس قسم کے واقعات کے اعادہ کا توڑ کرنے کے لیے کوئی آئینی طریقہ تلاش کریں، انہوں نے ایسا کرنے کے بجائے یہ کہا ہے کہ ریاست کی اسمبلی کسی وقت اس دفعہ کو ختم کرنے کی سفارش کر سکتی ہے، دفعہ ۳۷۰ کو ایک کٹھ پتلی اسمبلی کے ذریعہ جس طرح ماضی میں کھلا کر دیا گیا آئندہ بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ ریاستی عوام کو اس دفعہ کی حفاظت کے لیے تیار کرنے کے بجائے اس دفعہ کے بارے میں اسمبلی میں جو بیان دیا اس نے خود شیخ صاحب کے اس دفعہ سے متعلق ان کے بیانات کو بے معنی بنا دیا ہے، الحاق کا مسئلہ ترک کرنے کے بعد ریاستی عوام کو اٹانومی کے تحفظ پر ذہنی طور تیار کیا گیا تھا۔ کشمیری عوام دفعہ ۳۷۰ کو بہت مقدّس دفعہ تسلیم کرنے لگے تھے۔ آج شیخ عبداللہ نے وہ محل خود مسمار کر دیا جو انھوں نے کافی مدت سے تعمیر کیا تھا۔ اس دفعہ پر جس لہجہ اور جس انداز سے شیخ عبداللہ نے بیان دیا ہے اُس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دفعہ ۳۷۰ ختم کرنے کی تیاری ہونے لگی ہے۔"

ان ساری مخالفتوں کے باوجود وزیر اعلیٰ نے اس کام کو منسوخ نہیں کیا بلکہ ملتوی رکھا

اس کی تصدیق ان کے اس بیان سے ملتی ہے جو ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو انھوں نے اسٹیٹسمین انگریزی اخبار کے نمائندے کے سامنے اپنی کوٹھی پر دیا جس میں انھوں نے واضح کیا کہ

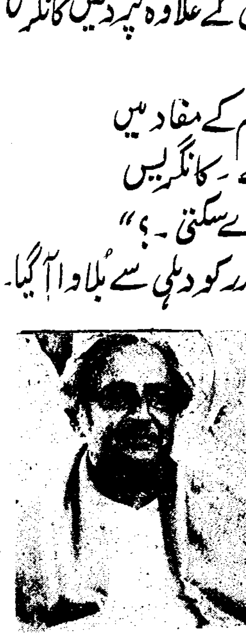
" لوگ اگر اس دفعہ کو منسوخ کرنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا، ایسا کرنے سے ریاست میں ترقی کی راہیں کھل جائیں گی ۔"

۱۹۷۵ء میں کشمیر ایکارڈ کے دوران اقتدار حاصل کرنے کے لیے دفعہ ۳۷۰ کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم کرنے کا شیخ عبداللہ نے مسز اندرا گاندھی کے سامنے جو عہد کیا تھا اس کی تصدیق ۴ مارچ ۱۹۸۱ء کو ہمیں ملی ۔

دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کے بیان پر جب وادی میں مخالفت کا ایک طوفان کھڑا ہوا تو کانگریس آئی کے مقامی لیڈروں نے اپنے دفتر مولانا آزاد روڈ پر ایک میٹنگ کا انعقاد کیا اور بیانوں کے علاوہ پردیش کانگرس کے صدر مفتی سعید نے فرمایا :-

" آئین ہند میں دفعہ ۳۷۰ کی موجودگی کشمیری عوام کے مفاد میں ہے، کانگریس آئی اس دفعہ کو ہٹانے کے خلاف ہے ۔ کانگریس آئی وزیر اعلیٰ کو یہ دفعہ ہٹانے کی اجازت نہیں دے سکتی ۔ ؟"

اسی روز شام کو بذریعہ ٹیلیفون پردیش کانگریس کے صدر کو دہلی سے بُلاوا آ گیا ۔



مفتی سعید

تو میں نے کانگریس کے ایک لیڈر جی، ایم، باون جو میرے دوست بھی ہیں، ان سے مفتی صاحب سے ملاقات کرانے کو کہا ۔ کیونکہ اب تک مفتی صاحب کے ساتھ میرا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا ۔ باون صاحب نے مجھے بتایا کہ مفتی سعید کا موڈ ٹھیک نہیں ہے، وہ دہلی سے سخت ناراض ہو کر آئے ہیں، ایک ڈیڑھ دنوں کے بعد اُن سے ملنے جائیں گے ۔



جی، ایم، باون)

چند روز کے انتظار کے بعد جب میں مفتی صاحب سے ملا تو مجھے پتہ چلا کہ مفتی صاحب مجھے نام سے

جانتے ہیں اور مجھے قریب سے دیکھنے کے خواہشمند تھے، انہیں میری اس کتاب کے بارے میں معلومات تھیں جو گورنمنٹ نے ضبط کر لی تھیں ۔

مفتی محمد سعید سے جب میں نے اُن کے دفعہ ۳۷۰ کے اسٹینڈ کے بارے میں پوچھا میں نے دیکھا ان کے چہرے کا رنگ ایک دم تبدیل ہو گیا اور وہ بڑی بے چینی کا تاثر دینے لگے ۔

ان کی اس تبدیلی سے میرا اشتیاق بڑھا اور میں نے انہیں آہستہ آہستہ کریدنا شروع کیا ۔ میں نے دیکھا، چائے پینے پلانے کے دوران مفتی صاحب کھل گئے اور بولے،

" دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ یہ دفعہ ریاستی عوام کے مفاد میں برقرار رہنی چاہیے، ہم اس میں کسی قسم کی رخنہ اندازی کے خلاف ہیں چنانچہ ہم نے اپنی حالیہ ایک میٹنگ میں اس کے لیے ایک قرارداد بھی منظور کر لی، اس قرارداد کے منظور ہوتے ہی مجھے دہلی سے بلاوا آ گیا اور وہاں پر مجھے ایسی قرارداد کے پیش کرانے اور پھر منظور کرانے پر جھاڑ پلائی گئی ۔ وہاں مجھے بتایا گیا ۔

اس دفعہ کو ہٹانا شیخ عبداللہ کا ہمارے ساتھ ایک عہد ہے، اگر وہ یہ کام کرنے کا ہمیں یقین نہیں دلاتے تو ہم ۱۹۷۵ء میں ان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ کرتے اور نہ ہی اُن کو اقتدار سونپ دیتے ۔ اگر وہ یہ کام انجام دینا چاہتے ہیں تو آپ اس میں رکاوٹ کیوں بن رہے ہیں ؟"

بقول مفتی سعید ایسا سُن کر میرے پاؤں تلے سے گویا زمین نکل گئی اور مجھے کچھ دیر کے لیے یقین ہی نہیں آیا لیکن شیخ عبداللہ کی اقتدار کی چاہت دیکھ کر مجھے یقین کرنا ہی پڑا ۔ کچھ بھی ہو، ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کام میں ہم شیخ عبداللہ کا ساتھ نہیں دیں گے، چاہے ہمیں تنظیم سے نکلنا ہی کیوں نہ پڑے، کیونکہ یہ دفعہ جو پہلے ہی کھوکھلا کر دی گئی ہے، اگر مکمل طور پر ختم ہو گئی تو کشمیری عوام کے ساتھ یہ ایک ایسی زیادتی ہوگی جس کی بعد میں تلافی نہیں ہو سکے گی !

میں نے مفتی صاحب سے کہا،

" اگر ایسی بات ہے تو آپ شیخ عبداللہ کا اس دفعہ کے بارے میں مسز اندرا گاندھی سے کیا گیا عہد نامہ منظر عام پر کیوں نہیں لاتے ہیں "۔

مفتی صاحب نے جواب دیا :

"آپ کا کہنا ٹھیک ہے، لیکن ہماری باتوں کا اعتبار کون کرے گا؟
آپ، تو یہاں کے لوگوں کے خیالات اور مزاج سے واقف ہیں
وہ شیخ عبداللہ کی نیت پر شک کرنے کے بجائے ہمیں جھوٹی باتیں پھیلانے
کے مرتکب ٹھہرائیں گے۔ لوگ ہمارے سچ کو جھوٹ اور ان کے جھوٹ
کو سچ مانتے ہیں"۔

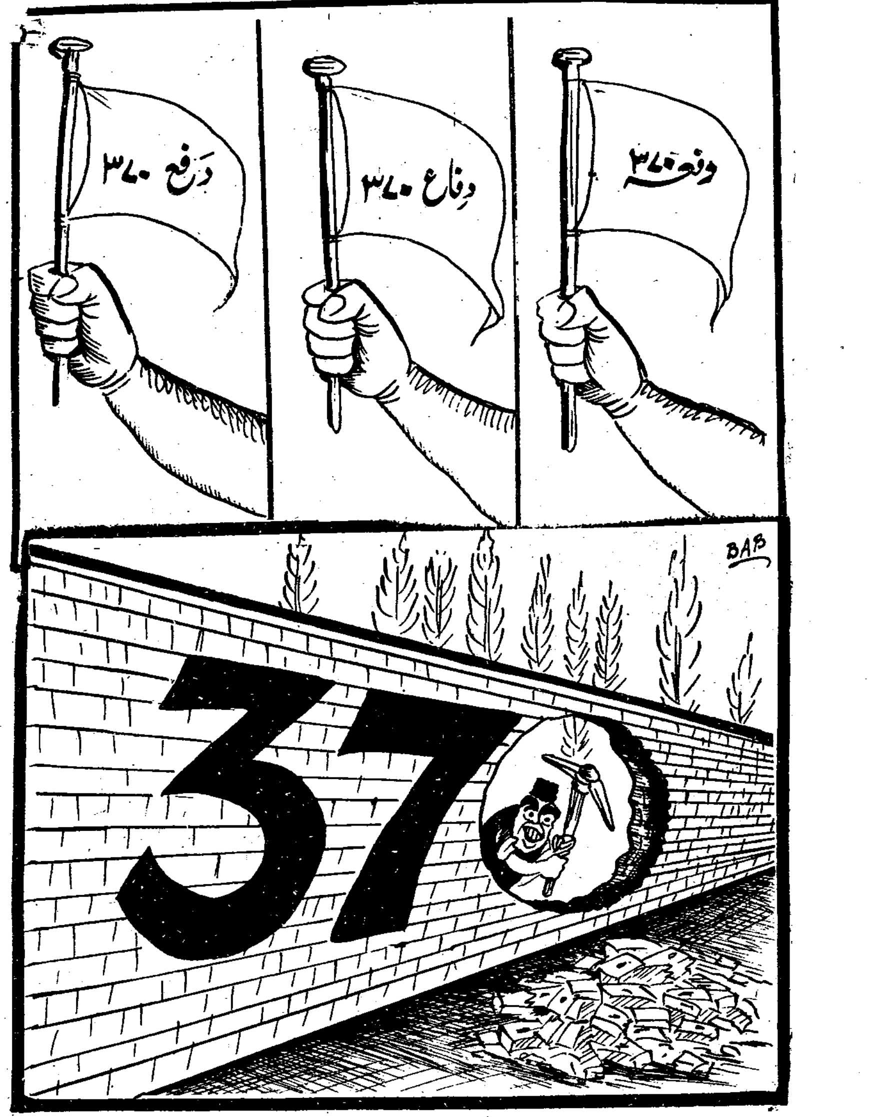
مفتی صاحب کی اس دلیل میں کچھ وزن ضرور تھا، البتہ میں نے محسوس کیا۔ شیخ صاحب کی اصلیت واضح کرتے ہیں اندراجی کی ناراضگی کا انہیں احساس ہے لہذا وہ اس بارے میں چُپ رہنا چاہتے ہیں۔

وادی کی اپوزیشن اور مقامی اخبارات نے دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں شیخ عبداللہ کو آڑے ہاتھوں لیا تو انھوں نے اس کام کو ملتوی کر دیا۔

اگلے سال اگر وہ رحلت نہیں فرماگئے ہوتے تو انہوں نے شاید اسمبلی سیشن میں یہ عہد پورا کر دیا ہوتا۔



ایڈیٹر "سرینگر ٹائمز" صوفی غلام محمد وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کو سمجھا رہے ہیں اگر ریاست سے دفعہ ۳۷۰ ہٹائی گئی تو اس کے کیا خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ شیخ صاحب ان کی دلیل کو زیر لب مسکرا کر اڑا دیتے ہیں۔



دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا کارٹونسٹ نے اُسے اجاگر کیا۔

کروٹ بدل رہی ہے ابھی زندگی کی لاش
قاتل سے کوئی کہدے ابھی تھوڑی آس ہے

قائم مقام چیف جسٹس کا تنازعہ

مفتی بہاءُالدّینؒ فارُوقی، قربانی کا بکرا

پردیش کانگریس آئی آل انڈیا کانگریس کی صدر مسز اندرا گاندھی کی شہ پر شیخ وزارت کے لیے جو مشکلات پیدا کر رہی تھی، اور شیخ عبداللہ کی مخالفت کا جو بیڑا اٹھائے ہوئے تھی، اس بارے میں انہیں ایک بڑی غلط فہمی تھی۔ پردیش کانگریس کمیٹی کے عہدیدار سمجھ رہے تھے۔



مسز اندرا گاندھی انکو واپس اقتدار دلانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہی ہیں۔ لیکن اندرا جی کا کچھ اور ہی مقصد تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے مسز اندرا گاندھی مقامی کانگریس پارٹی کو کبھی لڑائی کے محاذ پر بھیج رہی تھیں، اور کبھی انہیں صلح کا بگل بجانے پر آمادہ کر رہی تھیں۔

وہ پسِ پردہ دفعہ ۳۷۰ کے خاتمہ کا انتظار کر رہی تھیں۔

شیخ عبداللہ نے جب ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو انھیں زبردست مخالفت کا سامنا کرکے معاملہ ملتوی رکھنا پڑا۔ مسز اندرا گاندھی کو ان کا پیچھے ہٹنا سخت ناگوار گزرا، چنانچہ انہوں نے لڑائی کے لیے فوج کو پھر محاذ پر بھیجنا شروع کیا۔ اسی دوران ریاستی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

ریاستی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مرتضیٰ فضل علی کو سپریم کورٹ کا جج مقرر کرنے کے بعد یہاں ہائی کورٹ کے ایک سینیئر کو مرتضیٰ فضل علی کی جگہ قائم مقام چیف جسٹس

بنایا گیا تھا۔ ریاستی سرکار نے مرکز کو ایک درخواست کے ذریعہ قائم مقام چیف جسٹس کو کنفرم کرنے کا سجھاؤ دیا جو نامنظور کیا گیا۔

ریاستی سرکار کی اس درخواست کی نامنظوری کا راز افشا ہوا تو، ار ستمبر ۱۹۸۱ء



(مفتی بہاء الدین فاروقی)

کو قانون ساز اسمبلی میں اپوزیشن ممبران نے جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس آنریبل مفتی بہاء الدین فاروقی کو مستقل جج بنانے کا معاملہ اٹھایا۔

سرکار نے بیان دیا کہ: انہوں نے چیف جسٹس کی تقرری کو باقاعدہ بنانے کے لیے مرکز سے باضابطہ سفارش کی ہے، لیکن مرکز نے ابھی تک اس سفارش کو منظور نہیں کیا ہے۔ مرکز اور ریاست کے درمیان تعلقات آئینِ ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت قائم ہیں اور اس دفعہ میں ریاست کے حقوق میں نمایاں طور پر نشاندہی کی گئی ہے، ہم اپنے حقوق سے باخبر ہیں اور انکو کسی بھی قیمت پر زک پہنچانے کی اجازت نہیں دیں گے۔

(اسمبلی کے پہلے سیشن میں دفعہ ۳۷۰ کا دفاع کرنے والے آج اس دفعہ کی حفاظت کی دہائی دے رہے ہیں۔؟)

موجودہ چیف جسٹس کی توثیق میں جو تاخیر ہوئی وہ ریاست کی خودمختاری کو زک پہنچانے کے مترادف ہے۔ بیشتر ریاستوں کے چیف جسٹوں کے کیسوں کی توثیق مختلف وجوہات جن میں ایک ہائی کورٹ سے دوسرے ہائی کورٹ میں ججوں پر قانونی حلقوں میں اختلاف رائے اور عدلیہ میں دیگر اصلاحات کے معاملات شامل ہیں کی بنا، پر نہیں کی جا سکی۔ یہ معاملہ بعد میں سپریم کورٹ میں اٹھایا گیا اور تامل ناڈو ہائیکورٹ کے چیف جسٹس آنریبل اسماعیل اپنی تبدیلی کے بعد مستعفی ہوئے۔ اس مناقشے سے توثیق کے معاملے میں تاخیر ہوئی تاہم ریاستی حکومت فیصلہ لینے کے لیے مرکز کے ساتھ رابطہ قائم کیے ہوئے ہے، بہت ساری ریاستوں کے چیف جسٹسوں کی توثیق ہوئی ہے البتہ آسام اور جموں و کشمیر کے بارے میں ابھی فیصلے کا انتظار ہے۔

صدر مملکت کو اس سلسلے میں اختیارات ریاستی آئین سے حاصل ہیں، چیف جسٹس کی تقرری کے بارے میں ریاستی حکومت کی سفارشات کی منظوری ایک قانونی پابندی ہے اور مرکز کو ان سفارشات کو منظور کرنا ہوگا۔ اگر صدر مملکت نے ہماری سفارشات پر عمل نہیں کیا تو ہماری حکومت قائم نہیں رہ سکتی، میں اپنی وزارت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔

وزیر اعلیٰ نے اسمبلی کے ایوان میں جو یہ بیان دیا اس نے کچھ نئے خدشات پیدا کر دیئے اور چیف جسٹس کے معاملہ میں ایک سخت اسٹینڈ لیا۔ چیف جسٹس کی تقرری محض ایک تقرری کا مسئلہ نہیں رہا، اب یہ ایک آئینی مسئلہ بن گیا اور ریاست کی اندرونی خودمختاری کا مسئلہ بن کر ابھرا، اس بات سے قطع نظر کہ مرکزی سرکار چیف جسٹس کی تقرری پر کس طرح کام کرتی ہے، ریاستی وزیر اعلیٰ نے واضح کر دیا کہ چیف جسٹس کی تقرری کے ساتھ اندرونی خودمختاری کا مسئلہ بھی منسلک ہے۔ اور اس مسئلے کے آگے ریاستی سرکار مرکز کے سامنے جھک رہی ہے یا مرکز ریاست کی خصوصی پوزیشن دفعہ ۳۷۰ کی سپرٹ کے مطابق معاملات طے کرنے میں مخلص ہے؟

وزیر اعلیٰ نے اسمبلی کے ایوان میں اس سلسلے میں جو بیان دیا وہ جہاں مرکزی سرکار کے لیے ایک مشورہ تھا وہاں ایک وارننگ بھی تھی۔

شیخ عبداللہ کا یہ بیان کہ اگر ہماری سفارشات پر عمل نہیں کیا گیا تو ہماری حکومت قائم نہیں رہ سکتی، مرکز کی کانگریس سرکار کے ہاتھ ایک ایسا ہتھیار آ گیا جس کے سبب وہ شیخ عبداللہ سے بالکل آسانی سے چھٹکارا پا سکتی۔

شیخ عبداللہ کے مستعفی ہونے کی دھمکی نے مسز اندرا گاندھی کو سنجیدہ بنا دیا ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ریاستی چیف جسٹس کے معاملہ میں ہرگز سنجیدہ نہ تھیں، لیکن دراصل یہ ان کی بھول تھی کہ شیخ عبداللہ اس معاملے میں مستعفی ہوں گے۔

جن حالات میں انہوں نے دوبارہ کرسیٔ اقتدار حاصل کر لی تھی۔ اس کو مدنظر رکھ کر یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کسی بھی معاملے میں چاہے وہ انتہائی سنگین بھی کیوں نہ ہو وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ مستعفی ہوں گے ___ مسز اندرا گاندھی شیخ عبداللہ کو اچھی طرح جان کر اور پہچان کر نہ جانے کیوں ان کی دھمکی پر بھروسہ کر کے اس بارے میں

سخت موقف اختیار کر گئیں۔ اندرا گاندھی نے اس بارے میں چیف جسٹس چندرا چود کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ ۱۸ اکتوبر کو مرکزی سرکار کی طرف سے یہ خبر اُڑائی گئی کہ مسٹر فاروقی کو الٰہ آباد ہائیکورٹ میں تبدیل کیا جارہا ہے، یہ دراصل شیخ عبداللہ کو اشتعال دلانے کے لیے کیا گیا تاکہ وہ ایسا کام کر جائیں جس کا انہیں انتظار تھا۔



چیف جسٹس چندرا چود اور مسز اندرا گاندھی

۴ نومبر ۱۹۸۱ء کو اخبارات کے ذریعہ یہ خبر گشت کرنے لگی۔

"چیف جسٹس آف انڈیا جسٹس آنریبل چندرا چود۔ جسٹس بہاءالدین فاروقی کی تقرری کو مستقل بنانے کے خلاف ہیں۔

کئی اخبارات نے لکھ دیا:

" ریاستی چیف جسٹس کی تقرری کا معاملہ الجھ گیا، مرکز اور ریاست کے تعلقات اور بگڑ گئے۔"

" مفتی بہاءالدین فاروقی پچھلے دو برس سے قائم مقام چیف جسٹس کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں، اتنی لمبی مدت تک کسی جج کا عدلیہ کے سب سے بڑے عہدے پر اس طرح فائز رہنا جوڈیشل ہسٹری کا پہلا واقعہ ہے۔"

ان اخباری بیانات نے وزیر اعلیٰ کو مشتعل کیا تو انہوں نے حضرت بل جا کر وہاں جمعہ کی نماز سے قبل حاضرین سے فرمایا:

"......قائم مقام چیف جسٹس کی تقرری کو باقاعدہ بنانے سے متعلق

میری سرکار کی سفارش کو اگر مرکزی سرکار نے منظور نہ کیا تو میں مستعفی ہو جاؤں گا سپریم کورٹ کے چیف جسٹس آنریبل چندرا چود نے مفتی بہاءالدین فاروقی کی کارکردگی پر جو مایوسی ظاہر کی ہے اور ان کی تقرری کو مستقل بنانے میں ایک قسم کی معذوری ظاہر کی ہے اس نے مرکز اور ریاست کے درمیان چل رہی کشمکش کو اور بھی تیز کر دیا ہے، جموں و کشمیر کے چیف جسٹس کی تقرری ریاستی سرکار کا معاملہ ہے چیف جسٹس کے عہدے کے لیے ریاستی سرکار کی سفارش مرکزی سرکار پر ایک قسم کی پابندی ہے، اس معاملہ میں صدر جمہوریہ مرکزی آئین کے بجائے ریاستی آئین کے تحت اختیار حاصل کرتا ہے اور یہی بات چیف جسٹس کے متعلق صحیح ہے، گورنر کے متعلق ماہرین کے مطابق میرٹ معاملوں میں اگرچہ بعض اختیارات کلی طور پر سپریم کورٹ کے ہاتھ میں ہیں لیکن چیف جسٹس کی تقرری یک طرفہ معاملہ نہیں ہے، ریاستی چیف جسٹس کے سوال پر چیف جسٹس آف انڈیا کی رائے مقدم تو ہو سکتی ہے لیکن یہ ریاستی سرکار پر کوئی BINDING نہیں ہو سکتی کیونکہ اس معاملے میں چیف جسٹس آف انڈیا ریاستی آئین کا اسی طرح تابع ہے جس طرح صدر جمہوریہ ہیں۔"

ماہرین کی رائے میں شیخ عبداللہ نے چیف جسٹس کی تقرری پر اپنی سرکار کی سفارش منظور نہ ہونے کی صورت میں مستعفی ہونے کی جو دھمکی دی ہے اس کے پیچھے بھی یہی جذبہ ہے کہ مرکزی سرکار کو ان معاملوں میں ریاستی سرکار کی رائے مقدم سمجھنی چاہیے جو کلیتاً اس کے دائرۂ اختیار میں ہیں، اور جن کی نسبت مرکزی سرکار اور چیف جسٹس آف انڈیا محض اپنی رائے ظاہر کر سکتے ہیں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے۔

ریاستی چیف جسٹس کی تقرری کا سوال باعث نزاع بن گیا کیونکہ چیف جسٹس آف انڈیا نے ریاستی ہائیکورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس کی نسبت کہا کہ اُن کے خلاف موصولہ بعض شکایات بادی النظر میں صحیح معلوم ہوتی ہیں، اس کے پیش نظر ان کو چیف جسٹس کے عہدے پر مستقل کرنا ٹھیک نہیں رہے گا۔

چیف جسٹس کے طور پر مسٹر بہاءالدین فاروقی کی تقرری عمل میں لانے کا خطرہ مول

نہیں کیا جا سکتا، میں نے الہ آباد ہائیکورٹ کے جسٹس حمید حسین کو جموں وکشمیر ہائیکورٹ کا چیف جسٹس بنانے کی سفارش کی ہے اور اس کے لیے مرکزی وزیر قانون کو لکھا ہے جسٹس فاروقی کو پنجاب ہائی کورٹ کا جونیئر جج بنایا جائے۔ میں نے بہت پس وپیش کے بعد جسٹس فاروقی کو الہ آباد سے جموں وکشمیر تبدیل کیا تھا۔

۵ر نومبر کو آنریبل جسٹس فاروقی نے چیف جسٹس آف انڈیا سے ان الزامات کی تفاصیل مانگیں جو جسٹس فاروقی کے خلاف لگائے گئے ہیں، اور جن کے متعلق آنریبل چندرا چود نے کہا ہے کہ "تحقیقات کے بعد یہ الزامات بادی النظر میں صحیح ثابت ہوئے ہیں، ان کو ان الزامات کی نوعیت کے بارے میں کوئی علمیت نہیں اور نہ ہی معلوم ہے کہ یہ الزامات کن لوگوں نے کب لگائے ہیں اور ان کی تحقیقات کب ہوئی ہے اور کس طرح ہوئی ہے؟ بغیر سُنے کسی کی ملامت کرنا قانون اور اخلاق کے بنیادی اصولوں کے سراسر منافی ہے۔"

پیوپلز یونین فار سیل لبرٹیز کے کنوینر بشیر احمد خاں نے قائم مقام چیف جسٹس مسٹر بہاء الدین فاروقی کے خلاف ہندوستان کے چیف جسٹس مسٹر چندرا چود کے ریمارکس پر افسوس کا اظہار کیا۔ مرکزی وزیر قانون اور ہند کے چیف جسٹس کے درمیان مسٹر فاروقی کو مستقل تقرری سے متعلق خط وکتابت کو منظر عام پر لانے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا:

چیف جسٹس آف انڈیا مسٹر چندرا چود کے ریمارکس سے سیاست کی بو آتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے قانون کے بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اور بغیر کسی جائز تحقیقات کے مسٹر فاروقی کو مورد الزام ٹھہرایا ہے جس سے نہ صرف مسٹر فاروقی کی دیانت پر حرف آیا ہے بلکہ ریاستی عدلیہ کے وقار کو زک پہنچی ہے یہ یہ مسٹر چندرا چود ہی تھے جنہوں نے جنتا حکومت کے دوران مسٹر فاروقی کی مستقل تقرری کی سفارش کی تھی اور دُکھ اس بات کا ہے کہ مرکزی حکومت میں تبدیلی کے ساتھ ہی انھوں نے بھی اپنی سفارشات میں تبدیلی پیدا کی۔ مسٹر چندرا چود کا یہ دعویٰ کہ مسٹر فاروقی کے خلاف کچھ شکایات درست ثابت ہوئی ہیں۔ قدرتی انصاف کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت کا سربراہ

ہوتے ہوئے وہ قانون کے بنیادی اصولوں سے ناواقف لگتے ہیں چوں کہ ریاستی ہائیکورٹ ریاستی آئین کی پیداوار ہے اس لیے ریاستی عوام کا یہ حق بنتا ہے کہ انہیں مسٹر بہاء الدین کے خلاف شکایات کی نوعیت اور شکایت کنندگان سے مسٹر فاروقی کو آگاہ کیا جائے ورنہ یہی تصوّر کیا جائے ورنہ یہی تصور کیا جائے گا کہ ریاستی ہائیکورٹ کو ایک مکروہ سازش کے تحت ایک مقامی چیف جسٹس کی خدمات سے محروم کیا گیا۔"

۷ر نومبر ۱۹۸۱ء کو جموں وکشمیر کے چیف جسٹس مفتی بہاء الدین فاروقی نے ان الزامات پر جو ان پر آنریبل چیف جسٹس آف انڈیا نے لگائے ان کے بارے میں فرمایا:

"میں عوام کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مناسب وقت پر میں حقایق سامنے لاؤں گا اور ریاستی عدلیہ کے وقار اور خود اپنے وقار کو VINDICARTE کروں گا اور اس سازش وشرارت کو مکمل طور پر ننگا کروں گا۔"

وزیر قانون شری موہن کشن تکو نے پریس کانفرنس کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا۔

"جموں وکشمیر ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کی تقرری سے متعلق ریاستی سرکار کی سفارش مرکز پر ایک قسم کی BINDING ہے۔"

شری موہن کشن تکو نے اس موقعہ پر اُس چٹھی کا متن اخباری نمائندوں میں جاری کیا جو انھوں نے اس سلسلے میں مرکزی وزیر قانون کے نام بھیجدی تھی۔

"مائی ڈیر شیو شنکر!

جیسا کہ آپ کو علم ہے مسٹر جسٹس مفتی بہاء الدین فاروقی کے جموں وکشمیر ہائیکورٹ کے مستقل چیف جسٹس کی حیثیت سے تقرری کے معاملہ پر مرکزی وزیر قانون کے نام چیف جسٹس آف انڈیا کا، ستمبر ۱۹۸۰ء کا خط منظر عام پر لایا گیا ہے، مختلف اخباروں میں شائع اس خط کے مطابق چیف جسٹس آف انڈیا نے دوسری باتوں کے علاوہ کہا ہے کہ — میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص فی الحال مسٹر فاروقی کو ہائیکورٹ کا مستقل چیف جسٹس بنانے کا خطرہ مول لے سکتا ہے۔ میں نے بڑے

پس و پیش کے بعد ان کی الہ آباد سے جموّں وکشمیر تبدیلی اور پھر اُن کے قائم مقام چیف جسٹس میں ان کے خلاف کئی شکایات موصول ہوئی ہیں جن میں سے کئی تحقیقات پر درست دکھائی دیتی ہیں اس خط کی اشاعت سے عوام کی نظروں میں نہ صرف قائم مقام چیف جسٹس کی شہرت پر بڑی حد تک دھبّہ لگا ہے بلکہ اس سے ایک مضحکہ خیز صورت حال بھی پیدا ہوگئی ہے ایک صاف ستھرے اور قابلِ نظام عدلیہ کے لیے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ لوگوں کو عدلیہ کی غیر جانب داری اور ججوں کی دیانت داری اور ایمانداری پر مکمل یقین ہو اگر یہ یقین ایک بار درہم برہم ہوا تو اس سے اس سارے سسٹم کو شدید دھچکہ لگتا ہے۔ ان حالات میں ریاستی حکومت قائم مقام چیف جسٹس کے پریشان کُن مستقبل کے بارے میں خاموش نہیں رہ سکتی ہے۔ کیونکہ وہ اسوقت عدلیہ کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہیں اور انہیں عوام کے تئیں انصاف کرنے کا فرض سونپا گیا ہے، جبکہ خود ان کے نام پر سنگین دھبّہ لگایا گیا ہے۔

صورتحال کو مزید گمبھیر بنانے والی بات تو یہ ہے کہ جج کو قصور وار گردانا گیا مگر ایسا لگتا ہے کہ ان کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا ہے اور نہ ہی ریاستی حکومت کو ان سنگین شکایات کے بارے میں اعتماد میں لیا گیا ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ قبل جب وزیر اعلیٰ نے آپ کے ساتھ یہ معاملہ اُٹھایا تو آپ نے انہیں بتایا کہ جسٹس فاروقی کے خلاف چند شکایات ہیں اور اُن شکایات سے متعلق فائل انہیں بھیجدی جائے گی، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں کیا گیا۔

جموں وکشمیر ہائیکورٹ ریاستی آئین کے تحت قائم ہوا ہے، صدر کو ریاستی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور دیگر ججوں کی تقرری کے اختیارات ریاستی آئین کے تحت نہ کہ آئینِ ہند کے تحت حاصل ہیں، عام حالات میں ریاست جموں وکشمیر کے گورنر نے جو سفارشات پیش کی تھیں انہیں بغیر کسی پس و پیش کے تسلیم کیا جانا چاہیے تھا کیونکہ کسی اور شخص کے مقابلے میں ریاستی حکومت سے ریاست کے کسی ایسے شخص کو موزونیت اور قابلیت سے بہتر طور پر واقف ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے جس کو ریاستی ہائیکورٹ کا چیف جسٹس تعینات کرنے کی تجویز ہو، بشرطیکہ صدر یا چیف جسٹس آف انڈیا کو ان سفارشات پر کوئی تامّل یا اعتراض نہ ہو ان اعتراضات و پس و پیش کو ریاستی حکومت یا گورنر کو بھیجدینا چاہیئے تھا۔ بصورت دیگر آئین کے تحت احکامات کی تکمیل نہیں ہوسکے گی۔ آئینی دفعات میں ریاست جموں وکشمیر کے چیف جسٹس کی تقرری سے متعلق یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ صدر جمہوریہ ریاستی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی چیف جسٹس آف انڈیا اور گورنر کے صلاح ومشورہ کے بعد تقرری کر سکتا ہے اگر مشورے میں فریقین کو آزادانہ طور پر اپنے خیالات نظریات اور اعتراضات اگر کوئی ہوں پیش کرنے کی آزادی نہ ہو تو قانونی لحاظ سے اسے صلاح مشورہ نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے یہ گذارش کرنے کی اجازت دیجیئے کہ برائے کرم ریاستی سرکار کو ان شکایات کی تفصیلات جاننے کا موقع دیا جائے جو جسٹس فاروقی کے خلاف چیف جسٹس آف انڈیا کو موصول ہوئی ہیں۔

آپ کا تابعدار

موہن کشن ٹنکوّ، وزیر قانون

حکومت جموں وکشمیر "

موہن کشن ٹنکو سے اس موقع پر پوچھا گیا کہ — گورنر سے متعلق مرکزی آئین اور جموں وکشمیر آئین کی دفعات بالکل ایک جیسی ہیں اور اُن کے الفاظ میں کوئی فرق نہیں ہے ان حالات میں درج ہے — صدر جمہوریہ ریاستی چیف جسٹس کی تقرری چیف جسٹس آف انڈیا اور گورنر کے ساتھ صلاح ومشورے کے بعد کرے گا۔ چیف جسٹس کی تقرری کا آخری اختیار صدر جمہوریہ کو حاصل ہے تو انہوں نے کہا "یہ اختیار

ریاستی سرکار کے صلاح ومشورہ کے تابع ہے "۔

ان سے پوچھا گیا۔" صلاح ومشورہ کا یہ مطلب نہیں کہ صدر جمہوریہ ریاستی سرکار کے مشورہ قبول کرنے کا پابند ہے تو تکّو صاحب نے کہا۔

" جموں وکشمیر کی پوزیشن دوسری ریاستوں سے مختلف ہے، یہاں کی ہائیکورٹ ریاستی آئین کی تخلیق ہے اس آئین کے تحت گورنر کی تقرری کے معاملہ میں صدر جمہوریہ اختیا' ت حاصل کرتا ہے "۔

مسٹر تکو سے پوچھا گیا کہ ۔۔ اگر صدر جمہوریہ ریاستی سرکار کے مشورہ کو نظرانداز کر کے اور اپنے طور سے گورنر کی تقرری عمل میں لائے تو کیا ہوگا ۔۔ ؟"

انہوں نے جواب دیا۔

" ایسا نہیں ہو سکتا، ہم شخصیات کا دفاع نہیں کرتے بلکہ اصولوں کے قائل ہیں معاملہ بالکل سیدھا اور صاف ہے ہم نے قائم مقام چیف جسٹس مفتی بہار الدین فاروقی کی تقرری کو مستقل بنانے کی سفارش کی ہے ایک سال سے زیادہ عرصے سے گورنمنٹ آف انڈیا اس سفارش کی نسبت خاموش ہے ایک سال کے بعد اخباری اطلاعات کے ذریعے ہمیں پتہ چلا ہے کہ چیف جسٹس آف انڈیا مسٹر چندرا چوڑ مسٹر فاروقی کو چیف جسٹس بنانے کے خلاف ہیں، انھوں نے مرکزی وزیر قانون کو اپنے خط میں لکھا ہے کہ مسٹر فاروقی کے خلاف کچھ الزامات ہیں جو تحقیقات سے درست ثابت ہو گئے ہیں، سوال یہ ہے کہ ان الزامات کی نسبت ریاستی سرکار کو کوئی علمیت نہیں ہے اور نہ ہی اسے یہ معلوم ہے کہ یہ الزامات کیا ہیں اور کن لوگوں نے لگائے ہیں اور ان کی تحقیقات کس ایجنسی نے کی ہے چیف جسٹس آف انڈیا نے خود کئی کیسوں کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا ہے کہ تب تک کسی کی ملامت نہیں کی جانی چاہیئے جب تک ساری حقیقت سامنے آکر اس کو نہ سنائی جائے جس کے بارے میں شکایت ہے، یہاں پر مسٹر فاروقی کو خود بھی معلوم نہیں کہ اُن کے خلاف کیا الزامات ہیں، اگر چیف جسٹس آف انڈیا اور مرکزی سرکار بعض الزامات کی بنا پر یہ سمجھتی تھی کہ مسٹر فاروقی کو مستقل چیف جسٹس بنانا ٹھیک نہیں رہے گا تو وہ اس کے لیے ریاستی سرکار سے صلاح مشورہ کر سکتی تھی لیکن چیف جسٹس آف انڈیا نے ان پر جو الزامات لگائے ہیں وہ بہت افسوسناک ہیں ان الزامات سے مسٹر فاروقی کی شہرت اور

ت خراب ہو گئی ہے "۔

اس وقت جبکہ موہن کشن تکو اخباری نمائندوں کے سامنے سرکار کا موقف واضح رہے تھے، ڈاکٹر فاروق عبداللہ پیارے لال ہنڈو ایڈوکیٹ کے ساتھ بار ایسوسی ن کے دفتر میں گفتگو کر رہے تھے۔ ڈاکٹر فاروق مسٹر ہنڈو کے ذریعے بار ایسوسی یشن کو اس مسئلے پر اُکسا رہے تھے تاکہ اس مسئلے کے بارے میں تمام وکلاء ان کی مدد کر سکیں۔

ڈاکٹر فاروق کے جانے کے بعد اگلے روز پیارے لال ہنڈو نے بار ایسوسی ایشن کی ک طلب کی اس میں انہوں نے وکلاء کو قایم مقام چیف جسٹس آنریبل بہار الدین اروقی کا دفاع کرنے کا سجھاؤ دیا۔ جو بیشتر وکلاء نے قبول کر لیا۔

۸ ر نومبر کو کوئی ایک سو وکلاء نے مانگ کی ۔۔" ریاستی چیف جسٹس کے خلاف شکایات کیا ہیں؟ اور شکایات کرنے والے کون ہیں؟"

ان وکلاء نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے اس خط پر حیرت اور افسوس کا اظہار کیا، جو اطلاعات کے مطابق انہوں نے مرکزی وزیر قانون کو ارسال کیا ہے اور جس میں انہوں نے مبینہ طور پر کہا ہے کہ ریاستی ہائیکورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس مسٹر بہار الدین اروقی کے خلاف شکایات درست ثابت ہو گئی ہیں!

ایک سو وکیلوں کی طرف سے یہ بیان پیارے لال ہنڈو ایڈوکیٹ نے جاری کیا، بیان ن یہ بھی کہا گیا۔

جس وقت ریاست جموں وکشمیر کے لوگ قائم مقام چیف جسٹس کی تقرری کو مستقل بنانے کے آرڈر کا انتظار کر رہے تھے، چیف جسٹس آف انڈیا نے ایک خط کا انکشاف کیا، اس خط کے انکشاف سے اُن لوگوں کو زبردست صدمہ ہوا ہے جو ریاست جموں وکشمیر کے ین کو ہندوستان کا ہی آئین تصوّر کرتے ہیں، ریاستی عدالت العالیہ کے چیف جسٹس کی تقرری کو کنفرم کرنے کی کارروائی میں تاخیر سے نہ صرف ریاستی قانون سازیہ کے ارکان کو بلکہ ریاستی عوام کو کافی حد تک حیران کر دیا ہے۔ قانون سازیہ کے ارکان کو بلکہ ستی عوام کو کافی حد تک حیران کر دیا ہے، قانون سازیہ کے بجٹ سیشن اور حالیہ سیشن ں یہ معاملہ ممبران اسمبلی کو پریشان کرتا رہا، ریاست کے ہر کس و ناکس کو یہ جان کر

حیرت ہوئی کہ قائم مقام چیف جسٹس کا چارج سنبھالنے کے کئی ماہ بعد سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے کہا کہ ریاستی عدلیہ کے چیف جسٹس کے خلاف شکایات موصول ہوئی ہیں اور ان کی تحقیقات کی گئی ہے۔

آزاد اور خود مختار عدلیہ کے ایڈوکیٹوں کو یہ جان کر دھکا لگا ہے کہ زیر بحث شکایات کی تحقیقات کے بعد یہ درست ثابت ہوئی ہیں اور ان کی وجہ سے ہی چیف جسٹس کی کنفرمیشن میں تاخیر ہوگئی ہے۔

یہ ہماری ریاست کا بڑا المیہ ہے کہ نئی دہلی کے لوگ ریاست کے حالات وواقعات سے متعلق ہر قسم کی گپ اور شکایات پر کان دھرتے ہیں خوش قسمتی سے جوڈیشری اب تک اس قسم کی باتوں سے بالکل بے تعلق تھی۔ اب تک سیاسی طور ہم نے اس قسم کے واقعات کی بڑی قیمت چکائی ہے اگر ان واقعات کا خاص نوٹس نہ لیا جائے گا جن کا انکشاف کیا گیا ہے تو شاید ہمیں اس کے لیے زیادہ قیمت ادا کرنا پڑے، ریاست کے لوگ یہ جاننے کا حق رکھتے ہیں کہ چیف جسٹس کے خلاف شکایات کرنے والے کون ہیں، شکایات کیا ہیں؟ اور شکایات کی تحقیقات کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے؟ اگر ریاستی سرکار اور مرکزی سرکار فوری طور کارروائی نہیں کرے گی اور کوئی وقت ضائع کیے بغیر ان سوالات کے جواب نہیں دیئے تو اس سے ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔

۹ نومبر ۱۹۸۱ء کو بار ایسوسی ایشن سرینگر نے ایک ہنگامی اجلاس میں چیف جسٹس آف انڈیا پر اعتماد شکنی کا الزام لگایا۔

انہوں نے اپنے ایک مشترکہ اعلامیہ میں کہا۔ ہمیں قائم مقام چیف جسٹس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے۔ انہوں نے اس بارے میں ایک ریزرلیوشن پاس کیا جس میں چیف جسٹس آف انڈیا کی طرف مسٹر فاروقی پر لگائے گئے الزامات کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا گیا کہ ان الزامات سے ہمیں شدید دھچکا لگا ہے خاص کر اس وقت جب ریاست کے لوگ بالعموم اور قانونی پیشہ سے تعلق رکھنے والے بالخصوص یہ توقع رکھتے تھے کہ جسٹس فاروقی کو جو دو سال سے قائم مقام چیف جسٹس کے طور پر کام کرتے ہیں کنفرم کیا جائے گا، یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ چیف جسٹس جو ملک کی سب سے بڑی عدالت کے سربراہ

ہیں انہوں نے کچھ خیالی الزامات کو باوزن قرار دیا ہے، جو کہ انصاف کے قدرتی اصولوں کے بالکل منافی ہے۔

اسی دوران وزیر اعلیٰ کے جانشین ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے مرکزی سرکار پر الزام لگاتے ہوئے کہا۔ "کانگریس کو ہندوستان میں ہریجنوں اور مسلمانوں کی ہلاکت کی کوئی فکر نہیں ہے فکر اگر ہے تو یہ کہ نیشنل کانفرنس کی عوامی حکومت کیسے ختم کی جائے۔ کانگریس نیشنل کانفرنس جیسی عوامی تنظیم کو ختم نہیں کر سکتی، اور نہ اپنی من مانی کارروائی سے جسٹس بہاء الدین کو تبدیل کر سکتی ہے۔ ہم اس کے لیے ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور قانونی جنگ لڑیں گے۔

اس دھمکی آمیز بیان کے بعد ریاستی سرکار نے دیوی داس ٹھاکر کو دہلی روانہ کیا تاکہ وہ وزیر قانون شری شیو شنکر سے مل کر یہ معاملہ سلجھا سکیں۔ لیکن جب دیوی داس ٹھاکر نامراد ہو کر واپس آئے، تب شیخ عبداللہ کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا جو اس نے چیف جسٹس کی تبدیلی کے ساتھ اپنا استعفیٰ جوڑ دیا تھا، ادھر شیخ محمد عبداللہ مرکزی سرکار کے آگے اپنا سر خم کرنے کی تیاری کر رہے تھے، ادھر بار ایسوسی ایشن کے ایک رکن اور پیپلز کانفرنس کے نائب صدر مظفر حسین بیگ نے پریس کانفرنس میں کہا۔

مسٹر بہاء الدین کے خلاف چیف جسٹس آف انڈیا اپنے الفاظ واپس لے لیں۔ ہندوستان کے چیف جسٹس مسٹر چندراچود کو ریاست کے قائم مقام چیف جسٹس مسٹر فاروقی کے خلاف پہلے ایسے ریمارکس واپس لینے چاہئیں اور اس کے بعد ہی جسٹس فاروقی کے خلاف غیر جانب دار انکوائری کی جا سکتی ہے، چیف جسٹس آف انڈیا نے نہ صرف ایک اخلاقی غلطی کی ہے بلکہ آئین اور قانون کے تئیں اپنے حلف وفاداری سے بھی انحراف کیا ہے مسٹر چندراچود کے اس بیان پر کہ انھوں نے مسٹر فاروقی کی تبدیلی با دل ناخواستہ تسلیم کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کسی دباؤ کے تحت ایسا کیا ہوگا اور اس طرح انھوں نے اپنے حلف وفاداری سے انحراف کیا، جس میں انہوں نے بغیر کسی خوف یا دباؤ کے آئین اور قانون کی علمبرداری کا ذمہ لیا، جس ڈھنگ سے انھوں نے جسٹس فاروقی کے پیٹھ پیچھے انہیں مورد الزام ٹھہرایا وہ فطری انصاف کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے ریاستی ہائیکورٹ ریاستی آئین کی پیداوار ہے اور صدر جمہوریہ ریاستی ججوں

کی تقرری اور مستقل کا اختیار آئین سے حاصل کرتا ہے، اس پس منظر میں ججوں کی تقرری ریاستی حکومت کی سفارش مرکزی حکومت پر BINDING ہے، وزیر اعلیٰ نے اس سلسلے میں شروع میں ایک صحیح پوزیشن اختیار کی لیکن اب اس پوزیشن کو دیوی داس ٹھاکر سبوتاژ کر رہے ہیں"۔

دیوی داس ٹھاکر اپنے مشن میں ناکام ہوکر لوٹ آئے تو مرکزی وزیر قانون نے ریاستی ہائی کورٹ کے لیے نئے چیف جسٹس کے طور پر چیف جسٹس مسٹر خالد کا نام افشا کیا۔ مسٹر خالد کی تقرری سے وزیر اعلیٰ کے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی تو انھوں نے قائم مقام چیف جسٹس مسٹر بہاءالدین فاروقی سے قربانی دینے کی استدعا کی اس قربانی کے عوض میں انھیں نیشنل کانفرنس میں لے کر وزیر قانون بنانے کا وعدہ دیا گیا۔

چیف جسٹس مسٹر خالد کی آمد تک ریاست کی سیاسی حالات میں نمایاں تبدیلی آنے لگیں، سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی کہ وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کی صحت گرنے لگی، شیخ صاحب ایسے بیمار پڑے کہ پھر اُٹھ نہ سکے بہاءالدین فاروقی نے تبدیلی کا آرڈر قبول کرنے کے بجائے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے انہیں نیشنل کانفرنس میں لینے اور پھر وزیر قانون بنانے کا کوئی رِسک نہیں لیا۔ کیونکہ ان کی نظر میں اس کارروائی سے مرکزی سرکار کے ناراض ہونے کا احتمال تھا، اور وہ بھی کسی صورت میں مرکز سے ناراضگی مول لینے کے تیار نہیں تھے۔ اس طرح مسٹر بہاء الدین فاروقی قربانی کا بکرا بنائے گئے۔

تعجب اور حیرانگی کی بات تو یہ ہے کہ ایک ایسی شخصیت جو ریاست کے سب سے بڑے عہدے پر تعینات تھی، جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قانون دان تھی۔ نیشنل کانفرنس جیسی تنظیم میں شامل ہونے کا اعلان کرنے کے دوران اپنی عزّت وقار اور قابلیت کے ساتھ خود ہی ایسا کھلواڑ کر سکی کہ انہوں نے اپنے آپ کو گمنامی کے غار میں دھکیل دیا۔ نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ نے ریاستی چیف جسٹس کی تبدیلی پر مستعفی ہونے کا جو اعلان کیا۔ خود استعفےٰ دینے کے بجائے چیف جسٹس کو استعفیٰ دلوا کر وزارت کے مزے لوٹنے لگے۔

باب (۴)

کشمیر کے لیڈرانِ قوم حقیقت کے آئینے میں

شیخ عبداللہ کی رحلت۔ ایک دَور کا اختتام

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ اِنساں کا شِکاری ہے

جز:-

گزرے ہوئے دن رات تو اب مل نہ سکیں گے
اب کون سی اُمّید پہ اُنہیں یاد کرو گے

شیخ محمدؐ عبداللہ کا اعترافِ شکست اور احساسِ گناہ

سیاست کشمیر اور شیخ محمد عبداللہ کو اگر لازم و ملزم کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ کشمیر کی سیاست پر نصف صدی تک مکمل طور پر چھائے رہنے کے کارن وہ سیاست کی ایک "تاریخ" بن گئے۔ اس حیثیت میں ان کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔ البتہ ان میں دو رائیں ضرور اہم ہیں ـــ ایک رائے یہ ہے کہ شیخ عبداللہ بے لاگ نڈر اور پُر خلوص لیڈر تھے اور انہوں نے کشمیری قوم کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا۔

دوسری رائے یہ ہے کہ وہ موقع پرست، مفاد پرست اور بے اصول لیڈر تھے جنہوں نے کشمیری قوم کو غلام بنا دیا۔

اِن دونوں رایوں میں جو زبردست تضاد شیخ عبداللہ کی زندگی میں نمایاں طور پر حاوی رہا ہے۔

کشمیر کی سیاست اور شیخ عبداللہ کی شخصیت پر پچھلے پچاس برسوں میں جو کتابیں رسالے، پمفلٹ اور اخباری مراسلے لکھے گئے ان میں ان کی شخصیت کے بارے میں اس تضاد کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔



(شیخ محمد عبداللہ

شیخ عبداللہ کے حمایتی انہیں ہر مسئلہ میں صحیح مانتے ہیں، وہ ان کی غلطیوں کو ایسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں گویا وہ ایسا کرنا ایمان کا ایک جُز سمجھتے ہیں وہ ان کے خلاف کچھ سننے پر ایسا "تلملا اُٹھتے" ہیں، گویا کسی پیغمبر یا نیک ولی اللہ کے بارے میں سن کر "تلملا اٹھا" جاتا ہے۔ شیخ محمد اللہ کے مخالفین انہیں اول اور آخر حرف غلط سمجھ رہے ہیں، وہ ان کا نام حقارت سے لیتے ہیں، وہ انہیں ریاست کی تمام

براٸیوں کی جڑ سمجھتے ہیں۔

شیخ عبداللہ سیاسی دنیا کی واحد شخصیت ہیں جن کے سیاسی میدان میں بے شمار دوست اور ساتھی تھے، لیکن آخر وقت تک نہ ان کا کوئی دوست تھا اور نہ کوئی ساتھی۔ یا تو وہ بے شمار لوگ غلط تھے یا ہو سکتا ہے، یہ واحد شخص غلط تھے۔ کچھ نہ کچھ تو غلط ضرور تھا، ورنہ، نہ وہ بے شمار ساتھی ایک ایک کر کے ان کا ساتھ چھوڑ دیتے، نہ یہ انہیں ایک ایک کر کے الگ کر دیتے۔

شیخ محمد عبداللہ اصل میں کیا ہیں اور کیا نہیں ہے؛ اس کا جواب ہمیں ان کی سوانح حیات "آتش چنار" میں مل سکتا تھا مگر بد قسمتی سے ایسا نہیں ہوا، آتش چنار دراصل ان کی سوانح حیات نہیں بلکہ قصیدہ خوانی ہے۔ اس میں کشمیر کی سیاسی تحریک کے اہم گوشوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، اگر شیخ صاحب نے کم از کم اس ایک کتاب کے لکھنے لکھانے پر ایمانداری کا مظاہرہ کیا ہوتا تو ایسی بہت سی گرہیں کھل سکتی تھیں جو ہماری سیاست کو پیچ دار بنا چکی ہیں۔

اسے ستم ظریفی کہیے یا بد قسمتی، کہ بعض اہم واقعات کے بارے میں شیخ صاحب نے خاموشی سے کام لیا۔ اور جن واقعات کے بارے میں انھوں نے صاف گوئی سے کام لیا، اسے "آتش چنار" سے نکال کر ان کی بیگم صاحبہ اور فرزند نے بد دیانتی کا خوب مظاہرہ کیا۔



(اندرا گاندھی)

مجھے معتبر ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ اور رام چندر کاک کے بارے میں جہاں انہوں نے مصلحت سے کام لے کر اسے آتش چنار میں شامل کرنے سے روکا وہاں ہندوستان خاص طور پر مسنر اندرا گاندھی کے بارے میں انھوں نے "آتش چنار" میں جو کچھ بھی قلمبند کیا تھا وہ اُن کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اس کتاب سے حذف کیا گیا۔

ایک نامور مبصر کلدیپ نیر نے انکشاف کیا ہے کہ آتش چنار سے ہندوستان کے بارے میں کوئی ۲۲ صفحات نکال دیئے گئے ہیں جن میں انہوں نے ہندوستان اور مسنر اندرا گاندھی کی خوب مخالفت کی ہے اور ۱۹۷۵ء کے ایکارڈ کو

روبہ عمل لانے میں اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے "آتش چنار" سے کوئی پچاس صفحے نکال دیئے گئے ہیں، انہوں نے واقعی ۱۹۷۵ء کے ایکارڈ کے بارے میں اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے۔ مسنر اندرا گاندھی کو ایک ڈائن کے نام سے یاد کیا ہے اور کہا ہے "اس ڈائن پر کبھی کوئی بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ انھوں نے صاف صاف لکھدیا تھا، ہندوستان ہمارا دوست نہیں بلکہ اپنے مفادات کا دوست ہے۔ اس نے کشمیر کو ایک کالونی سمجھ رکھا ہے۔ کشمیر کے بارے میں ان کی نیت صاف نہیں ہے، وہ ہمیں کھا جائے گا۔ وہ یہاں کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دینے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ ایک وقت آئے گا جب یہ کشمیر کو فلسطین بنا کر چھوڑے گا۔

مجھے ہندوستان کو سمجھنے میں بہت دیر لگی اور میں سوچ رہا ہوں اگر مجھے نئی زندگی مل جاتی تو میں نئے سرے سے ہندوستان کے خلاف اسی طرح لڑتا جس طرح ڈوگرہ شاہی کے خلاف لڑا تھا۔"

شیخ عبداللہ نے تفصیل سے اُن باتوں کی نشاندہی کی ہے جن میں اپنی بیگناہی ثابت کر کے سارا الزام ہندوستان کے حکمرانوں پر ڈال دیا ہے، انھوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مسٹر جناح نے مجھ سے کہا تھا کہ ان پر بھروسہ نہ کرو، میرے بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے ہیں، بلکہ سیاسی دنیا میں سفید ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں (ہندوستانیوں) کو آزمایا ہے، تم انہیں آزمانے کی غلطی نہ کرو۔

شیخ عبداللہ کا کہنا ہے، حالانکہ محمد علی جناح مجھ سے سینئر تھے اور مجھ سے زیادہ دنیا دیکھ چکے تھے مگر ذوالفقار علی بھٹو جو میری اولاد کے برابر تھے اور جن کو میں نے کبھی لفٹ ہی نہیں دی انھوں نے بھی مجھ سے مخاطب ہو کر ایکارڈ کی بات چیت کے دوران کہا تھا۔ شیخ صاحب یہ آپ کی تیسری اور آخری غلطی ہوگی۔

اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ میری آخری غلطی تھی، جس کو سدھارنے کے لیے مجھے نئی زندگی چاہیے اور یہ زندگی ———— میرے بیٹے فاروق عبداللہ بھی بخش سکتے ہیں۔"

مہاراجہ ہری سنگھ اور رام چندر کاک کے بارے میں ان کے خیالات اور نظریات

کس نے بدل دیئے ہیں، یہ ایک راز ہے، اس راز میں ان کا احساسِ گناہ پوشیدہ ہے۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کب تک پوشیدہ رہے گا۔

جولائی ۱۹۸۲ء میں شیخ محمد عبداللہ کو دل کا دورہ پڑا، اگرچہ یہ دورہ زیادہ شدید نوعیت کا نہ تھا لیکن اس سے ان کو ایک زبردست



جھٹکا لگا، انہیں ایسا لگا گویا ان کے دن پورے ہوگئے ہیں اور بہت جلد ایک بہت بڑی حقیقت کا سامنا کرنے والے ہیں۔

انسان کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہے کہ جب اسے احساس جاگتا ہے، مجھے اب اِس دُنیا سے جانے کے لیے رختِ سفر باندھنا ہے تو وہ دوسری دُنیا کے سامان کا جائزہ لینے لگتا ہے انسان کتنا ہی پاکباز، پارسا اور پاک دامن کیوں نہ ہو پھر بھی اُسے جہنّم کا کھٹکا ضرور لگا رہتا ہے اور جاتے جاتے وہ ایسے کام کرنا چاہتا ہے جس سے کسی قدر خدا کی خوشنودی اسے مل سکے۔

خدا کے پاس جانے کا خیال آتے ہی انسان کے سامنے اپنے گناہوں کا ایک انبار آجاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ان میں سے جتنے گناہوں کی تلافی ہوسکے وہ جلدی جلدی انکی تلافی کر اسکے تاکہ ان گناہوں میں تھوڑی ہی سہی کمی آجائے۔

چونکہ شیخ عبداللہ بھی اوّل اور آخر ایک انسان تھے، لہٰذا دل کا دورہ پڑنے کے ساتھ ہی انہیں اپنے کیے ہوئے گناہوں کو شمار کرنے کا خیال آیا۔ اور گناہوں کو گننے گنتے جن کی وہ تلافی کرسکتے، کرنے لگے۔

دل کے دورے سے شیخ صاحب کچھ سنبھل گئے تو انہیں سب سے پہلے مہاراجہ ہری سنگھ اور سابقہ وزیر اعظم رامچندر کاک یاد آگئے۔ چونکہ مہاراجہ ہری سنگھ اس دُنیا میں موجود نہیں تھے۔ لہٰذا ان سے اپنے کیے کی معافی مانگنا ناممکن تھا۔ لہٰذا رام چندر کاک پر ہی اکتفا کیا گیا۔

ٹھیک ۹ اگست ۱۹۸۲ء کو جب نیشنل کانفرنس اور اس کی لیڈرشپ وادی میں "یومِ سیاہ" منا رہی تھی، میں اپنے ایک ساتھی کی وساطت سے رامچندر کاک سے ملاقات کے لیے ان کے گھر دارا ہا روان گیا۔ رامچندر کاک ان ایّام میں صحت کی ناسازی کے کارن بستر میں تھے، البتہ میری آمد پر وہ بستر میں ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنا تعارف

یا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا:

"تم کسی اخبار کے مالک یا مدیر تو نہیں ہو؟"

رام چندر کاک کے پوچھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی ایسے شخص سے ملنا نہیں چاہتے، خبار کے ساتھ وابستہ ہو، میں نے جب انہیں یقین دلایا میں کوئی اخباری آدمی ں اور نہ ہی میں آپ سے کوئی انٹرویو لے کر اخبار میں شائع کرنا چاہتا ہوں تو انھیں گونہ خوشی ہوئی اور وہ مجھ سے گھل مل گئے۔ باتوں باتوں میں، میں نے اندازہ کر لیا سیاست خاص طور پر کشمیر کی سیاست کے بارے میں بالکل کچھ کہنا نہیں چاہتے ہیں کہ میری کوشش یہ تھی کہ کشمیر کی سیاست پر یہ کچھ اُگل دیں۔

کافی گھما پھرا کر جب میں کوئی سیاسی بات چھیڑ دیتا تو وہ فوراً جھٹک دیتے، مجھے ی مایوسی ہوئی اور ان کی پیش کردہ چائے کے ساتھ میں مایوسی بھی پی گیا۔

کچھ دیر بعد میں نے رام چند کاک سے صاف طور پر کہدیا، میں نے کشمیر کی تاریخ اور تحریک کے پس منظر میں ایک کتاب لکھی تھی جو گورنمنٹ نے ضبط کرلی، مجھے نہیں لگتا وہ کتاب مجھے کبھی واپس ملے گی اس لیے آج کل میں "کشمیر کی سیاست" پر کام کر رہا ہوں اور واد جمع کر رہا ہوں۔ کئی دستاویزات کا مطالعہ کرنے کے دوران مجھے آپ کی اصلیت کا پتہ چلا چنانچہ آپ کے بارے میں مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔"

"میرے بارے میں پہلے تمہاری کیا رائے تھی ـ؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا، اور میں نے جواب دیا۔



(رامچند کاک)

"دراصل نیشنل کانفرنس اور اس کی لیڈرشپ نے آپ کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے ـ میرا خیال ہے آپ اس سے قطعاً مختلف ہیں۔"

میں نے دیکھا رامچند کاک نے ایک آہ بھری، کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکے۔

میں بڑی عاجزی سے بولا

"کاک صاحب! بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے بتا دیں گے کہ ہماری تحریک کو ہوا کیا؟"

"کیا ہوا۔ ؟ کچھ بھی تو نہیں۔ سب ٹھیک طرح چل رہا ہے، تمہارا محبوب لیڈر تم پر راج تاج کر رہا ہے ــ یہی تو تم چاہتے تھے۔"

میں نے دیکھا رام چند کاک کے ان ڈائیلاگ میں طنز بھرا ہوا تھا۔ میں ندامت سے بولا،

"سب لوگ تو ایسا نہیں چاہتے۔"

"سب لوگ کیا اکثر لوگ ایسا ہی چاہتے تھے اور جو وہ چاہتے تھے اُن کو مل گیا۔"

رام چند کاک نے یوں تو میری بولتی بند کر دی لیکن میں بول ہی پڑا۔

"آپ ہر کشمیری کو ایک ہی ناؤ میں سوار کر رہے ہیں ــ ایسی بات نہیں ہے، بیشک ہم شیخ عبداللہ کو یہاں کا نجات دہندہ مانتے تھے، لیکن انھوں نے اپنے کرتوت سے خود ہی اس کی تردید کی، وہ ہمارا رہبر نہیں رہزن نکلا۔"

میں نے دیکھا، میری زبان سے ایسا سنتے ہی رام چند کاک بستر میں سے اچھل سے گئے۔ مجھے لگا گویا میں نے اُن کے شانت ساگر میں پتھر پھینکا، وہ بڑے جذباتی انداز میں بولے:

"بڑی دیر کر دی تم لوگوں نے اپنے رہبر کو پہچاننے میں!"

میں نے سر خم کر کے تسلیم کر لیا۔ انھوں نے کہا۔

"کاش، تم کشمیریوں نے شیخ عبداللہ کو آج نہیں بلکہ ۱۹۴۷ء میں پہچان لیا ہوتا......!"

"تو کیا ہوتا ــ؟" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

وہ فوراً ایسے بولے جیسا ان کے اندر ایک لاوا تھا اور پھوٹنے کے لیے بیتاب تھا۔

"تو یہ ریاست آج ہندوستان کی غلام نہیں، بلکہ "کشمیرستان" کے نام سے ایک آزاد اور خود مختار ملک ہوتا۔ مہاراجہ اور میں نے اس کا نام اس کا لائحہ عمل اور اس کا پورا نقشہ بنا لیا تھا۔ مگر تمہارے عبداللہ نے ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ وہ بھارتی لیڈروں کے جھانسے میں آ گئے، انہوں نے اپنی قوم کے خلاف پنڈت نہرو کے ساتھ مل کر ایک سازش تیار کر لی، انہوں نے مجھے مہاتما گاندھی کے ہاتھوں وزارت سے نکلوا دیا، انھوں نے مجھے سرِ بازار رسوا کیا اس لیے کہ میں ریاستی عوام کی آزادی اور خود مختاری چاہتا تھا۔ میں نے ہندوستان کی بالادستی قبول نہیں کی، میں

...ارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کی سازش میں شریک نہیں ہوا، اسی لیے مجھے وزارت ...ے برطرف کرایا گیا۔

"کشمیر چھوڑ دو" تحریک میں مہاراجہ گھیرے میں نہیں آیا ہوتا تو وہ مہاتما گاندھی ...کیا سارے ہندوستان کی ایک بھی نہیں سننے والا تھا۔ اس نے جو ٹھان لی تھی وہ کر جاتا۔ ...لوگ بُرا نہیں مانو تو میں کہے دیتا ہوں کہ کشمیری عوام بڑے بدقسمت تھے جو اُن کے حصے ...ں ایسا لیڈر آیا، جس نے ایک آزاد قوم کو غلام بنا دیا۔

میں تمہیں بتا دوں گا ــ میں نے کشمیرستان، کو آزاد اور خود مختار رکھنے کے لیے ...مد علی جناح کو بھی اعتماد میں لیا تھا لیکن ان سے کہا گیا رام چند کاک آپ کو دھوکا دے ...رہا ہے۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے میری بات مان لی ہوتی تو آج حالات مختلف ہوتے ...یاقت علی خان کشمیر کو پاکستان کے ساتھ ملانے پر بضد رہے، حالانکہ میں نے انہیں ...یا تھا پہلے ہمیں ایک مرحلہ طے کرنے دیجیے، پھر دوسرا مرحلہ طے کرنے میں آسانی ہو گی ...یری اسی بات پر پنڈت نہرو میرے دشمن بن گئے۔ بدقسمتی سے میری آزادی کے تصور کو ...ک چال سمجھا گیا اور جلد ہی مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

کشمیری عوام نے اگر عبداللہ کے بجائے مجھ پر اعتبار کیا ہوتا تو آج یہ ملک فتنہ و ...اد کی آماجگاہ نہیں بلکہ ایک آزاد مملکت کے روپ میں ہوتا۔"

میں نے مداخلت کرتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"لیکن بعض اہم شخصیات کا کہنا ہے ایک چھوٹی ریاست جو کئی ممالک کے گھیرے ...ں ہو کیسے آزاد رہ سکے گی۔؟"

"یہ بھی پنڈت نہرو کی تھیوری تھی، ورنہ دنیا کا نقشہ گواہ ہے کوئی نہ کوئی ملک ...سرے ممالک کے گھیرے میں ہے، دنیا میں ایسے بھی ممالک ہیں جو رقبہ اور آبادی کے ...ظ سے ریاست سے کم ہیں ــ تمہارے عبداللہ نے اس موقع پر ہم سے بھی کہا ...ا ہم کیسے آزاد رہ سکیں گے جب کہ ہم چین، روس، ہندوستان، پاکستان اور ...انستان کے پنجے میں ہیں۔ لیکن آج وہ اپنی غلطی تسلیم کر رہا ہے ــ آج وہ اپنے ...ہوں کا پرائشچت کرنا چاہتا ہے لیکن بے فائدہ ــ! انہوں نے مجھے پچھلے ہی مہینے ایک ...بھیجا ہے وہ میں تم کو دکھاؤں گا۔"

کمرے میں کتابوں کی الماری سے وہ خط ڈھونڈھنے میں رام چند کاک کو جو کوفت اٹھانی پڑی اس سے میں نادم ہوا اور میں نے اس دوران کئی بار کہہ بھی دیا کہ چھوڑیئے اب — آپ کی صحت ٹھیک نہیں اور اس پر یہ زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔

لیکن کچھ دیر بعد انہیں ایک فائل میں سے یہ خط ہاتھ لگ گیا اور جب میں نے اسے پڑھا تو میں دم بخود رہ گیا اور میرے پاؤں تلے سے گویا زمین نکل گئی — میں نے اندازہ کر لیا اگر یہ خط ان کے ہاتھ نہ لگتا تو، اور میں اُسے نہ دیکھتا تو کشمیر کی تحریک حریت پر نہ جانے کب تک ایک پردہ پڑا رہتا۔ انگریزی میں ٹائپ کیا یہ خط فل اسکیپ کے دو اوراق پر مشتمل تھا۔ اس پر ایک کونے میں لکھا تھا :۔

PERSONAL NOT FOR PRESS"

اس خط کا مضمون یہ تھا :۔

" زندگی کے اس موڑ پر آ کر میں آپ کے ساتھ کیے گئے سلوک کی معافی چاہتا ہوں، اگر مہاراجہ بہادر سر ہری سنگھ جی زندہ ہوتے تو میں ان سے بھی معافی مانگ لیتا، مجھے یہ خیال کر کے سخت شرمندگی ہوتی ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی اور آپ کو غلط رنگ میں پیش کیا، اپنی اَنا کی خاطر میں نے آپ کا مشن ناکام بنا دیا۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ریاست جموں و کشمیر کے بارے میں مہاراجہ بہادر اور آپ کی تجویز صحیح تھی، اگر ہم نے آپ کی اور مہاراجہ کی تجویز مان لی ہوتی تو واقعی ہماری حیثیت آج بالکل مختلف ہوتی۔ آج مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ایک غیر مسلم ہو کر بھی آپ اپنے ملک کو ہندوستان میں شامل کرنے کے خلاف تھے جبکہ میں نے اپنے عوام کو ایک طرح سے ہندوستان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ جس وقت میں نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہندوستان کشمیر کو ایک کالونی سمجھے گا۔ میں آج ایک عجیب مخمصے میں ہوں اور یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں نے شاید کوئی غلط کام کیا ہے اور غلطی میں آپ سے جو سلوک میں نے کیا ہے اس کی تلافی ضرور ہو سکتی ہے، اگر آپ مجھے معاف کریں گے۔

میں آپ سے ملاقات کا بے حد شوقین ہوں۔ اگر آپ مجھے شرفِ ملاقات دیں گے تو میں سمجھوں گا، آپ نے مجھے معاف کر دیا۔

قاصد کے ذریعے مجھے ملاقات کے لیے وقت اور مقام سے آگاہ کریں۔"

" یہ قاصد کون تھا — ؟" میں نے جھٹ رام چند کاک سے پوچھا۔ انہوں نے بتایا۔

" میں جانتا نہیں — اُن کا کوئی رشتہ دار یا ملازم !"

" آپ نے قاصد کے ہاتھ کیا جواب بھیج دیا ؟"

انہوں نے کہا :

" میں نے جواب بھیج دیا، اگر آپ ہاروَن کے سر بند پُل سے ننگے پاؤں چل کر میرے گھر تک آئیں گے تو میں ملاقات دے سکتا ہوں اور ملاقات کے لیے یہ میری شرط ہے۔"

" اچھا —!" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "شیخ صاحب نے بُرا تو نہیں مانا ؟"

" نہیں۔ بلکہ یہ جواب بھیج دیا۔

" اگر میری صحت اجازت دیتی تو میں ضرور پیدل چل کر آپ کے در تک آ جاتا، آپ نے سُنا ہو گا مجھے حال ہی میں دل کا دورہ پڑا ہے اور میں ابھی ٹھیک طرح صحت یاب بھی نہیں ہوں، لہٰذا مجھ سے پیدل چلا نہیں جائے گا۔ آپ ایسا کیجیے کسی موزوں جگہ پر ملاقات کی تجویز رکھیے۔"

رام چند کاک :۔ خود میری صحت بھی ٹھیک نہیں ہے ایک مدّت سے صاحبِ فراش ہوں آپ کی بیماری کا لحاظ کر کے میں اپنی شرط نرم کر کے پاؤں میں جوتے پہن کر آنے کی اجازت دے سکتا ہوں لیکن کسی اور جگہ ملاقات کی تجویز ناقابلِ قبول ہے۔"

شیخ عبداللہ :۔ آپ میری صحت کا خیال کر کے مجھے اتنی رعایت دیجیے کہ میں اس مقام پر آپ سے ملاقات کر سکوں جہاں تک میں کار میں جا سکوں، کیونکہ میں چند قدم بھی پیدل چلنے کے قابل نہیں آپ تو بڑی اونچائی پر رہتے ہیں۔"

رام چند کاک :۔ فی الحال آپ صحت ٹھیک کیجیے پھر میرے پاس آنے کا پروگرام بنائیے کسی اور مقام پر ملاقات کا سوال ہی نہیں۔ جب آپ میرے در پر پیدل چل کر آئیں گے تب میں سمجھوں گا آپ اپنے کیے پر واقعی نادم ہیں ویسے ریاستی عوام کو آپ نے جو دھوکا دیا ہے میرے

پاس آکر معافی مانگنے سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی "۔

"اس کے بعد کیا ہوا ۔ ؟" میں نے کاک صاحب سے بڑی بے صبری سے پوچھا۔

شیخ صاحب نے قاصد بدل دیا تاکہ انہیں پتہ چلے کہ رام چند کاک ملاقات کے لیے جو کچھ بھی کہہ رہا ہے کوئی اس میں نمک مرچ تو نہیں لگا رہا ہے ــــ دوسرا قاصد آیا تو اُس نے اپنا تعارف خود ہی کرایا"۔

" اچھا ــــ کون تھا ؟"

" ان کا نام مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں البتہ وہ ریاستی کلچرل اکیڈیمی کا سکریٹری بتا رہا تھا "۔

" محمد یوسف ٹینگ نام تو نہیں بتا یا "۔

"ہاں ! یہی نام بتایا انھوں نے ــــ شیخ صاحب نے اُن کے ذریعے یہ پیام بھیجا تھا کہ آپ داچھی گام گیسٹ ہاؤس تشریف لائیں وہیں پر میں بھی آجاؤں گا۔ اگر آپ کہیں گے تو میں گیٹ سے گیسٹ ہاؤس تک پیدل چل کر آؤں گا۔ مگر میں نے اُن کی یہ تجویز نہیں مانی اور کہلا بھیجا کہ اگر آپ کو شرفِ ملاقات کے لیے آنا ہے تو میرے در تک پیدل چل کر آنا ہوگا ورنہ نہیں "۔

" اس کے بعد کیا ہوا ۔ ؟"

" وہاں سے کوئی پیام نہیں آیا۔ میں نے بھی اس مسئلہ کو ذہن سے اُتار دیا "۔

" کیا آپ مجھے یہ خط عنایت کر سکیں گے ؟" میں نے پوچھا۔

" نہیں، آپ اس کا مضمون بے شک لے سکتے ہیں لیکن خط نہیں۔ کیونکہ یہ میں نے اپنی ذاتی کتاب میں شامل کر لیا ہے، یہ کتاب میری بیوی لندن سے شائع کرے گی،، اس کتاب میں شیخ عبداللہ کے اور بھی کئی خطوط اور ڈاکومنٹس شامل ہیں جو بہت ہی اہم ہیں "۔



محمد یوسف ٹینگ اور شیخ صاحب

رام چند کاک سے رخصت ہوکر میں پہلی فرصت میں محمد یوسف ٹینگ سے ملا، مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ میرے بھائی کی حد تک میرے دوست مسٹر

محمد یوسف ٹینگ مجھے شیخ صاحب اور کاک صاحب کے درمیان ملاقات کے واقعات کہنے سے احتراز کریں گے لیکن انہوں نے بغیر کسی پس و پیش کے بتا دیا۔

" ہاں، شیخ صاحب نے مجھے رام چند کاک کو منانے بھیجا تھا لیکن کاک صاحب اپنی اس ضد پر قائم رہے کہ جب تک شیخ عبداللہ میرے در تک پیدل چل کر نہیں آئیں گے میں انہیں معاف نہیں کروں گا، چنانچہ شیخ صاحب راضی ہو گئے اور انھوں نے ڈاکٹر علی محمد جان کو بلوا کر ان سے پوچھ لیا ــ " کیا میں پیدل چل سکتا ہوں "۔


(ڈاکٹر علی محمد جان)

ڈاکٹر علی محمد جان نے کہا۔ "ہاں، چل سکتے ہو، لیکن زیادہ دور نہیں، زیادہ سے زیادہ پارک میں چہل قدمی کر سکتے ہو۔ !"

شیخ صاحب نے پوچھا۔ " اگر کچھ چڑھائی چڑھنی ہو تو.. "

ڈاکٹر صاحب نے انکار کیا۔ انھوں نے کہا "آپ کے لیے سیڑھیاں چڑھنا مناسب نہیں چڑھائی چڑھنے کی بات ہی نہیں "۔

ڈاکٹر علی محمد جان سے مشورہ لینے کے بعد شیخ صاحب نے مجھ سے کہا۔

" ہم نے غلطی کی جو ان سے مشورہ کر لیا۔ یہ لوگ شاید مجھے اپنے گناہوں کا کفارہ کرنے نہیں دیں گے ــــ چنانچہ ہمارے درمیان یہ فیصلہ ہوا کہ اگلے چند ایک روز کے بعد کسی سے کہے پوچھے بغیر ہم شام ڈھلتے ہی رامچند کاک سے ملاقات کے لیے جائیں گے۔ ہم نے ہارون تک ایک دوسری کار کا بھی بندوبست کیا۔ اتفاق سے جس روز شیخ صاحب کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی۔

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اسی دوران سرینگر آنے کا پروگرام بنایا اس کی وجہ سے رامچند کاک کے پاس جانا ملتوی کیا گیا ــــ، اس کے بعد کیا ہوا، مجھے معلوم نہیں !"

"اس کے بعد کیا ہوا، یہ جاننے کی اب ضرورت بھی نہیں"۔ میں نے ٹینگ صاحب سے کہا۔ "کیونکہ آپ کے اتنا بتانے سے رامچند کاک کے بیان کی تصدیق ہو گئی "۔

شیخ عبداللہ کے رحلت فرمانے کے بعد جب ان کی سوانح حیات "آتشِ چنار" منظر

عام پر آئی تو میں نے اس کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا لیکن اس میں رامچند کاک سے معافی مانگ کر اپنے کیے ہوئے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ اُلٹا جس روپ میں رامچند کاک اور مہاراجہ ہری سنگھ کو پیش کیا گیا وہ واقعی گھناؤنا روپ تھا۔ میں نے اس بارے میں محمد یوسف ٹینگ سے پوچھا تو انھوں نے بتایا۔

"اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جو مجھے پوشیدہ رکھنے کو کہا گیا، لیکن آپ اطمینان رکھیے یہ راز کشمیری قوم کی طرف سے میرے پاس امانت ہیں، میں اس میں کسی بھی طرح بے ایمانی نہیں کروں گا۔ وقت آنے پر یہ سارے سربستہ راز کتابی صورت میں عوام کے سامنے لاؤں گا۔ اس کتاب کا نام "منظر اور پس منظر" ہوگا۔

ٹینگ صاحب کی اس یقین دہانی پر میں مطمئن ہوا اور اب اُس روز کا انتظار کر رہا ہوں، جس روز یہ سربستہ راز آشکارا ہو جائیں گے؟

"آتشِ چنار" میں رام چند کاک کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اور دوسروں کی طرح جس طرح انہیں ذلیل کر کے چھوڑا گیا ہے اس کی حقیقت ماند پڑجاتی ہے جب کہ وہ ان سے معافی مانگنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

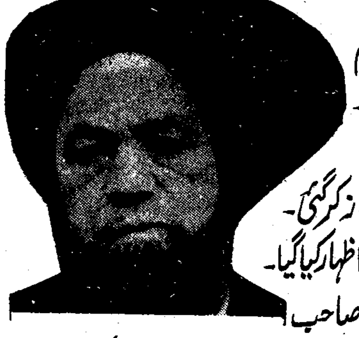
یہ دوسری بات ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے اس گوجر کی مثال قائم کی جس نے درخت سے واپس صحیح سلامت اترنے کے لیے خدا کے حضور میں پہلے بھینس، پھر بھیڑ، پھر مرغا اور پھر انڈا نذر و نیاز کرنے کی منت مانی اور جب وہ آہستہ آہستہ نیچے اُتر آیا تو بڑی ڈھٹائی سے بولا۔

"میں تو خود ہی درخت پر چڑھا اور خود ہی اُتر آیا، خیرات کروں تو کیوں۔؟"

قوم کا آدھی صدی کا پاسباں
قوم کو تڑپا چلا ہے "آں جہاں"

شیخ محمد عبداللہ کی رحلت اور ایک دور کا اختتام

جولائی ۱۹۸۲ء میں شیخ عبداللہ کو دل کا دورہ پڑا۔ اگرچہ یہ شدید نوعیت کا دورہ نہ تھا البتہ اس سے انھیں ایسا جھٹکا لگا کہ انھیں آخرت یاد آگئی۔ اس یاد نے انھیں وہ کام بھی یاد دلائے جو وہ اپنی زندگی میں مکمل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے لگ بھگ ساری ذمہ داریاں اپنے فرزند فاروق عبداللہ کو سونپ دیں۔



۳۰ اگست ۱۹۸۲ء کو شیعہ فرقے کے پیشوا بڈگام کے آغا سید یوسف الموسوی الصفوی انتقال کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون!

اُن کی روح صبح سویرے قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی وادی بھر میں رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ ریڈیو کشمیر سرینگر نے صبح کی مجلس میں جب آغا صاحب بڈگام کے انتقال کی خبر نشر کی تو وادی بھر میں اُن کے عقیدت مند ششدر ہو کر رہ گئے اور اپنی تمام مصروفیات منسوخ کر کے بڈگام جانے لگے۔

آغا سید یوسف الموسوی الصفوی اگرچہ شیعوں کے عظیم رہنما تھے لیکن تمام فرقوں کے لوگ ان کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ریاست کے تمام سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کے علاوہ دیگر برگزیدہ اشخاص نے آغا صاحب کی موت پر گہرے صدمے، دکھ اور افسوس کا اظہار کیا اور وزیر اعلیٰ نے بسترِ علالت سے آغا صاحب کی وفات پر اپنے بیان میں فرمایا:

محترم آغا صاحب بڈگام اور سید یوسف الموسوی الصفوی کی وفات کے

بارے میں سن کر مجھے بے انتہا دکھ پہنچا ہے۔ محترم آغا صاحب میرے دیرینہ رفیقوں میں سے تھے۔ تحریک حریت کے ساتھ اُن کا انتہائی قریبی تعلق رہا ہے اور ایک برگزیدہ روحانی شخصیت کے طور پر عوامی حلقے ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اُنھوں نے ہمیشہ اتحاد، مفاہمت، نظم و ضبط، توازن اور اعتدال کی قدروں کو فروغ دینے کے لئے اپنی بہترین کوششیں وقف کیں۔ اُن کی وفات سے اہلِ کشمیر ایک عظیم روحانی بزرگ اور قومی رہنما سے محروم ہو گئے ہیں۔"

آغا صاحب بڈگام یوں تو ہمیشہ سیاست سے دور رہے ہیں۔ البتہ کشمیر کی سیاسی تحریک میں اُنھوں نے ہمیشہ شیخ محمد عبداللہ کے رول کی تائید کی، جب بھی شیخ عبداللہ وزارت سے باہر یا وزارت میں کسی مشکل میں پڑے تو آغا صاحب نے ان کی حمایت کی، ہر الیکشن کے موقع پر اُنھوں نے شیخ عبداللہ کا ساتھ دیا۔ خود شیخ صاحب بھی نازک موقعوں پر اُن سے مشورہ لیتے تھے۔ ویسے آغا صاحب مشورہ دینے کے معاملے میں بغیر کسی امتیاز کے ایک انجمن تھے۔ وہ بیک وقت مذہبی پیشوا، پرہیزگار، عالم اور ایک قابل و فاضل جج بھی تھے۔

بڈگام میں اُن کی عدالت کافی عزّت و توقیر کی حامل تھی۔ مختلف نوعیت کے تنازعوں کے بارے میں ان کے فیصلے ناقابلِ تردید حد تک بڑے مدلّل ہوا کرتے تھے اور ان کے فیصلے کسی بھی صورت میں چیلنج نہیں کئے جا سکتے تھے۔

مذہبی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے یکجہتی اور یگانگت کا جو درس دیا اُسے کبھی بھلایا نہیں جا سکے گا۔

آغا صاحب کے اوصاف نے وادی بھر میں اپنا سکّہ بٹھایا تھا۔ اس کی وجہ سے اُن کے جنازے میں بے شمار لوگوں نے شمولیت کی، جنازے میں شامل مرد اور خواتین، بوڑھوں اور بچوں نے اشکبار آنکھوں سے اُنھیں رُخصت کیا۔

یکم ستمبر کو شیخ عبداللہ کی طبیعت اور بگڑ گئی تو ۲ ستمبر کو ایک ڈاکٹری ٹیم نے ان کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹروں نے شیخ صاحب کو مکمل آرام کا مشورہ دیا اور محکمۂ اطلاعات کی طرف سے ان کی صحت کے بارے میں میڈیکل بُلیٹن جاری ہونا شروع ہو گیا۔

شیخ صاحب کے بارے میں آئے دن جو افواہیں گشت کر رہی تھیں ان افواہوں کو مدِ نظر رکھ کر ہی یہ بُلیٹن جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۵ ستمبر کو شیخ عبداللہ کی صحت اس وقت تشویشناک صورت اختیار کر گئی جب اُنھیں دل کا ایک اور دورہ پڑا۔ ان کی اچانک اس ناسازئ طبیعت کی خبریں نشر ہونے لگیں تو وادی کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک لوگوں میں تشویش کی لہر سی دوڑ گئی۔

میڈیکل بلٹن کی جو رپورٹ عوام کے لئے جاری کی گئی۔ وہ اس سے بالکل مختلف تھی۔ جو گورنر بی۔ کے۔ نہرو کو پہنچا دی گئی۔ گورنر بی۔ کے۔ نہرو نے اسی وقت وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو فون پر شیخ عبداللہ کی تشویشناک صورتِ حال سے روشناس کرایا۔ چنانچہ مسز اندرا گاندھی نے سرینگر آنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ جیتے جی اُن کی عیادت کر لیں۔

سرینگر میں شیخ صاحب کے بارے میں گمبھیر افواہ پھیل گئی تو ہر چہار طرف سے اُن کی کوٹھی کی طرف آنے والے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ کئی عقیدتمند مرد اور خواتین جب کوٹھی کے باہر زار و قطار رونے لگے تو شیخ صاحب کے کانوں تک یہ آوازیں پہنچ گئیں۔ اُنھوں نے نحیف آواز میں جب پوچھا کہ یہ کیسی آوازیں ہیں۔ تو انھیں بتایا گیا کہ آپ کے عقیدتمند باہر گیٹ پر آپ کی صحت کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں اور وہ گریہ و زاری کر رہے ہیں۔

شیخ صاحب نے اپنے آپ کو ذرا سنبھال کر عیادت میں آئی ہوئی چند شخصیات اور ڈاکٹروں کی موجودگی میں اپنی فیملی کو بتایا:

" یہ وہی لوگ ہوں گے جن کے لئے میں نے کچھ بھی نہیں کیا، مجھے اس بات کا بہت دُکھ اور افسوس ہے کہ میں کشمیر کے غریب اور نادار لوگوں کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اب شاید میں اِن کے لئے کچھ کر بھی نہیں سکوں گا۔ یہ لوگ اب یتیم ہو جائیں گے۔ ہاں! اگر میں زندہ رہا تو میں اُن کے لئے ویسی ہی تحریک شروع کروں گا۔ جیسی میں نے ۱۹۳۱ء میں کی تھی ...."

شیخ صاحب کی زبان سے نکلی ہوئی یہ چند باتیں جس میں اُنھوں نے بہت کچھ کہہ اپنی پالیسی واضح کر دی۔ ابھی کوٹھی سے باہر بھی جانے نہیں پائی تھی کہ دہلی میں وزیر اعظم اندرا گاندھی تک پہنچ گئیں۔ مرکزی لابی کو تشویش لاحق ہو گئی کہ اس موقع پر شیخ صاحب ایسی وصیت کر نہ بیٹھیں جو ان کے کئے کرائے پر پانی پھیر دے۔ چنانچہ اُنھوں نے فوراً شیر کشمیر کے اردگرد ایک حصار بنا لیا۔ تاکہ اُن کی اس وقت کی کوئی بات باہر نکلنے نہ پائے۔

شیخ صاحب کی نگرانی آل انڈیا میڈیکل انسٹیچیوٹ کے ڈاکٹر ایم۔ ایل۔ بھاٹیہ کر رہے

تھے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر علی محمد جان، ڈاکٹر غلام قادر علاقہ بند اور ڈاکٹر جلال الدین تھے۔

۶ ستمبر کو صبح سویرے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی شیخ صاحب کی مزاج پرسی کے لئے آگئیں۔ اُن کے ہمراہ جی پارتھا سارتھی، مسٹر الیگزینڈر اور پولٹیکل سیکریٹری مکھن لال فوطیدار بھی تھے۔

ہوائی اڈے پر گورنر بی۔ کے۔ نہرو، ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور کابینہ کے وزراء نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ ہوائی اڈے سے مسز اندرا گاندھی ہیلی کاپٹر کے ذریعے بادامی باغ چھاؤنی گئیں جہاں سے موٹر کار میں وہ وزیر اعلیٰ کی کوٹھی پر گئیں۔

شیخ صاحب کی عیادت کرتے جب مسز اندرا گاندھی کمرے میں بیڈ کے پاس پہنچ گئیں تو اس وقت شیخ صاحب اپنے ہوش وحواس میں نہ تھے۔ تھوڑی دیر تک یہاں رُکنے کے بعد مسز اندرا گاندھی دوسرے کمرے میں شیخ صاحب کی فیملی کے ساتھ بات چیت کرنے لگیں۔ انھوں نے علیحدہ طور پر ڈاکٹروں کے ساتھ گفتگو کی اور شیخ صاحب کے بارے میں اُن کی رائے دریافت کی، جب ڈاکٹروں نے انھیں چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تو وہ واپس گیسٹ ہاؤس آگئیں یہاں پر انھوں نے بی۔ کے نہرو، فوج کے سربراہ لفٹننٹ جنرل راوتھ، شمالی کمانڈ کے جنرل ملہوترہ سے تبادلہ خیال کیا۔

دوسری میٹنگ میں انھوں نے گورنر کی موجودگی میں کانگریس کے چیدہ چیدہ عہدیداروں کے ساتھ مشورہ کیا۔ مسز اندرا گاندھی کی رائے یہ تھی کہ چونکہ شیخ صاحب جا رہے ہیں۔ لہٰذا اس موقعہ پر یہی مناسب رہے گا کہ اُن کے بیٹے کو وزیر اعلیٰ کا حلف دلا یا جائے۔ بی۔ کے۔ نہرو نے تجویز کی حمایت کی لیکن کانگریس کے مقامی رہنماؤں نے فاروق عبداللہ کو وزیر اعلیٰ بنانے کے بجائے ریاست میں کچھ مدت تک گورنر راج نافذ کرنے کا مشورہ دیا تاکہ آئندہ انتخابات گورنر کی تحویل میں ہو سکیں۔ لیکن اس نازک موقعہ پر مسز اندرا گاندھی نے ان کا یہ مشورہ قبول نہیں کیا اور اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ میرے والد پنڈت جواہر لال نہرو نے مجھ سے کہا ہے۔ شیخ عبداللہ کا کوڈ نام ہم نے مچھلی رکھا ہے۔ کیونکہ ایک مچھلی جس طرح بنا پانی کے زندہ نہیں سکتی۔ اسی طرح یہ لوگ بھی اقتدار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، اس کا بیٹا بھی نہیں رہ سکتا، قبل اس کے کہ فاروق پانی کے بغیر اُچھلنے کودتے یہاں کے حالات خراب کردیں اور ساتھ میں ہمیں بھی پریشان کریں۔ بہتر ہے کہ انھیں پانی میں ہی رکھا جائے۔

۷ ستمبر کو شیخ صاحب کی تشویشناک حالت کے پیش نظر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات ی کی گئیں۔ ان کی صحت یابی کے لئے جگہ جگہ دُعائیں مانگی گئیں۔ آستانوں پر نیاز چڑھائی ے لگیں۔ مسجدوں میں دُعائیہ مجلسوں کا انعقاد کیا گیا، لوگ ہجوم در ہجوم شیخ صاحب کی خیریت یافت کرنے ان کی قیام گاہ پر آنے لگے۔ شہر میں کئی جگہوں پر نذر و نیاز اور جانوروں کی انی کا سلسلہ جاری رہا۔ شادی بیاہ کی تقریبات شہر بھر میں ملتوی کی گئیں۔

۷ ستمبر کو دہلی سے ڈاکٹروں کی ایک اور ٹیم ڈاکٹر خلیل اللہ کی سرکردگی میں بذریعہ طیارہ یہاں گئی۔ ڈاکٹروں کی اس ٹیم کے ساتھ گورنر بی۔ کے۔ نہرو دوبارہ شیخ صاحب کی عیادت کو آگئے۔ ان دوران مسز اندرا گاندھی بڈگام تشریف لے گئیں جہاں انھوں نے آغا صاحب کے سوگوار ندان سے تعزیت پرسی کی۔

اس روز شام کے قریب جب شیخ صاحب کی تشویشناک حالت کا بلٹن جاری کیا گیا۔ تو نہ کے ارکان، اسمبلی اور کونسل کے ممبران کے ساتھ نیشنل کانفرنس کے بیشتر عہدیدار اجتماعی پر شیخ صاحب کی عیادت کو آئے مگر کسی ایک کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ روں کے ساتھ شیخ صاحب کے گھریلو افراد کے سوا اور کوئی ان کے پاس جا نہیں سکتا تھا۔

ڈاکٹروں کی انتہائی کوششوں، امریکہ اور انگلینڈ سے کئی اہم ادویات منگوانے کے باوجود محمد عبداللہ ۸ ستمبر کی شام کو اس دُنیا سے رحلت کر گئے۔ 'انا للہ وانا الیہ راجعون'۔

اس طرح ان کی انقلاب انگیز اور تاریخ ساز زندگی کا سفر تمام ہوا اور کشمیری عوام کا زترین رہنما حقیقت سے جا ملا۔ پورا کشمیر غمگسار اور ماتم کدہ بن گیا۔ ساری قوم اس سانحہ وتے لگی۔

شیخ صاحب پورے تین ماہ علیل رہے۔ ماہ جون میں ضلع ڈوڈہ کے دورے سے واپس ہی اُن کی طبیعت ناساز ہوگئی، انھیں تمام امکانی سہولتیں فراہم کی گئیں لیکن وہ جو کہتے موت اٹل حقیقت ہے'۔ شیخ صاحب بھی اسی حقیقت سے جا ملے۔

ان کی موت کی اطلاع ملتے ہی پوری ریاست میں گیارہ دن کا سوگ منانے کا اعلان یا۔ ریاست میں سرکاری و نیم سرکاری دفاتر، اسکول کالج، یونیورسٹی کے ساتھ فیکٹریاں کارخانے تین دنوں تک بند رہنے کا اعلان کیا گیا۔ سرکاری عمارتوں پر قومی اور ریاستی ے سرنگوں کئے گئے۔

شیخ صاحب کا جسدِ خاکی پہلے مرحلے میں وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ کے تفریباتی ہال میں رکھا گیا۔ ان کی رہائش گاہ کے باہر لوگوں کی بھاری تعداد رات بھر جاگتی رہی۔

پیر کے روز صبح سویرے اُنھیں پولو گراونڈ میں عوام کے درشن کے لئے پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ رکھ دیا گیا۔

اُن کے بڑے داماد غلام محمد شاہ کو اُن کی تجہیز و تدفین کے دوران دور دور رکھا گیا اور اُن کی تجویز کہ میت پر سبز کلمانی پرچم رکھ دیا جائے۔ نامنظور کر کے انھیں قومی پرچم میں رکھا گیا فوج کی تینوں شاخوں کی طرف سے اُن کے جسدِ خاکی کی نگرانی کے لئے رکھا گیا۔ اُن کے آخری درشن کے لئے لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔

لوگ اپنے نصف صدی کے رہنما کے آخری درشن کے لئے پولو گراونڈ کی طرف اُمڈ رہے تھے۔ شیخ صاحب کے رحلت فرمانے کی خبر نشر ہوتے ہی مُلک اور مُلک سے باہر لیڈروں، برگزیدہ ہستیوں، دانشوروں اور علماء وغیرہ کی طرف سے تعزیتی پیغامات آنے شروع ہو گئے۔

شیخ صاحب کی رحلت پر ان کے فرزند اور جانشین ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو مختصر اور سادہ تقریب میں وزیر اعلیٰ کا حلف دلایا گیا۔ اس موقعہ پر کابینہ کے وزراء، اسمبلی اور کونسل کے ممبران اور بعض سرکاری عہدیدار بھی موجود تھے۔

۸ ستمبر کو صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ سرینگر تشریف لائے۔ انھوں نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

صدرِ مملکت کے علاوہ ملک کے سرکردہ سیاسی رہنماؤں کی طرف انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ ان کی طرف سے کشمیر اپنے رہنما اور مُلک ایک عظیم مجاہد سے محروم ہونے کا برملا اظہار کیا گیا۔

شیخ صاحب کی رحلت پر صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے ریاستی گورنر کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں کہا۔

"مُلک ایک انتہائی قابلِ قدر اور آہنی عزم کے رہنما سے محروم ہو گیا۔"

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے شیخ صاحب کو خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا:

"وہ جموں و کشمیر کے بابائے قوم اور مُلک کے ممتاز رہنما تھے۔ اُن کی رحلت

سے ایک عظیم ہندوستانی ہم سے بچھڑ گیا۔ آپ کشمیر کی خوبصورت وادی کی سیاست پر نصف صدی تک چھائے رہے۔ انھوں نے کئی مرتبہ موت کو شکست دی اور اب موت نے اُن کو ہم سے چھین لیا۔"

نائب صدر مسٹر ہدایت اللہ نے اپنے پیغام میں کہا۔

"شیخ صاحب کے انتقال سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جسے پُر کرنا ناممکن ہے۔"

شیخ محمد عبداللہ کی رحلت پر مختلف ریاستوں کے وزراء اعلیٰ اور دوسرے وزیروں اور اپوزیشن کے تمام لیڈروں نے افسوس کا اظہار کیا۔

گورنر بی کے۔ نہرو نے اپنے پیغام میں کہا۔

"شیرِ کشمیر کی موت سے ایک تاریخی دور ختم ہوا اور اُن کے انتقال سے ایک خلیج پیدا ہوئی ہے۔ جسے پُر کرنا نہایت ہی مشکل ہے۔ شیخ صاحب کی زندگی بڑے آدرشوں کی تھی۔"

جمعہ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۲ء کو صبح سویرے پولو گراونڈ میں شیخ عبداللہ کا جنازہ ایک توپ گاڑی پر رکھ دیا گیا۔ جنازہ کا جلوس ڈلگیٹ کے راستے حضرت بل کی طرف روانہ ہوا۔ ت کو سہ رنگے ہندوستانی پرچم میں لپیٹا گیا تھا۔ پولو گراونڈ سے حضرت بل تک ۱۴ کلو لمبے راستے پر کشمیری عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ جس سمندر میں جنازہ ایک ناؤ سا لگ رہا تھا۔ مردوں اور عورتوں میں مسلمانوں کے دونوں فرقے شیعہ اور سنی سینہ بی کر رہے تھے۔ ماتمی مظاہرین میں مرحوم کے حق میں نعرے بلند ہو رہے تھے اور ان کی ریف میں عقیدت و عظمت کے گیت گائے جا رہے تھے۔ یقیناً یہ ہمارے عہد کا ایک یم جنازہ تھا جس کو کشمیر کی موجودہ نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

جنازے کی توپ گاڑی پر وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ سوار تھے اور توپ گاڑی کے ے فوج اور پولیس کے دستے جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔

شیخ صاحب کے اہلِ خانہ مسز اندرا گاندھی کو لے کر دریائی راستے سے حضرت بل ہ ہوئے۔ اُن کے ساتھ دوسرے شکاروں میں مسٹر اٹل بہاری باجپائی، مسٹر چندر شیکھر وتی نندن بہوگنا، چندر جیت یادو، مسٹر چتا باسو، جارج فرنانڈیز، ستیہ نرائن ریڈی وک سبھا کے اسپیکر بلرام جاکھڑ بھی تھے۔ ان کے علاوہ وزیر داخلہ مسٹر سیٹھی، وزیر قانون

مسٹر کوشل، مسٹر خورشید عالم خاں، مسٹر جعفر شریف، غلام نبی آزاد اور عارف محمد خاں شامل تھے۔

سابقہ گورنر ایل۔ کے۔ جھا۔ پنجاب کے گورنر جنا ریڈی۔ ہماچل کے وزیر خزانہ کیول کرشن، راجستھان کے وزیر اعلیٰ شیو چرن ماتھر اور ہریانہ کے وزیر اعلیٰ بھجن لال وغیرہ شامل تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ لوگ جنازے میں شامل تھے لیکن ایک ہزار سے زائد لوگ نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

جنازے کے سفر کا یہ واقعہ جمعہ کے روز پیش آیا۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے روزِ جمعہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس روز مسلمان اسلام کی پیروی میں نمازِ جمعہ ادا کر کے فرض اور سنّت ادا کرتے ہیں۔ نمازِ جمعہ تمام دنیاوی اور دنیوی کاروبار پر مقدم ہے اور وہ صرف جماعت کے ساتھ، جمعہ کی دو رکعتوں کا یہ حال ہے کہ جس سے یہ چھوٹ جائے وہ اُسے قضا کی شکل میں ادا نہیں کر سکتا، حالات گواہ ہیں کہ اس روز بیشتر مسلمان سرینگر میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی سے محروم رہ گئے۔ چنانچہ اس طرح کشمیر کی تاریخ میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے بعض افسوسناک واقعات میں یہ واقعہ بھی غیر معمولی طور پر شامل ہوگیا۔

مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے جانشین اور ان کے لئے تجہیز و تدفین کے منتظمین نے جنازہ کے جلوس کا پروگرام نمازِ جمعہ کی روشنی میں تشکیل دینے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس طرح اُنھوں نے ایک بہت بڑے گناہ کی رہنمائی کی، وہ لوگ بھی اس کے برابر کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے جگہ جگہ اذان سُن کر بھی نمازِ جمعہ میں شرکت نہیں کی۔

جنازہ شام کے چھ بجے کے قریب حضرت بل پہنچا۔ یہاں آثار شریف کے سامنے میوہ باغ میں آثار شریف کی مسجد کے امام نے نماز جنازہ پڑھائی جن سرکردہ لیڈروں نے اس نماز میں شرکت کی ان میں اور لوگوں کے علاوہ مولانا مسعودی، مولوی محمد فاروق، سید علی شاہ گیلانی اور عبدالغنی لون بھی شامل تھے۔ یہاں سے جنازہ ان کی آخری آرام گاہ لیجایا گیا۔ شام ڈھلے کے ساتھ شیخ عبداللہ کو سپردِ خاک کیا گیا تو ان کی قبر پر ایک ایک مٹھی خاک ڈالنے والوں میں مرکزی کابینہ کے وزرائ اپوزیشن کے لیڈر اور دیگر ریاستوں کے بعض وزرائے اعلیٰ اور مسز اندرا گاندھی شامل تھیں۔

جنازہ کے پولو گراونڈ سرینگر سے روانگی سے لیکر حضرت بل کے مزار میں دفنانے تک کی تمام کارروائی کی کمنٹری نہ صرف ریڈیو سے نشر ہو رہی تھی بلکہ یہ سارا منظر ٹیلی کاسٹ بھی ہو رہا تھا۔

۱۲ ستمبر کو شیخ محمد عبداللہ کی شخصیت کو خراجِ عقیدت ادا کرنے کے لئے اقبال پارک سرینگر میں کُل جماعتی جلسہ ہوا جس میں حکمراں نیشنل کانفرنس کے علاوہ جماعتِ اسلامی، پیوپلز کانفرنس، عوامی ایکشن کمیٹی، محاذِ آزادی کے لیڈر اور عہدیدار بھی شامل ہو گئے۔ وادی کے حکمران اور اپوزیشن کے لیڈروں نے جلسے سے خطاب کیا اور مرحوم شیخ محمد عبداللہ کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنی جذباتی تقریر کے اختتام پر اس بات کا انکشاف کیا کہ آنے والے جمعہ کو حضرت بل کے مزار پر مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی فاتحہ خوانی کے بعد مرحوم کی وصیت عوام کے لئے جاری کر دی جائے گی (اس وقت تک اس وصیت کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔)

اتفاق کی بات ہے جس وقت فاروق عبداللہ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی وصیت کا انکشاف کر رہے تھے۔ اُس وقت شیخ نذیر احمد محمد یوسف ٹینگ سے مشورہ کر رہے تھے۔ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی وصیت کیسی ہونی چاہیئے اور اس میں کیا کیا باتیں آپ درج کریں گے۔

جمعہ کے روز نسیم باغ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد عوام کے لئے مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی جو وصیت اجراء کی گئی، وہ ہرگز شیخ محمد عبداللہ کی وصیت نہیں تھی۔ شیخ صاحب نے کوئی وصیت نہیں کی ہے۔ ان کی اگر کوئی وصیت ہے تو وہ آخری چند الفاظ جو انھوں نے بسترِ علالت پر اس وقت دہرائے جب اُن کے کانوں میں غریب لوگوں کے رونے کی آواز آئی تھی۔

شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے محمد یوسف ٹینگ سے لکھائی گئی وصیت سے بیگم عبداللہ، ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور شیخ نذیر احمد کے سوا اور کوئی واقف نہیں ہے۔

اس طرح شیخ صاحب کے جاتے جاتے بھی اُن کی فیملی کی طرف سے عوام کے ساتھ جو فراڈ کھیلا گیا وہ ایسی دیگر مثالوں کی طرح اپنی ایک اور مثال ہے۔ ٹینگ صاحب اس راز کے امانتدار ہیں۔

اس طرح مثالوں سے بھری یہ تاریخی داستان یہیں پر بس ختم کی جا رہی ہے۔

اختتام۔

لہو کے پھول سجا تا رہا کتابوں میں
میں اپنے عہدِ شکستہ کا ترجمان رہا



شیخ محمد عبداللہ

سارا دھن دولت اور ساری جائیداد یہیں چھوڑ کر خالی ہاتھ اس دنیا سے جا رہے ہیں



شیخ عبداللہ کی آخری آرامگاہ

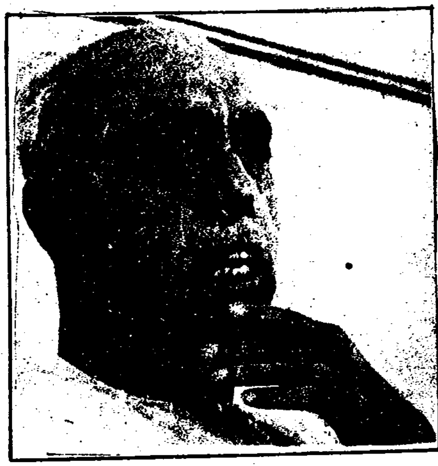
اپنی وفات سے قبل مدفن کی جگہ کا
معائنہ کر رہے ہیں



چھوڑ جاؤں گا میں اس دنیا میں کچھ ایسے نقوش
ذکر آئے گا میرے بعد بھی اکثر مرا

برصغیر ہندوپاک کو شیخ محمد عبداللہ کی دین

پاکستان کے جنم کے ساتھ ہی شاید قدرت نے اس ملک کی سالمیت توڑنے کی قوت شیخ عبداللہ کے ہاتھ لکھ دی تھی ـــــــ یہ تو قانونِ قدرت ہے ایک ہاتھ اگر کوئی پودا لگاتا ہے تو دوسرا ہاتھ اس پودے کو درخت کے روپ میں کاٹتا بھی ہے دونوں ہاتھوں میں قدرت کی بنائی ہوئی لکریں ہوتی ہیں۔



برِّصغیر کی تقسیم پر ہندوستان کی تمام ریاستوں اور صوبوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ اکثریت کے ناطے ہندوستان کے ساتھ رہ سکتے ہیں یا پاکستان میں شامل ہو سکتے ہیں حیدرآباد، جوناگڑھ اور کشمیر کو علیحدہ رکھ دیا گیا۔ ایسا کیوں کیا گیا ـــــــ؟ یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ تقسیم کے موقعہ پر تین ایسی ریاستوں کو علیحدہ رکھ دیا گیا جن میں یا تو مسلمان اکثریت میں تھے نہیں تو مسلمان سربراہ راج کرتے تھے۔

مسلم اکثریت والی ہماری اس ریاست کو تقسیم کے دوران علیحدہ رکھنے میں لارڈ مونٹ بیٹن پنڈت جواہر لال نہرو اور شیخ عبداللہ کا جو رول رہا ہے اس کے پہلے ابواب میں تفصیلی وضاحت کی جا چکی ہے۔ برِّصغیر کی تقسیم سے بہت پہلے کشمیر کو بھارت کا حصہ بنانے کی

کاروائی پہلے ہی واضح کر دی گئی ہے۔

جس وقت برِ صغیر تقسیم ہوا اس وقت لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بعد مہاتما گاندھی بھی یہاں تشریف لائے اور مہاراجہ ہری سنگھ کو بھارت کے ساتھ الحاق کرنے کے لیے مجبور کرنے لگے۔ چونکہ مہاراجہ نے ریاست کو آزاد اور خود مختار رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا لہٰذا وہ ان کے دباؤ میں نہیں آسکے۔ شیخ محمد عبداللہ ان دنوں "کشمیر چھوڑو" کے نعرے کی پاداش میں بھدرواہ کی جیل میں نظر بند تھے۔ جب ان تک یہ بات پہنچادی گئی کہ مہاراجہ ریاست کو آزاد اور خود مختار رکھنا چاہتے ہیں تو انھوں نے جیل سے مہاراجہ کے نام خط لکھ کر انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا، چونکہ شیخ عبداللہ کو عوام کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور مہاراجہ "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک میں الجھ گیا تھا انھوں نے ریاست کو "آزاد اور خود مختار" رکھنے کا فیصلہ ملتوی رکھ دیا تاکہ شیخ عبداللہ عوام کے بل بوتے پر کوئی نیا فتنہ نہ جگائیں۔ بعد کے حالات نے مہاراجہ ہری سنگھ کا یہ خواب چکنا چور کر دیا۔

صاف ظاہر ہے کہ اگر شیخ محمد عبداللہ نے یہاں جنم نہیں لیا ہوتا یا وہ میدانِ سیاست میں نہیں اُتر آئے ہوتے اور ان کو عوام کی بھرپور حمایت نہیں حاصل ہوتی تو کشمیر ملک کی تقسیم کے دوران یا تو پاکستان میں شامل ہو گیا ہوتا نہیں تو یہ آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر قائم ہوا ہوتا۔ مہاراجہ کا یہ فیصلہ غلط ہوتا یا صحیح لیکن مہاراجہ ہری سنگھ ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کا اعتراف لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ٹرانسفر آف پاور جلد ۹ میں خود کیا ہے۔ ان حالات کو مدِ نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر شیخ محمد عبداللہ کشمیری عوام کے رہنما نہیں ہوتے تو تقسیم کے موقعہ پر کشمیر کو علیحدہ نہیں رکھا جاتا بلکہ یہ اسی دوران اِدھر یا اُدھر ہو گیا ہوتا۔

چونکہ کشمیر کے بارے میں شیخ عبداللہ کی پنڈت نہرو کے ساتھ ساز باز تھی عہد و پیمان تھا۔ لہٰذا تقسیم کے موقعہ پر بھارتی رہنما شیخ عبداللہ کی غیر موجودگی کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، راج گوپال آچار یہ حتٰی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی اس کوشش میں لگے تھے کہ شیخ عبداللہ رہا ہو جائیں تاکہ اس نازک موقعہ پر وہ ہمارے کام آسکیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ پر کافی دباؤ ڈالا گیا۔ تاکہ وہ شیخ عبداللہ کو رہا کر دیں۔ چونکہ وہ عدالت کے فیصلے کے تحت باضابطہ سزا

کاٹ رہے تھے لہٰذا مہاراجہ اُن کی رہائی پر آمادہ نہ ہو سکے۔ آخر مہاتما گاندھی کی ذاتی مداخلت سے ایک صورت یہ نکل آئی کہ شیخ عبداللہ معافی نامہ پیش کریں گے۔ اور رہائی کے بعد مہاراجہ حسب وعدہ انھیں اپنی وزارت میں لے لیں گے جیسا کہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے "کوئیٹ کشمیر کی تحریک دراصل مہاراجہ سے کشمیر چھڑانے کے لیے نہیں بلکہ اس کی آڑ میں شیخ عبداللہ کو وزارت میں لیے جانے کی تحریک تھی۔ شیخ عبداللہ مہاراجہ سے وزیر اعظم کا عہدہ مانگ رہے تھے جبکہ وہ انھیں ڈپٹی وزیر اعظم کا عہدہ دے رہے تھے۔ جھگڑا اصل میں اسی بات کا تھا۔ اس کی تصدیق راج گوپال آچاریہ نے کی ہے بھارتی رہنما جلد از جلد شیخ عبداللہ کی رہائی کے لیے تگ و دو کر رہے تھے تاکہ مہاراجہ ہری سنگھ آزادی کا اعلان کر کے ان کے کئے کرائے پر پانی نہ پھیر دیں۔

شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کے ساتھ ہی کشمیر کے تنازعہ نے جنم لیا اور اس تنازعہ نے بھارت اور پاکستان کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ــــــ" بڑھتے بڑھتے اس دشمنی نے دونوں کو ہتھیاروں کی دوڑ میں لگا دیا۔ اس کی وجہ سے یہ دونوں ممالک غربت پسماندگی اور کمزوری کے دائرے میں قید ہو کر رہ گئے۔ اگر کشمیر کی وجہ سے ان دونوں میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا جنون پیدا نہ ہوا ہوتا تو دونوں آج ترقی اور خوشحالی کے آسمان کو چھو رہے ہوتے۔ دونوں ممالک بیرونی امداد کے دستِ نگر نہیں ہوتے۔ تنازعہ کشمیر نے ان دونوں کو نہ صرف ایک دوسرے سے دور کر دیا بلکہ دونوں ایک دوسرے کو کمزور کرنے کے اسباب مہیا کرنے لگے۔ اور اس دوڑ نے دونوں کو بہت ساری دشواریوں مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔

یہ تنازعہ کشمیر ہی ہے جس نے پاکستان کے دو ٹکڑے کرائے جس نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی پر چڑھایا جس نے سعودی عرب کے شاہ فیصل کو گولی کا نشانہ بنایا جس نے شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے خاندان کو ٹینکوں سے اڑا دیا مسز اندرا گاندھی کو اپنے باڈی گارڈوں کے ہاتھوں قتل کروایا جنرل ضیاالحق کو اپنے دیگر فوجی جنرلوں کے ساتھ کی سازش کا شکار بنا دیا۔ اور یہ تنازعہ کشمیر ہی ہے جس نے ہندوستان میں "خالصتان" کا ناسور بھر دیا۔

بعض لوگ شاید میری رائے کے ساتھ اتفاق نہیں کریں گے اور سوچنے لگیں گے کہ

شبنم قیوم یہ کونسی دور کی کوڑی لایا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تنازعہ کشمیر اصل میں شیخ عبداللہ کا کھڑا کیا ہوا ہے جس نے برِّ صغیر کی تقسیم سے قبل جواہرلال نہرو سے اس بارے میں ساز باز کی تھی۔ شیخ عبداللہ ایسا نہ کرتے تو کشمیر کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا پنڈت نہرو کو اس بارے میں لارڈ مونٹ بیٹن کو اپنا ہم خیال نہ بنانا پڑتا لارڈ مونٹ بیٹن، پنڈت نہرو کی دوستی کے خاطر کشمیر کو تقسیم کے دوران علیحدہ نہ رکھتے اور نہ ہی وزن شعر کے لیے حیدرآباد کو اسی زمرے میں رکھا جاتا۔ کشمیر کا تنازعہ پاکستان کے لیے وقار کا مسئلہ بن گیا اور اس وقار کو بحال کرنے کے لیے اسے تخریب کاری کرنا پڑی میدانِ جنگ میں اترنا پڑا یہ دوسری بات ہے کہ اس تخریک کاری اور ان جنگوں میں اسے جیت کے بجائے ہار کا منہ دیکھنا پڑا یہ بھی درست ہے کہ اس کی وجہ سے پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر بھارت اگرتلا سازش کیس میں شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ تعاون نہیں کرتا اور انھیں اپنا بھرپور ساتھ نہیں دیتا تو بنگلہ دیش ایک علیحدہ ملک کی صورت میں وجود میں نہیں آسکتا بھارت نے بنگلہ دیش کو قائم کرنے میں جو طریقہ کار اپنایا آج وہی طریقہ کار پاکستان بھارت میں "خالصتان" کے وجود کے لیے اپنا رہا ہے۔

ہندوستان کے نقشے میں "خالصتان" بنتا ہے یا نہیں لیکن "خالصتان" کے نام پر پنجاب میں تخریب کاری کا جو عنصر داخل ہو گیا ہے اس کی وجہ سے اگر کہا جائے کہ ہندوستان کے سینے سے خون کی ندی گزر رہی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ پاکستان اور ہندوستان میں آئے دن خونِ ناحق کے جو واقعات رونما ہوتے ہیں یہ ان ملکوں کی تباہی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ اپریشن بلیو سٹار، اپریشن بلیک تھنڈر، اپریشن بلیک کیٹ اس کی مثالیں ہیں حالات اور واقعات گواہ ہیں کہ اس ساری تباہی کی بنیاد "تنازعہ کشمیر" ہے اور تنازعہ کشمیر شیخ عبداللہ کا کھڑا کیا ہوا ہے۔

"مسئلہ کشمیر" میں الجھ کر پاکستان جب لوٹ گیا اور سخت ہزیمت کھا گیا تو بعض اسلامی ممالک نے اس کو دوبارہ کھڑا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس میں سعودی عرب کے شاہ فیصل نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا فروری ۱۹۷۴ء کو لاہور میں جو اسلامی ممالک کی چوٹی کانفرنس منعقد ہوئی اس نے بڑی طاقتوں کو لرزہ بر اندام کر دیا دنیا بھر کے مسلم اتحاد کو ایک طاقت کے روپ میں ابھرتے دیکھ کر اس کے توڑنے کا فیصلہ کیا گیا چنانچہ اس اتحاد

کا سر یعنی سربراہ سازش کے تحت گولی کا شکار بنایا گیا۔ اس طرح تنازعہ کشمیر نے پاکستان کو توڑ کر رکھ دیا اور جب اسلامی ممالک کے سربراہ اسے جوڑنے آئے تو شاہ فیصل کو گولی کا نشانہ بننا پڑا۔

پاکستان کی تباہی اور ہندوستان کی خرابی کا جب ہم نظرِ غائر سے جائزہ لیتے ہیں تو اس کا پہلا اور آخری سبب بھی تنازعہ کشمیر ہے۔ اس سبب نے بھارت کو مشرقی پاکستان میں مداخلت کا موقع فراہم کیا۔ پاکستان ضرور لوٹ گیا لیکن شیخ مجیب الرحمٰن جیسا لیڈر اپنے اہل و عیال کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ "مسئلہ کشمیر" نے پاکستان کو توڑ دیا تو ذوالفقار علی بھٹو موردِ الزام ٹھہرائے گئے جو بعد میں پھانسی کی سزا کے مستوجب بن گئے۔ اگر ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے توڑنے کے ذمہ دار ٹھہرائے نہ جاتے تو نہ ان پر قتل کا الزام لگتا نہ ان پر کوئی مقدمہ ہوتا اور نہ ہی ان کو پھانسی کی سزا دی جاتی پاکستان توڑنے کا الزام بھٹو صاحب کی موت کا باعث بن گیا۔ جنرل ضیاالحق نے جہاں مسٹر بھٹو سے انتقام لیا وہاں وہ بھارت سے بھی بدلہ لینے لگا انھوں نے سکھ انتہا پسندوں کی بھرپور حمایت کی ان کے لیے اپنے ملک میں ٹریننگ کیمپ کھلوائے اور سامانِ حرب سے لیس کر کے انھیں خالصتان کے لیے لڑوایا بالآخر وہ ایک حادثہ کا شکار ہوا جسے سازش کا نام دیا گیا یہ سازش اندرونی تھی یا بیرونی لیکن یہ بھی "مسئلہ کشمیر" کے سر بندھتی ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شیخ عبداللہ کے اس فیصلے نے سرزمینِ ہند و پاک میں بارود بو دیا ہے۔ انھوں نے دو پڑوسی دیشوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر رکھ دیا حتیٰ کہ انھوں نے اپنے عوام کو سرِ راہ چھوڑ دیا۔ جہاں وہ ہرگز اطمینان سے بھی نہیں رہ رہے ہیں۔

ان کے اس فیصلے اس نظریئے نے بھائی کو بھائی سے ماں کو بیٹے سے اولاد کو ماں سے اور بیٹی کو باپ سے جُدا کر دیا ——— اپنے عوام کو اپنے ہی وطن میں اجنبی بنا دیا۔

شیخ محمد عبداللہ نے سرزمینِ کشمیر میں جنم لے کر برِّ صغیر ہند و پاک کے کروڑوں لوگوں کو مصیبت میں ڈال کر ان کی خوشحالی اور ترقی میں رکاوٹ کا جو سامان مہیا کیا وہ ان کی ایک ایسی دین ہے جس پر سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان اور پاکستان جو اصل میں ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے اور یہ دشمن ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی دولت کا بیشتر حصہ عوام کی فلاح بہبود پر استعمال کرنے کے بجائے جنگی سامان اور آلات حرب پر صرف کر رہے ہیں۔

شیخ عبداللہ نے اپنی سوانح حیات "آتشِ چنار" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

"ہمارے سامنے سب سے نازک اور اہم سوال یہ تھا کہ بدلی ہوئی سیاسی دنیا میں ریاستِ جموں و کشمیر کے لیے کون سا راستہ فائدہ مند رہے گا۔ آیا وہ ہند کے ساتھ الحاق کرے یا پاکستان میں شامل ہو جائے یا آزاد رہ کر دونوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے ہوئے اپنا وجود برقرار رکھے۔ میرا خیال تھا کہ ہندوستان کے ساتھ رشتہ جوڑیں تو پاکستان کبھی بھی اس کو تسلیم نہیں کرے گا اور ریاستِ جنگ کا اکھاڑہ بن جائے گا علاوہ داخلی محاذ پر بھی برصغیر انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ . . ."

پوچھا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ سوچ کس کام کی جبکہ انھوں نے عملی طور پر ایسا ہی کیا، برِصغیر کو جنگ کا اکھاڑہ بھی بنا دیا اور کروڑوں لوگوں کو انتشار کا شکار بنا دیا۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک یہ انتشار برصغیر کے چپے چپے پر موجود ہے اور یہ انتشار کب تک رہے گا کچھ کہا نہیں جا سکتا —— اگر کہا جائے برِصغیر ہند و پاک کو یہی جنگ و جدل انتشار خون خرابہ تباہی اور بربادی ان کی دین ہے تو کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے۔



مہاتما گاندھی بڑے دور اندیش تھے۔ وہ کشمیر کے معاملے کو بخوبی سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ کشمیر کو بزورِ طاقت ہتیا لینے کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں انھوں نے اس بات کو واضح کر دیا ——

"کشمیر کو اپنے ساتھ زبردستی رکھنا ایک ایسی مثال ہے جیسی خشک گھاس کے انبار میں ایک دہکتے ہوئے انگارے کی، ذرا بھی ناموافق ہوا چلی تو سارے کا سارا برصغیر اس آگ کے شعلوں میں لپٹ جائیگا۔"

برِصغیر کی تقسیم سے اب تک رک رک کر ہی سہی ہندوستان اور پاکستان میں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ وہ اسی ناموافق ہوا کے چلنے سے پیدا ہوتے ہیں جن کی نشاندہی مہاتما نے کی ہے۔

اپریل ۱۹۵۱ء میں پنڈت جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی، مولانا ابوالکلام آزاد، مرارجی ڈیسائی اور کئی دوسرے کیبنٹ منسٹروں نے برصغیر کے اس انتشار اور مستقبل کی تباہی کو محسوس کیا اور مسلسل تین دنوں تک بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ کر لیں کہ ہمیں "کشمیر چھوڑ دینا چاہیئے" اور شیخ عبداللہ سے کہہ دینا چاہیئے کہ ان کی مرضی ہے کہ وہ پاکستان میں شامل ہو جائیں یا آزاد رہیں۔ شیخ صاحب نے ایسا سنا تو انھیں بہت دکھ ہوا وہ بھارتی رہنماؤں کے اس فیصلے پر سیخ پا ہوئے اور فوری طور دہلی روانہ ہو گئے۔ شیخ عبداللہ نے ان سے کہا: "میں نے کشمیر کا الحاق بھارت کے عوام کے ساتھ کیا ہے آپ لوگوں کے ساتھ نہیں۔ کشمیر کے لوگوں نے آپ کے ساتھ آدرشوں کی ہم آہنگی کی بناء پر ہاتھ ملایا ہے اب آپ اپنا ہاتھ کھینچ لینا چاہتے ہیں تو آپ کو اختیار ہے لیکن ہم نے ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ نہیں بلکہ ہندوستان کے عوام کے ساتھ رشتہ جوڑا ہے۔ یہ رشتہ یونہی کسی کے کہنے سے نہیں ٹوٹ سکتا ہے۔"

بھارتی رہنماؤں کے اس مشورے پر شیخ صاحب "کشمیر کو اٹھا لیجاتے" تو اس کا الزام ان پر نہیں آسکتا تھا۔ کشمیر کو اٹھا لیجانے کے جو بھی اسباب تھے ان کو ایک طرف رکھ کر ہندوستان اپنی ذمہ داریوں سے بری ہو گیا اور اس کے بعد شیخ عبداللہ کو کوئی اخلاقی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی بھی وقت اور کسی بھی مقام پر بھارتی رہنماؤں پر الزام لگائے کہ انھوں نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ حالانکہ انھوں نے ایسا کہا۔ اگر شیخ عبداللہ نے بھارتی رہنماؤں کی اس رائے کا احترام کیا ہوتا تو اس سے نہ صرف بھارت اور پاکستان کی دشمنی ختم ہو گئی ہوتی بلکہ اس سے بچھڑے ہوئے مل جاتے، کشمیر کے دو حصوں کے درمیان جو دشمنی کی لکیر کھینچی گئی تھی وہ مٹ گئی ہوتی، آج کوئی ماں اپنے لختِ جگر کی شکل دیکھنے کے لیے ترس نہیں رہی ہوتی، کوئی باپ اپنی بیٹی کا بیاہ دیکھنے کے لیے تڑپ نہیں رہا ہوتا کوئی بھائی اپنی بہن کی شکل دیکھنے کے لیے مچل نہیں رہا ہوتا۔ آج کوئی اپنی سرزمین یا اپنی جنم بھومی میں دفن ہونے کا ارمان لیے ہوئے عالمِ عدمِ بقا کو نہیں چلا جاتا۔

بھارتی رہنماؤں کی اس رائے کا شیخ صاحب نے احترام کر لیا ہوتا تو برصغیر جنگ کی لپیٹ میں آنے سے بچ گیا ہوتا نہ پاکستان کے دو ٹکڑے ہو جاتے نہ بھارت میں "خالصتان" کی آواز اٹھ گئی ہوتی، اگر آواز اٹھ بھی جاتی تو اس میں ہرگز اتنا زور نہیں ہوتا، اس کی

وجہ سے ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اُتارے گئے اور آئے دن اُتارے جا رہے ہیں۔ پاکستان کی حمایت اور مدد کے بغیر وہاں سے ناراض سکھ جنہیں انتہا پسند کہا جا رہا ہے ایک چاقو بھی نہیں لا سکتے جنگی سامان کی تو بات ہی نہیں۔ ہندوستان بار بار اس بات کا واویلا کر رہا ہے کہ پاکستان میں سکھ انتہا پسندوں کو تخریب کاری کی ٹریننگ دی جاتی ہے، انھیں آٹومیٹک ہتھیار بم اور گولہ بارود دیا جاتا ہے صاف ظاہر ہے اگر پاکستان ہندوستان کا دوست ہوتا تو کیا یہ سب کچھ اس ملک کے خلاف کیا جاتا ——— نہیں ہرگز نہیں۔ پاکستان کے ساتھ دوستی کی صورت میں نہ سامانِ جنگ امرتسر آجاتا نہ اپریشن بلیو سٹار کی نوبت آجاتی اور نہ ہی اپریشن بلیو سٹار میں ہزاروں سکھ مارے جاتے اور نہ ہی گولڈن ٹمپل کی بے حرمتی کا بدلہ مسز اندرا گاندھی سے لیا جاتا۔ اور نہ ہی مسز اندرا گاندھی کا بدلہ دہلی بوکارو اور کانپور میں ہزاروں سکھوں کو قتل کر کے لیا جاتا اگر بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کا قتل "مسئلہ کشمیر" کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو ہرگز غلط نہیں ہوگا۔ صاف ظاہر ہے کشمیر سے لے کر پنجاب تک جو روزانہ قتل و غارت ہو رہا ہے وہ ایک لیڈر کا کارنامہ ہے جس کا نام شیخ عبداللہ ہے۔

شیخ محمد عبداللہ نے میدانِ سیاست میں اتر کر جہاں برصغیر ہند پاک کو خون خرابے انتشار اور پریشانی میں مبتلا کیا وہاں کشمیری عوام کی آرزوئیں اور تمنائیں بھی مٹا کر چلا گیا۔ کشمیری عوام کی آرزوئیں اور تمنائیں صحیح ہیں یا غلط لیکن یہ ایک حقیقت ہے کی یہاں کی اکثریت بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کو ناپسند کرتی ہے۔

شیخ عبداللہ عام لوگوں کی پسند ناپسند سے ہرگز ناواقف نہیں تھے اس باوجود بھی انھوں نے مرکزی رہنماؤں کی "کشمیر کو اٹھا لیجانے" کی تجویز مسترد کی، کیوں ———؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب شاید ان کے پاس بھی نہیں البتہ حالات اور واقعات کا تجزیہ کر کے صاف طور پر پتہ چلتا ہے وہ ابتدا سے ہی سیکولر نظریئے کے حامی تھے۔ ان کے اس نظریئے کی جتنی ہم قدر کریں اتنا کم ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس میں انسانیت مضمر ہے۔ لیکن غیر مسلموں کو اپنانے اور ان کی خوشنودی کے لیے مسلمانوں کو بھینٹ چڑھانا اور انھیں تختۂ مشق بنانا نہ ہی سیکولرزم ہے اور نہ ہی انسانیت۔

شیخ عبداللہ کا سیکولر نظریہ غیر مسلم اقلیت کی حفاظت تک تو بالکل ٹھیک تھا

اور قابلِ قدر بھی لیکن ان کا یہی نظریہ جب مسلم کش بن جاتا ہے تو اس پر حد درجہ افسوس کرنا پڑتا ہے۔ شیخ عبداللہ ایک طرف غیر مسلموں کی حفاظت بڑی شد و مد سے کرتے دوسری طرف مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کو ختم کرنے ان کے حمائتیوں کو طاقت سے دبانے میں زیادہ سرگرم رہے۔

واقعات شاہد ہیں کہ مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے ساتھ ان کو نفرت تھی۔ سبز پرچم چاند ستارے کے ساتھ انھیں الرجی تھی۔ مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے بینر چاہے ان پر کلمہ شہادت ہی کیوں نہ لکھا ہو ان کی نظریں ان کو ہرگز برداشت نہیں کرتی تھیں۔ ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک کا زمانہ اس بات کا گواہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی جگہ یہاں مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے پرچموں کے ساتھ اسلامی بینروں کو برداشت نہیں کیا اور جہاں کہیں بھی یہ نظر آئے انھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ شیخ محمد عبداللہ نے میدانِ سیاست میں آکر کئی اچھے کام کئے انھوں نے جاگیرداری اور زمینداری ختم کی، سود خواری سے عوام کو نجات دلادی کسانوں کو زمین کا مالک بنادیا ——— انھوں نے ہمیں شیر کشمیر گلی، شیر کشمیر کوچہ، شیر کشمیر سڑک، شیر کشمیر چوک، شیر کشمیر کالونی، شیر کشمیر پارک، شیر کشمیر سٹیڈیم، شیر کشمیر پل، شیر کشمیر مسجد، شیر کشمیر میڈیکل انسٹیچیوٹ، شیر کشمیر میٹنگ ہال، شیر کشمیر بھون، شیر کشمیر زرعی یونیورسٹی دی یہ دوسری بات ہے کہ ہماری نئی پود کو اس کے کہیں آثار نظر نہیں آئیں گے۔ انھیں تحقیق کرنی پڑے گی یہ ساری تعمیرات کہاں کہاں پر واقع تھیں۔

شیخ محمد عبداللہ نے سرزمین ہند و پاک میں جو بیج بویا وہ گولہ اور بارود دے رہا ہے۔ ایسی گولہ اور بارود سے ہمیں خون، آگ اور دھواں مل رہا ہے۔ شیخ عبداللہ نے ہندوستان اور پاکستان کو ایک دوسرے کا دشمن بنادیا۔ یہ دشمن ایک دوسرے کو توڑنے کے لیے جو کھیل، کھیل رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

میں مسئلہ کشمیر کے ساتھ شاہ فیصل، شیخ مجیب الرحمٰن، ذوالفقار علی بھٹو، مسز اندرا گاندھی اور جنرل ضیاالحق کا قتل جوڑ رہا ہوں اور اس کے لیے میرے پاس جو دلیل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ابھی نہ جانے یہ مسئلہ کن کن لیڈروں کی جان

لے گا؟ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ بے گناہ لوگوں کی جانیں آئے دن لیتا رہتا ہے۔

کشمیری عوام پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ اپنے ملک کا کھاتے ہیں پیتے ہیں لیکن گیت پاکستان کے گاتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں چاہے یہ ہاکی ہو یا کرکٹ جب بھارت اور پاکستان کا مقابلہ ہوتا ہے تو اس وقت کشمیر کی اکثریت پاکستانی بن جاتی ہے۔ ہندوستان کے مقابلے میں کشمیر کی اکثریت کرکٹ میچ کے دوران ویسٹ انڈیز جیسے دور دراز کے ملک کی حمایت کرتی ہے لیکن اپنے ملک کی نہیں۔ یہ الزامات بالکل درست ہیں۔ لیکن ایسے الزامات لگانے والے وہ اسباب نظر انداز کرتے ہیں جو پاکستان کی طرفداری کے ذمہ دار ہیں۔

۱۹۵۳ء کو وزارت سے محروم ہو کر "رائے شماری" کے نام پر ریاست کے مسلمانوں میں پاکستان کے نام کا جو مادہ ان کی رگ و پے میں خون بن کر دوڑنے لگا پورے ۲۲ برسوں تک یہ مادہ ریاستی مسلمانوں کی رگ رگ میں ایسا سرایت کر گیا کہ یہ سرجری کر کے بھی سارے کا سارا نہیں نکل سکے گا۔ ریاستی مسلمانوں میں یہ مادّہ بھرنے والے پاکستان سے کروڑوں روپے ہضم کر گئے۔ اب یہی لوگ پاکستان کا مادّہ عوام کے دلوں سے نکالنے کے لیے جیلوں کے دروازے کھولنے کے ساتھ ساتھ انھیں گولیوں سے بھی بھون رہے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام سرکار اور اپوزیشن کشمیری مسلمانوں پر پاکستان کے طرفدار ہونے کا الزام عاید کرتی ہے۔ اصل میں جو اس الزام کے مستحق تھے جنھوں نے عوام کی رگ رگ میں پورے ۲۲ برسوں تک پاکستان سے کروڑوں روپے کا معاوضہ لے کر ان کے دلوں میں پاکستان کی محبت بھر دی وہی احباب یہ محبت نکالنے کے لیے ان کی چیر پھاڑ کر رہے ہیں ان پر گولیاں برسا رہے ہیں، زندانوں میں بھر کر ان کا کچومر نکلواتے ہیں اور دھمکیاں دے رہے ہیں کہ یہاں کبھی پاکستان نہیں بن سکتا۔ ٹھیک ہے اگر یہاں کبھی پاکستان نہیں بن سکتا لیکن ہندوستان کبھی سکھ شانتی سے نہیں رہ سکتا جہاں دلوں کا ملاپ نہ ہو وہاں جسمانی ملاپ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا! الحاق کے بارے میں کشمیریوں کا نظریہ بالکل مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے لارڈ مونٹ بیٹن اور جواہر لال نہرو نے اسے عارضی کہا ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہندوستان اور پاکستان کشمیر کے دعویدار تو ہو سکتے ہیں لیکن کشمیری عوام ان دعوؤں کی آبیاری

نہیں کر سکتے۔

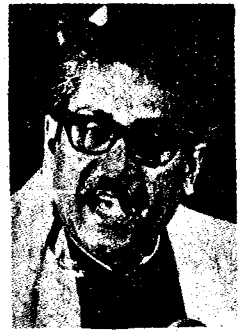
کشمیری عوام کا نظریہ صحیح ہے یا غلط لیکن وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو جتنی جلدی تسلیم کر لیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میرے خیال میں حقیقت تسلیم کرنا سب سے بڑی دانشمندی ہے اور جہاں دانشمندی سے کام نہیں لیا جاتا وہاں خون خرابہ ہوتا ہے — اور بس!

یہاں خون خرابے کا سلسلہ کب تک جاری رہتا ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

کشمیر میں جنم لے کر شیخ عبداللہ نے کشمیریوں کو ظلم و جبر، قید و بند، ہڑتالیں، کرفیو لاٹھی چارج اور گولیاں دیں برّصغیر ہند و پاک کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر انھیں جنگ و جدل دی تخریب کاری دی۔ شمالی ہندوستان میں آئے دن جو آگ لگ رہی ہے دھماکے ہو رہے ہیں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے اس کا اول اور آخر ذمہ دار شیخ محمد عبداللہ ہے۔

برّصغیر ہند پاک کو شیخ عبداللہ کی یہی ایک دین ہے۔





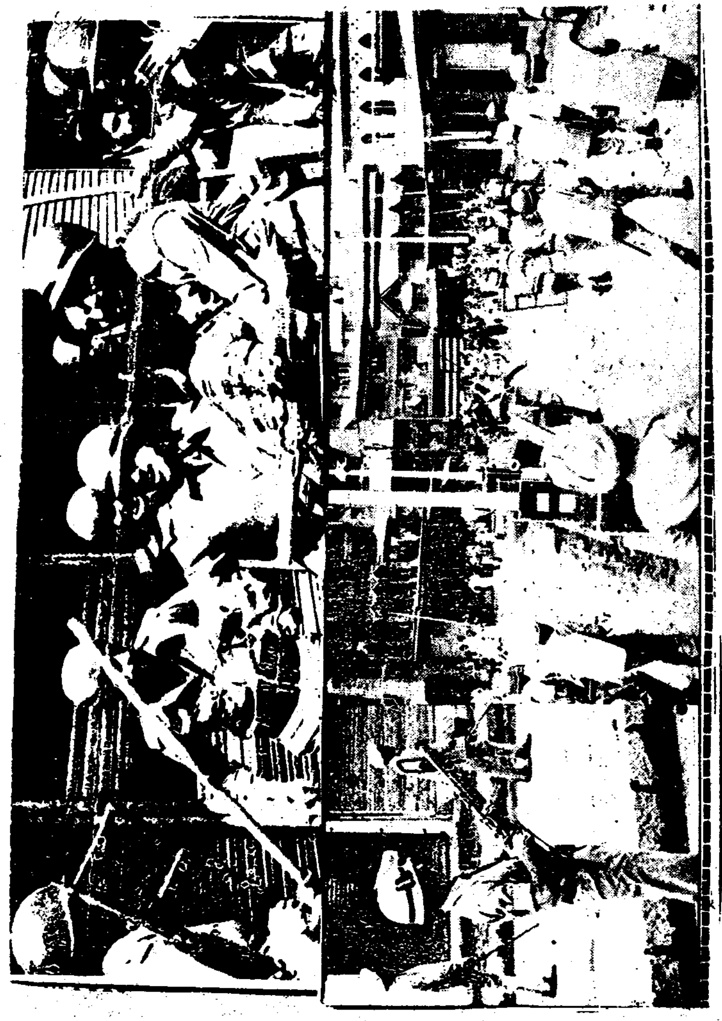






شاہ فیصل، شیخ مجیب الرحمان، ذوالفقار علی بھٹو ۔ مسز اندرا گاندھی اور جنرل ضیاء الحق وہ سربراہانِ مملکت جنہیں شیخ عبداللہ کی ناکام سیاست نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔





برصغیر ہندو پاک کو شیخ عبداللہ کی دین

برصغیر ہند و پاک کو شیخ عبداللہ کی دین





برصغیر ہندو پاک کو شیخ عبداللہ کی دین

رازہے رازہے تقدیرِ جہانِ تگ وتاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

کچھ اپنے بارے میں

میں اُس گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں جو بیٹے کی پیدائش پر زیادہ خوشیاں مناتے ہیں نہ بیٹی کی پیدائش پر زیادہ دکھی ہوتے ہیں، بچے کا جنم دن منانے کا ہمارے یہاں کوئی رواج نہیں۔ اگر چہ اب خاندان میں اس کا چلن ہونے لگا ہے۔ ہمارے یہاں پہلے پہل بچے کا جنم کا ریکارڈ بھی رکھا نہیں جاتا، یہی وجہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ میرا جنم کب ہوا؟ البتہ میرا جنم درگجن ڈلگیٹ میں ہوا ہے میری ماں کا کہنا ہے اسلامی مہینے کی رمضان کی ۳ تاریخ کو میرا جنم ہوا ہے، سنہ کون تھا انھیں ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ تلاشِ بسیار کے بعد میرے جنم کا سال ۱۹۲[illegible]ء طے پایا ہے۔



میرے والد صاحب عبدالرزاق ریشی علاقہ کھاگ کے پوشکر نامی گاؤں سے آکر سرینگر میں بس گئے تھے۔ میرے پڑدادا بابا لطف الدین جو ایک بادشاہ ہوکر فقیر ہوگئے تھے اور پوشکر میں ابدی نیند سوئے ہوئے ہیں اُن کی مریدی میں ریشی کہلائے اور ریشی مسلک کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ میرے دادا محمد سبحان بھی جو والدین کی اکلوتی اولاد تھے، زمینداری کا کام سنبھالا اور ان کی واحد اولاد عبدالرزاق بچپن میں اپنا گھر بار اور علاقہ خیرباد کہہ کر سرینگر آگئے۔

(شبنم قیوم)

..یہاں گھوم پھر کر عبدالرحیم صوفی (صوفی محی الدین مدیر شہیر صوفی غلام محمد مدیر سرینگر ٹائمز)



شبنم قیوم کے والد
مرحوم خواجہ عبدالرزاق

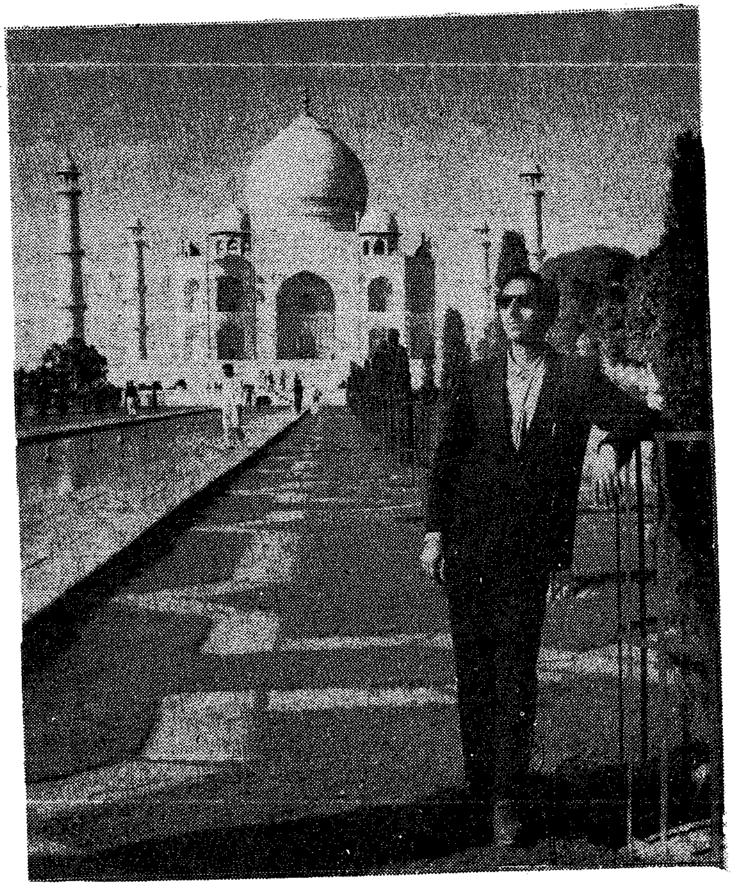




اوپر : شبنم قیوم کی والدہ اپنے پوتے کے ساتھ
نیچے : شبنم قیوم کے بھائی مسعود احمد، مجید ارجمند اور نذیر احمد



شبنم قیوم اپنے والد کے ساتھ



شبنم قیوم تاج محل کے آغوش میں

کے والد کی بڑی بیٹی مسماۃ فیضی کے ساتھ ان کا بیاہ ہوا اور وہ صوفی گھرانے میں خانہ داماد کے طور پر برسوں تک رہے۔ چونکہ عبدالرحیم صوفی نے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا اس ناطے وہ صوفی محی الدین اور صوفی غلام محمد کے بڑے بھائی بھی تھے اور صوفی کہلانے لگے۔

عبدالرحیم صوفی کی درگجن میں اپنی مِلک ڈیری (دودھ، کریم، مکھّن اور پنیر کا کارخانہ) تھی، اور اس کا سارا بار میرے والد صاحب پر ہی تھا۔ کیونکہ ان ایام میں ان کی اپنی اولاد نابالغ تھی۔

میرے والدین سے پہلے ایک بیٹی ہوئی، پھر میں ہوا، میرے بعد ایک اور بیٹی ہوئی یہ سلسلہ جاری رہا، جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے، میرے والد صاحب کو عبدالرحیم صوفی نے بیٹا بنا لیا تھا۔ اس ناطے انہیں حصّہ فرزندی میں بھی شامل کر لیا تھا لیکن تھے تو وہ گھر داماد ہی، اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ گھر داماد کا دیر سویر بھانڈا پھوٹ ہی جاتا ہے۔ سو میرے والد صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

میرے والد بیوی بچّوں کو لے کر میرے خالو جان حاجی غلام احمد وانی کے گھر بوچھوارہ آ گئے اور یہاں قیام کے دوران انھوں نے خواجہ عبدالصمد وانی کا پُرانا بوسیدہ مکان خرید لیا۔ اس پُرانے بوسیدہ مکان کو ڈھا کر نیا مکان بنانے کا فیصلہ ہوا۔

میرے والد صاحب چونکہ مِلک ڈیری کے کام میں رس بس گئے تھے۔ لہذا انھوں نے ذاتی طور پر گلمرگ میں ایک ڈیری یونٹ چالو کیا۔ یہاں ان کا کاروبار ابھی جم ہی رہا تھا کہ وادی پر قبائلیوں نے حملہ کیا۔

جب قبائلیوں کے لوٹ مار کی خبریں پھیلائی گئیں تو گلمرگ میں ڈیری یونٹ بند کیا گیا اس کی مشینیں اور دوسرا سامان سرینگر منتقل کرنے کے لیے پہلے پڑاؤ کے طور پر گلمرگ سے ٹنگمرگ لانا تھا، چنانچہ یہ سارا سامان گھوڑوں پر لادا گیا (ان ایّام میں گلمرگ موٹر گاڑیاں نہیں جاتی تھیں) گلمرگ سے ٹنگمرگ لانے کے دوران سارا سامان غائب ہو گیا۔

بتایا گیا گھوڑوں کے بدکنے سے وہ سارا سامان معہ گھوڑوں کے کھائی میں

گر گیا جہاں سے سامان کو نکالنا مشکل ہے۔

میرے والد صاحب سب کچھ لٹا کر جب سرینگر آ گئے تو قبائلی حملے کے باعث سرینگر میں بھی اس کاروبار میں زبردست رکاوٹ آ گئی تھی چونکہ مشینوں کے بغیر مِلک ڈیری کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میرے والد صاحب ایک طرح سے بیکار اور بیروزگار ہو گئے۔ ان کا جو بھی اثاثہ تھا وہ سب اپنا مکان بنانے میں صرف ہوا۔ ٹوٹا پھوٹا مکان تو کسی طرح بن گیا لیکن بے کاری اور بیروزگاری سے تنگ آ کر میرے والد صاحب کو چند برسوں تک مزدوری کرنا پڑی۔ اس دوران وہ دوبارہ مِلک ڈیری چالو کرنے کی بڑی جستجو کرتے رہے، چنانچہ اس جستجو میں وہ کسی حد تک کامیاب ہوئے اور انھوں نے ایک مشین حاصل کر کے ہارون میں دوبارہ ڈیری یونٹ چالو کیا۔

اِسی اثناء میں عبدالرحیم صوفی کے بڑے فرزند صوفی محی الدین (ایڈیٹر ستہمیر) تعلیم سے فارغ ہو کر اِسی ہارون میں ملک ڈیری کے کام میں جٹ گئے تھے۔

دونوں ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اپنے کام میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے میں لگ گئے۔ لیکن انگریز کے چلے جانے سے اس کاروبار میں جو ٹھہراؤ آ گیا تھا وہ کم ہونے کے بجائے بڑھ ہی گیا۔ لہذا اس کا متبادل ڈھونڈنے کے سوا انہیں کوئی چارہ نہ رہا۔

میرے والد صاحب نے ایک کے بعد ایک کام ہاتھ میں لیے۔ کئی جگہ نوکری بھی کی لیکن کہیں بھی جم نہ سکے، آخر کار انہوں نے اپنے ہی مکان کی ایک دُکان میں کریانہ کی دُکان کھولی، عیالِ کثیر کے ہوتے ہوئے محدود آمدنی نے انہیں سخت بیدل کر دیا البتہ میری والدہ نے چرخہ کات کر ان کا ہاتھ بٹانے میں کسی حد تک ان کی مدد ضرور کی۔

میرے والدین اَن پڑھ تھے، البتہ اپنی اولاد کو لکھانے پڑھانے کا انہیں بڑا شوق تھا۔ میری بڑی بہن کو تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن میں اس کا انجام اور فائدہ جانے بغیر ہی پڑھنے لگا۔

میں اپنے ہی محلہ کے پرائمری اسکول میں پڑھ رہا تھا اور خالی وقت میں والد صاحب کے ساتھ دُکان پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس طرح کم سنی میں ایک طرح سے مجھ پر بھی گھر کا کچھ بوجھ

پڑ گیا۔ جب اس دکان سے ہمارا گزارہ نہ ہو سکا۔ تو میرے والد صاحب نے علاقہ ٹنگمرگ کے اوسن گاؤں میں وہاں کے نمبردار کے ساتھ شرکت میں دکان کھولی جس کی وجہ سے ان کو اکثر گھر سے باہر رہنا پڑا۔

میری ماں کی نانی مسماۃ زون دیدی جو طلاق یافتہ تھیں اور ہمارے ہی گھر میں بود و باش رکھتی تھیں مجھ کو پالنے میں وہ جو پیار مجھ پر نچھاور کرتی تھی اس کی مثال نہ میں نے آج تک دیکھی اور نہ دیکھنے کو ملے گی۔

پانچویں کا امتحان پاس کر کے میں آگے کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے ایس، پی اسکول میں داخل ہوا یہاں میں چھٹی سے آٹھویں جماعت تک اسکول میں بڑا ایکٹیو رہا مجھے یہاں صبح کی پیریڈ پڑھانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ میں آٹھویں کلاس میں زیر تعلیم تھا کہ مجھ پر بد قسمتی کے سائے منڈلانے لگے۔

میں فٹ بال کھیلنے کا شوقین تھا اور اسکول میں ریسس کے دوران خالی وقت میں فٹ بال کھیلنے میں صرف کرتا تھا۔ ہم نے اپنے کلاس کی دو ٹیمیں بنائی تھیں ایک ٹیم کا کیپٹن میں تھا۔ ایک روز ہم نے میچ کھیلا۔ میچ کی ہار جیت کے لیے ایک ایک روپیہ فیصلہ ہوا۔ میری ٹیم نے میچ ہارا تو میں ایک روپیہ ادا نہ کر سکا۔ مخالف ٹیم کا کپتان جو درگجن کا ہی رہنے والا تھا اور میرا ساتھی بھی تھا۔ میری ساری کتابیں ضبط کر گیا۔ نہ میں گھر سے اس کے لیے ایک روپیہ لا سکا اور نہ ہی اس نے میری کتابیں واپس کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں گھر سے اسکول کے نکلتا ضرور تھا۔ لیکن اسکول جانے کے بجائے اسکول کا وقت آوارہ گردی میں گزارتا تھا۔

اسی دوران میں سائیکل چلانا بھی سیکھ رہا تھا۔ سائیکل پر سے گرتے ہوئے سائیکل کا ہینڈل میری بائیں پسلی کو زخمی کر گیا، مجھے کئی دنوں تک درد رہا۔ لیکن اس درد کو گھر والوں سے چھپائے رکھا۔ کوئی تین چار ماہ ہوئے کہ میری اس پسلی پر ایک پھوڑا ظاہر ہوا جس سے پیپ نکلنے لگی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے والدہ صاحبہ کو بتایا، انھوں نے ایک مقامی ڈاکٹر کے پاس لے جاکر دکھایا جس نے مجھے ہسپتال لیجانے کا مشورہ دیا۔

دوسرے دن اسٹیٹ ہسپتال میں میرا معائنہ کیا گیا دوا کا نسخہ لکھ دیا اور

ہدایت کر دی کہ جب پیپ جمع ہونے لگے تو یہاں آنا۔ چنانچہ ابتدا میں مجھے پندرہ بیس دنوں کے بعد ہسپتال جانا پڑتا، پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مجھے ہفتے میں ایک بار ہسپتال جاکر وہاں بائیں پسلی سے پیپ نکلوانی پڑتی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں جوں جوں دوا کی درد بڑھتا ہی گیا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

ہسپتال جاکر پیپ نکال کر آنے میں ایک سال پورا ہوا دوسرا سال ہوا پھر تیسرا سال اور پھر چوتھا سال تو اس بیماری نے مجھے نہ صرف جسمانی طور پر لاغر کر دیا بلکہ ہم اقتصادی طور پر بھی بے حد کمزور ہو گئے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی کہ میں تعلیم آگے جاری رکھنے سے مجبور ہو گیا۔ ہماری مالی حالت اس کی متحمل نہ تھی کہ کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کا مشورہ حاصل کرتے، اور نہ ہی اس بات کا شک تھا کہ ہسپتال کے ڈاکٹر میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو کر سخت لاپرواہی برت رہے ہیں۔ میرے مرض کی تشخیص میں وہ زبردست غلطی کے مرتکب ہوئے تھے۔

پورے پانچ سال تک ایس، ایم، ایچ، ایس ہسپتال کی خاک چھاننے کے بعد جب مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہوا تو تنگ آمد کے مصداق میری والدہ نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھ ہی لیا" آخر یہ کونسا مرض ہے جو اس قدر لاعلاج ہے، جس میں ذرا بھی افاقہ ہونے کے بجائے روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے، اس بیماری سے میرا بیٹا ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا" اسے ٹی۔ بی۔ کہتے ہیں اور اس کے ٹھیک ہونے میں واقعی برسوں لگتے ہیں"۔ ہم نے ڈاکٹروں کی زبان پر اعتبار کیا۔ البتہ اب ہسپتال جانے کے بجائے محلّے کے ہی ایک کمپاؤنڈر سے اس کا علاج شروع کیا۔

کریم شیخ نامی یہ نیم حکیم ہر ہفتے آکر میری پسلی میں اس جگہ پر چھید کرتا جہاں پر پیپ جمع ہوتی، پیپ نکال کر وہ اس چھید میں دوائی ڈال دیتا، یہ سلسلہ چھ سات مہینوں تک جاری رہا۔

میرے والد صاحب جو روزگار کے سلسلے میں کبھی ادھر اور کبھی اُدھر ہوا کرتے تھے، اس لیے میری بیماری کے ساتھ گھر بار کا سارا خیال میری ماں کو ہی رکھنا پڑتا میرے خاندان کے لوگ اس دوران ہمارے بارے میں بالکل لاپرواہ ہو کر

رہ گئے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان ایّام میں ہمیں فاقے بھی کرنا پڑتے تھے تو غلط نہیں ہوگا۔

جب میری حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی تو ہمارے ایک پڑوسی عمہ بٹ جو رعناواری مشن ہسپتال (اب یہ نہرو میموریل ہسپتال کہلاتا ہے) میں ڈاکٹر صاحب کے خانساماں تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ اسی ڈاکٹر صاحب کے پاس لیا اور اسے سارا ماجرا بتادیا۔



(شبنم قیوم)

ان دنوں رعناواری کا یہ مشن ہسپتال صرف زنانہ علاج تک محدود تھا اور اس کا ڈاکٹر جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ حاملہ خواتین کا علاج ومعالجہ اور آپریشن وغیرہ کیا کرتا تھا۔

ڈاکٹر میری روداد سن کر بہت متاثر ہوا، اور اس نے مجھے بتایا کہ لوکل ڈاکٹروں نے تمہارے مرض کا جو ٹی بی نام تجویز کیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ دراصل تمہاری پسلی میں زخم لگا ہے۔ اگر انہوں نے آپریشن کر کے پسلی کا یہ زخمی حصّہ کاٹ دیا ہوتا تو تم ٹھیک ہوگئے ہوتے، خیر یہ کام اب میں خود ہی کروں گا ــ تم دس دن کے بعد آجانا۔ تاکہ تمہارے مرض کی اچھی طرح تشخیص اور علاج ہوسکے۔

ان دنوں ہسپتال کا یہ ڈاکٹر ۱۵ دنوں کی چھٹی گزار رہا تھا اور وہ اسی روز پہلگام جارہا تھا۔

میں گھر میں ڈاکٹر کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ اتفاق سے پہلگام پہنچ کر ہی اس ڈاکٹر کی بائیں پسلی میں درد ہونے لگا۔ اگلے روز وہ پہلگام سے واپس آیا تو عمہ بٹ خانساماں کو بتایا میں علاج کے لیے امریکہ جارہا ہوں۔ شاید میں واپس نہیں آسکوں گا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا سارا اثاثہ اپنے ملازموں میں بانٹ دیا اور خود امریکہ روانہ ہوا ساتھ

روز کے بعد امریکہ سے ہسپتال کو اطلاع مل گئی ڈاکٹر صاحب رحلت کر گئے۔

جس روز ہمیں یہ اطلاع ملی ہمارے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی ہمیں لگا گویا ہمارا ی عزیز مر گیا۔ ہم ایک بار پھر نا اُمید ہوگئے۔ البتہ مرحوم ڈاکٹر نے ہمیں جو تسلی ی تھی اور کہا تھا آپریشن سے یہ مرض ٹھیک ہوجائے گا۔ تو ہم یہی تجویز لیکر اسٹیٹ سپتال گئے۔ لیکن یہاں ڈاکٹروں نے آپریشن کرانے سے انکار کیا۔ وہ اپنی ٹی۔بی۔ کی شخیص پر ڈٹے رہے۔ لاچار ہوکر میری والدہ نے مجھے نیشنل ہسپتال لیا۔ یہاں پر ڈاکٹر ن نے میرا ایکسرے لیکر زخمی پسلی کی تصدیق کر دی اور اسکے لیے اپریشن کی تجویز رکھدی ہوں نے آپریشن وغیرہ کے لیے چار سو روپے مانگے۔ تو اتنی رقم ہماری بس سے سوں دور تھی۔

مجھے یاد ہے میری ماں نے مجھے ہسپتال میں بھرتی کروایا۔ اور یہ چار سو روپیہ ادھار مانگنے کے لیے وہ روانہ ہوگئی۔ نیشنل ہسپتال کے بیڈ پر دراز ہوکر میری آنکھوں ے نہ تھمنے والے آنسو رواں ہوگئے۔ اس خیال سے کہ نہ جانے ماں چار سو روپے صول کرنے کے لیے کہاں کہاں جائے گی اور کن کے آگے ہاتھ پھیلائے گی۔ بہتر ہے کہ میں ں سے پہلے ہی اپنے آپ کا خاتمہ کروں، چنانچہ دوسروں کی نظروں سے بچ کر میں ہسپتال ے کھسک گیا۔

اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے میرے پاس ایک کے بعد ایک خیال آئے لیکن نہ نے کیوں میں حتمی فیصلہ نہ کر سکا۔ شام کو تھکا ہوا میں گھر آیا تو میری ماں ابھی پس نہیں آئی تھی اور جب وہ آئی اور اس نے مجھے اپنے گھر میں دیکھا تو وہ حیران ہ گئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا تم ہسپتال سے کیوں بھاگ آئے ہو، میں کوئی جواب یں دے سکا۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا دو سو روپے اُدھار میں حاصل ہوگئے ہیں۔ دو روپے بھی حاصل ہو جائیں گے۔ لہٰذا تم ابھی اسی وقت ہسپتال جاؤ۔

میں نہیں مانا۔ مجھ پر ہسپتال جانے کے لیے جتنا دباؤ ڈالا گیا اتنا ہی میں ضدی لیا۔

دراصل خودکشی کرنے کے معاملے میں بزدل ثابت ہوا اب میں اسی طرح گھٹ گھٹ

کر مرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا ہسپتال جانا میں منظور کیسے کرتا۔ ہو سکتا ہے قدرت مجھے مارنا نہیں چاہتی تھی۔

کیونکہ نیشنل ہسپتال سے بھاگ نکلتے ہی میرے پسلی کا پیپ سوکھ گیا اور زخم مہنوں تک مجھے اسکے نکالنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

اسی دوران رعناواری کے مشن ہسپتال میں نیا ڈاکٹر سن بیٹری آگیا تو عمہ بٹ خالنسا مان نے مجھے ان کے پاس لیا۔ انہوں نے اسی وقت آپریشن لکھ دیا اور ایک ہفتے کے اندر اندر میرا آپریشن ہوا۔ رعناواری ہسپتال میں جس روز میرا آپریشن ہوا اس روز میری خبر گیری کے لئے میرے بڑے بہنوئی غلام محمد ڈار اور میرے ماموں صوفی محی الدین رکھے گئے۔ ان دونوں پر نیند نے ایسا غلبہ کیا کہ وہ ایسے سوگئے کہ صبح تک اٹھ نہ سکے، مجھے رات کو سخت پیاس لگی۔ مجھے بیڈ کے ساتھ چھوٹی الماری پر سے پانی کا گلاس لینے کے لیے حرکت کرنا پڑی کہ اس سے میرے آپریشن کے ٹانکے اکھڑ گئے میں لگ بھگ بے ہوش ہوگیا۔ صبح سویرے صفائی والا جب وارڈ میں آیا اور اس نے میرے بیڈ کے نیچے فرش پر خون دیکھا تو وہ گھبرایا اور اسی وقت ڈاکٹر کو خبر کر کے آیا۔ میری بندش کھول کر دیکھا گیا تو سارے ٹانکے ٹوٹ چکے تھے اسی وقت مجھے دوبارہ آپریشن تھیٹر میں لیا گیا۔ رعناواری ہسپتال میں، میں پچاس دنوں تک رہا۔ اس دوران میری یہاں محبت کی حد تک ایک نرس رفعت سے دوستی ہوگئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ رفعت مجھ پر مرمٹنے لگی تو غلط نہیں ہوگا۔ رفعت کی دیکھا دیکھی ایک اور نرس گریس بھی مجھے اپنے دام میں لانے لگی۔ ایک دوسرے پر سبقت لینے کے لیے یہ دونوں مجھ پر ایسا پیار جتانے لگیں کہ میں آپریشن کے ساتھ ہسپتال کے ماحول کو بالکل بھول گیا۔ ان دونوں کی محبت اور شفقت نے مجھے یقیناً نئی زندگی دی اور مجھے جینا سکھا دیا۔ گریس کو امرتسر تبدیل کیا گیا تو مجھے لگا کسی نے میرا دل کاٹ کر لیا۔ عام طور پر کسی بھی ہسپتال میں انڈور مریض کو جب صحت یاب ہو کر رخصت کا مژدہ سنایا جاتا ہے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے لیکن شاید میں پہلا مریض تھا جو ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کی خبر سنکر غم والم کے انتھاہ سمندر میں گر گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو گرتے لگے تو میری ماں کی موجودگی میں رفعت نے میرا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا کر میری ڈھارس بندھائی۔

ں نے روتے روتے رفعت سے کہا اب صبح سویرے میرا منہ کون دھوئے گا میری بالوں تیل ڈال کر کنگھی کون کرے گا۔ اب کون میرا بازو اپنے شانے پر رکھ کر اور اپنا بازو میری ر میں ڈال کر مجھے چہل قدمی کرائے گا۔ ہسپتال میں ہماری محبت کا ویسے بھی چرچا ام تھا لیکن اس روز جب مجھے ڈسچارج کیا گیا رفعت نے میرا سر اپنے سینے کے ساتھ ھکر میرے آنسو پونچھ کر اپنے آنسوؤں کو بہنے دیا تو یہ اس بات کا برملا اظہار تھا۔ اری جدائی دو چاہنے والوں کی جدائی ہے۔ اور جو دونوں کے لیے ایک المیہ سے کچھ کم یں۔

میں ہسپتال سے گھر گیا تو رات گئے تک رشتہ دار اور ہمسائے آکر صحت یاب ہونے ا مبارکباد دینے آئے۔ رات تو جوں توں کر کے میں نے کاٹ ہی دی لیکن صبح ہوتے ی میں سبھوں کی نظریں بچا کر رفعت کو دیکھنے رعناواری ہسپتال گیا۔

اس طویل عرصے کی بیماری نے مجھے تعلیم پڑھنے سے روک دیا۔ اب میں اپنی دکان نبھالنے لگا۔ کیونکہ والد صاحب ٹرانسپورٹ میں نوکری کرتے تھے۔

سودا سلف ادھار میں چلا گیا تو دو سالوں میں دکان ہی بیٹھ گئی۔

میرے خالو جان جو نانوائی کی دکان چلاتے تھے انہوں نے مجھے اپنی دکان پر ام کرنے کے لئے رکھ لیا۔

یہ کوئی ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ ڈپٹی وزیر اعظم بخشی غلام محمد کی کوٹھی کے لیے ی دکان سے روٹیاں جاتی تھیں۔ ان کا جو نوکر حبیب اللہ یہاں سے روٹیاں لینے آتا ۔ انہیں سے میرے خالو جان حاجی غلام احمد نے میری نوکری کی سفارش کرنے کو ہا۔ انہوں نے بخشی صاحب کی بیوی بیگم صاحبہ سے میرا ذکر کیا تو مجھے کوٹھی پر بلوایا اور گھریلو ملازم رکھا گیا۔

یہاں میں کو اڑھائی سال تک رہا اور ان اڑھائی سالوں میں مجھے زندگی کا ج ربہ ہوا اور جو دنیا دیکھنے کو ملی اس نے واقعی مجھے پختہ بنا دیا۔ زندگی کے ان اڑھائی الوں کے سربستہ راز جو میرے سینے میں دفن ہیں اگر میں افشا کروں گا تو ایک اتھل ل سی مچ جائے گی، مجھے اس بات پر فخر حاصل ہے کہ میں نے بخشی صاحب کی کوٹھی ارہ کر شیخ محمد عبداللہ اور ان کے خاندان پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں

نے شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹی ثریا کو بدنامی کے دلدل میں گرنے سے بچایا ہے۔ ثریا ان دنوں بخشی صاحب کی بیٹی شمیمہ کے ساتھ کانوینٹ میں پڑھتی تھی وہ کبھی کبھار بخشی صاحب کی کوٹھی پر آکر شمیمہ کو اپنے ساتھ لیکر اکھٹے کالج جاتی تھیں۔

اسی دوران روگناتھ وارکو نے ثریا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کا پروگرام بنایا۔ انہوں نے ثریا کو بتایا کہ شمیمہ نے تمہیں میرے کمرے میں انتظار کرنے کو کہا۔ ثریا نے اس کی باتوں پر اعتبار کیا اور وہ شمیمہ کے کمرے میں جاکر اُن کا انتظار کرنے لگی۔ میں جانتا تھا شمیمہ کب کی کالج جا چکی ہے لہذا میں چوکنّا ہوگیا۔ روگناتھ وار کو جو اکثر یہیں رہا کرتا تھا۔ جب تمام کوٹھی کا جائزہ لینے کے بعد اُوپر آیا تو وہ میری موجودگی سے سخت بوکھلایا وہ مجھے نیچے جانے کے جتن کرنے لگا۔ لیکن میں نہ جانے والا تھا نہ گیا۔ روگناتھ وار کی اس وقت واقعی ساری سُدھ بُدھ کھوئے ہوئے تھے۔ جب وہ اسی حالت میں میری پرواہ کئے بغیر شمیمہ کے کمرے میں گیا تو ان پر مایوسی کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

ثریا یہاں تھی نہیں۔ اُن کو میں نے صورت حال سے آگاہ کرکے پہلے ہی کوٹھی کی دوسری طرف کھسکا دیا تھا۔ قریب قریب ایسا ہی کھیل جب سری کنٹھ رینہ پلیڈیم سینما کے مالک کی بیٹی اوشا سے کھیلنا چاہا تو میں نے رینہ صاحب کا پلان ناکام بنادیا۔ ثریا کے بعد اوشا نے اس کوٹھی پر کبھی قدم بھی نہ رکھا اسی دوران جموّں میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تو بخشی صاحب جموّں روانہ ہوگئے۔ انہوں نے وہاں سے دو جوان بہن بھائی اشرف اور زینب کو سرینگر بھیج دیا۔ جن کے والدین اور دوسرے بہن بھائی فساد میں قتل ہوئے تھے چونکہ ان کا اور کوئی زندہ ہی نہیں بچا لہذا ان کا مناسب انتظام ہونے تک بخشی صاحب نے اُن کو اپنی کوٹھی پر رہنے کے لیے بھیجدیا اور ٹیلی فون پر مجھے ہدایت کردی کہ میں ان کی دیکھ بھال کروں۔

زینب جوان اور بڑی خوبصورت لڑکی تھی اس کا بھائی ان سے عمر میں چھوٹا تھا دونوں بڑے دُکھی تھے فساد میں ان کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ بخشی صاحب جب کچھ دنوں کے بعد جموّں سے سرینگر آئے اور ان بہن بھائیوں کے لٹنے کی داستان نوٹ کرنے لگے۔ تب میں نے دیکھا وہ اپنی زندگی کے شب وروز باضابطہ نوٹ کرتے تھے۔ انہوں نے کوئی ڈیڑھ سو صفحات کی نوٹ بک مکمل کرلی تھی جس کو

فرصت کے وقت میں پڑھا کرتا تھا۔ بخشی صاحب نے بتایا یہ دونوں بہن بھائی مناسب انتظام ہونے تک یہیں رہیں گے تو میں نے انکار کیا۔ بخشی صاحب نے وجہ پوچھی تو میں نے ثریا اور اوشا کے واقعات سنا کر انہیں ششدر کردیا۔ میں نے بخشی صاحب کے سامنے صاف صاف کہدیا۔ آپ کا ذاتی نائی رام لال زینب کے بارے میں بُری نیت رکھتا ہے۔ بخشی صاحب نے اگلے روز ان دونوں کو کسی کے سپرد کردیا۔

بخشی صاحب کی کوٹھی پر جب میں نے ایک کے بعد ایک کو اپنا دشمن بنادیا تو میرے خلاف ایک جال بُنا گیا۔ چنانچہ اس کوٹھی پر میں نوکری کے لیے اپنی مرضی سے آیا تھا لیکن زدوکوب کرکے نکال دیا گیا، مجھ پر جو الزام لگایا گیا وہ ایک بُہتان تھا۔ اس کوٹھی سے نکل کر میری زندگی میں ایک تبدیلی آگئی، مجھے ایسا لگا گویا کسی بادشاہ کو گدّی سے اُتار دیا گیا ہو۔

اب میں بیکاری اور بیروزگاری کے ایام کاٹنے لگا۔ تعلیم کے معاملے میں تو سمجھو میں اَن پڑھ ہی تھا کیونکہ میڈل کی تعلیم کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں نے اُردو کے ساتھ انگریزی اور ہندی گھر پر ہی پڑھی۔

بیکاری اور بیروزگاری سے تنگ آکر اکثر تنہائی میں رویا کرتا تھا ۱۹۵۳ء میں جب شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کیا گیا تو بخشی غلام محمد نے بیکاروں کے لیے پیس بریگیڈ فورس بنائی، تیس روپے ماہانہ تنخواہ کو مدّنظر رکھ کر میں نے بھی اس میں نام لکھوایا لیکن صرف تین مہینے تک یہاں رہ کر اس ادارے کو خیرباد کہدیا۔ کیونکہ امن بریگیڈ کے نام پر یہ جماعت اپنے ہی لوگوں کی پگڑی اچھالنے پر مامور تھی، مجھ سے یہ برداشت نہ ہوسکا اور چلتا بنا۔

بیکاری کی دنیا میں در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد پھر دکان کھولی جب اس سے کوئی گزارہ نہ ہوسکا تو بادامی باغ کنٹونمنٹ میں نوکری کی جستجو کی جو بار آور نہ ہوسکی، جنگلات کی طرف سے کوہِ سلیمان میں درخت لگوانے کے لیے چند روز تک مزدوری کی لیکن یہ کام مجھے راس نہ آیا۔

پودوں کے لیے گڑھے مجھ سے کھودے نہیں جاتے کیونکہ برسوں کی بیماری نے مجھ سے ساری قوت چھین لی تھی، یہاں سے میرنگ واپس آیا تو پھر روزگار کی تلاش میں رہا۔

۱۹۵۷ء میں علی شاہ مصدر کی سفارش پر محکمہ زراعت میں ڈیلی وزیج لگا۔ یہاں چھٹیوں کو چھوڑ کر روزانہ ایک روپیہ ملتا تھا۔ چند مہینوں تک ڈیلی وزیج رہنے کے بعد ایک سالہ ٹریننگ کورس کے لیے منتخب کیا گیا۔ ٹریننگ سے فارغ ہو کر میری پوسٹنگ ضلع اسلام آباد میں سیر کانلی گنڈ کی نرسری میں ہوئی۔ جب مجھے باضابطہ آڈر دے کر سیر کانلی گنڈ کی نرسری میں بھیج دیا گیا تو مجھے لگا گویا میں ایک بڑی ٹریننگ کے بعد فائر ان جا رہا تھا۔ سیر کانلی گنڈ میں سرکاری نرسری جنگل کے نزدیک ایک پہاڑی پر بنائی گئی تھی۔ ابتدا میں میں نے گاؤں میں ڈیرہ جمایا، بعد میں دوسرے ملازموں کے ساتھ نرسری کے کوارٹر میں شفٹ کیا، ۱۹۵۷ء کے سیلاب کے آثار باقی تھے۔ اور مہنگائی کمر توڑ رہی تھی۔ لوکل ملازمین چھٹیوں کے بعد اپنے اپنے گھر جاتے تھے۔ میرے ساتھ ہارون کا عبدالغنی تھا ہم اکثر کوارٹر میں ہی رہتے تھے۔ کسی روز جب کھانا نہیں ہوتا تو مکی کی پھلیاں کھلیانوں سے لے آتے تھے۔ اور ان پر ہی گزارہ کیا کرتے تھے۔

یہاں ایک ہی گھرانے کی دو بہنوں سے میرا معاشقہ ہوا، دونوں بہنیں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے لیے مجھے اپنانے لگیں۔ ان کی ماں سمجھ رہی تھی میرا معاشقہ ان کی چھوٹی بہن سے ہے۔ لہٰذا وہ اس کو اکثر بن سنوار کر رکھتی، میرے آنے پر وہ اکثر اس کے بال کھولتی اور مجھے ان کا انگ انگ ایسے دکھاتی گویا وہ میرے سامنے اپنی بیٹی کی نمائش کر رہی ہو۔

اسی دوران ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ایک تیسری شادی شدہ لڑکی مجھے اپنے دام میں لانے لگی نرسری کی طرف جاتے ہوئے وہ اکثر میرا پیچھا کیا کرتی تھی۔ ایک روز اس نے میرا پیچھا کرتے ہوئے اخروٹ کے ایک درخت کے پاس جا لیا۔ اور اپنے دل کا حالِ اظہار کرنے لگی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس سے رخصت ہوا، شام کو چھ بجے کے قریب جب میں سودا سلف لانے گاؤں آ گیا تو ایک جانے پہچانے شخص نے مجھے بتایا صبح جب ...... تمہارے ساتھ اخروٹ کے درخت کے پاس باتیں کر رہی تھی تو اس کا شوہر درخت پر سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔ تمہارے جاتے ہی اس نے اپنی بیوی کی مار پیٹ کی اور گھر لا کر اسے طلاق دیدی اسی وقت دوسرے شخص نے ۲۸ سو

روپے ادا کر کے اسے حاصل کر لیا اور اسے اپنی منکوحہ بنا لیا۔ احساس کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے صبح سے شام تک ایک عورت کا طلاق بھی ہوا اور دوسرا نکاح بھی، میں اضطراب کے عالم میں گشت لگاتے لگاتے وہاں تک گیا جہاں وہ بیاہی گئی تھی۔ اتفاق سے جب میں اس کے در سے گزرا وہ کھڑکی پر آئی اور خاموش زبان میں میرے لیے بہت کچھ کہہ گئی۔

پورے ایک سال کے بعد میں سیر کانلی گنڈ سے راج باغ سری نگر کی نرسری میں تبدیل کیا گیا۔ یہاں اخراج پورہ کے پاس ہمارا کوارٹر تھا۔ صبح اور شام کے وقت اخراج پورہ کی بعض عورتیں اور لڑکیاں گھاس نکالنے نرسری میں گھس آتی تھیں۔ چونکہ سرکاری نرسری سے گھاس وغیرہ نکال کر لینا ممنوع تھا لہٰذا ان عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ ہماری اکثر مڈبھیڑ ہو جاتی، کئی ہمیں دام فریب میں لے آتیں اور کئی مسکراہٹ سے کام لیتیں۔

ایک روز ایسا ہوا کہ میں نے ایک لڑکی کی ٹوکری چھین لی اور اس ٹوکری کو میں اپنے کوارٹر کے کمرے میں بند کرنے کے لیے لیا وہ منت زاری کر کے ٹوکری واپس کرنے کے لیے میرے پاؤں پڑنے لگی۔ جوں جوں وہ میری منت سماجت کرنے لگی میں اکڑتا رہا اور جب میں کوارٹر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو وہ باہیں پھیلا کر میرے سامنے حایل ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور میرے اندر کا شیطان ان آنسوؤں اور اس کی گریہ زاری کو کوئی اہمیت نہیں دے سکا۔ میں نے اسے ایک جھٹکا دیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا وہ ایک دم سیڑھیوں پر لیٹ گئی اس نے بڑی پھرتی سے اپنے گیسو میرے پاؤں پر ڈال دیئے۔ مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میرے ہاتھ سے ٹوکری گری، میں اندر کمرے میں آ کر ششدر سا ہو کر رہ گیا۔ میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی اور اس کے بعد میں نے گھاس نکالنے والی خواتین اور لڑکیوں کو نہ کبھی روکا اور نہ کبھی ان کا سامنا کیا میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا اب میں یہاں نہیں رہوں گا چنانچہ ڈائریکٹر اگریکلچر مسٹر جی ایم بٹ (آج کل اوقاف اسلامیہ کے نائب صدر ہیں) ان کی سفارش سے راج باغ نرسری سے تبدیل کر کے محکمہ زراعت کے شعبہ انٹومالوجی کی لیبارٹری میں بحیثیت لیبارٹری اٹنڈنٹ تعینات کیا گیا۔ کیڑے مکوڑے کی اس ریسرچ

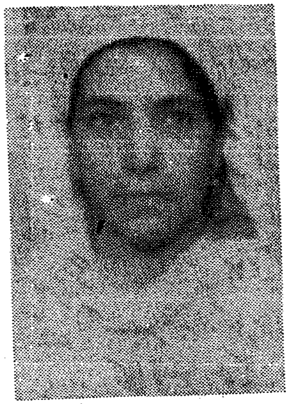
لیبارٹری میں، میں نے بڑی لگن سے کام کیا۔

میری دلچسپی اور لگن نے مجھے ریسرچ کرنے پر مامور کیا۔ یہاں ہمارے انٹو مالوجسٹ رتن لال شرما تھے جو جموں کے رہنے والے تھے۔ اس کے اسسٹنٹ سری نگر کے گردھاری لال منشی اور رشید احمد ملک تھے۔ کیڑے مکوڑے کی لائف سیکل نوٹ کرنے میں میری مہارت سے انٹومالوجسٹ اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے مجھے کام کرنے کے لیے مجھکو ڈھیل دیدی، چنانچہ اس کام میں جو مہارت میں نے دکھائی اس کو مدنظر رکھ کر میرے آفیسر نے مجھے لیبارٹری اسسٹنٹ بنانے کی سفارش کی۔ کچھ مدّت کے بعد مجھے اگریکلچر ادر سیر کی ٹریننگ کے لیے منتخب کیا گیا۔ ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد فیلڈ میں کچھ مدّت گذارنے کے بعد مجھے انٹومالوجی کی بائیلوجیکل کنٹرول کی لیبارٹری میں لایا گیا۔ یہاں ہمارے سربراہ رشید احمد ملک تھے۔ یہاں میں نے چھوٹے جراثیم PARASITE کو لائف سیکل نوٹ کرنے اور ان کو مائیکرو اسکوپ کی مدد سے سلائٹ پر برزارو کرنے میں جو مہارت دکھائی اس نے مجھے اس سیکشن کے آفیسرس کی نظروں میں اونچا کیا۔

اسی دوران میں نے علی گڈھ کے اردو بورڈ سے ادیب کا امتحان پاس کیا اس خیال سے کہ میں انگریزی کا پرچہ پاس کر کے میٹرک سرٹیفکٹ حاصل کر سکوں میں نے گھر میں انگریزی کی تیاری شروع کی۔ پھر اچانک میرا پرانا آپریشن اتنے برس گزرنے کے بعد فیل ہوگیا میری بائیں پسلی سے پیپ بہنے لگا تو گھر میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ انہی دنوں ہمارے محلے کے ایک نامور شخص ڈپٹی کمشنر محمد رجب کے بڑے بیٹے ڈاکٹر مسعود احمد امریکہ سے واپس آکر سری نگر کے نرسنگ ہوم میں تعینات ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر مسعود کی والدہ کا میری والدہ کے ساتھ ایک طرح کا دوستانہ تھا۔ میری ماں نے مجھے ڈاکٹر مسعود کے پاس لیا تو انھوں نے مجھے فوری طور پر نرسنگ ہوم میں انڈور کرایا اور ڈاکٹر گردھاری لال سے میرا دوبارہ آپریشن ہوا آپریشن کے دوران میں بالکل ہوش میں تھا۔ مجھے یاد ہے جب ڈاکٹر نے میری بائیں پسلی کی چیر پھاڑ کی تو اسی وقت پاور چلا گیا، ڈاکٹر اور دوسرا عملہ جو اس باختہ ہو گئے۔ آخر گیس جلا کر روشنی کا انتظام کیا

گیا۔ لیکن اس دوران میرا کافی خون بہہ گیا۔ یہاں میں کوئی دس دنوں تک رہا اور رخصت کیا گیا۔ ڈاکٹر مسعود نے نرسنگ ہوم کا سارا خرچہ برداشت کر کے ہمیں زیربار احسان کیا۔ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے کیوں کہ ہارٹ اٹیک سے وہ امریکہ میں وفات پا گئے ہیں۔

اس دوبارہ آپریشن کے کارن میں کئی مہینوں تک لاغر رہا۔ اس لیے تعلیم کا خواب دھرے کا دھرا رہ گیا۔ صحت یاب ہو کر جب میں دوبارہ ڈیوٹی دینے لگا تو اسی دوران گنز کھڈ بکدل کے ایک گھرانے میں میری منگنی ہوئی۔ اس موقعہ پر جب سسرال والوں کی طرف سے میرے لیے ایک نئی سائیکل آئی تو میں پھولے نہیں سمایا۔ آج کل موٹر کاریں حاصل کرنے والے اتنے خوش نہیں ہوتے ہوں گے جتنا میں سائیکل پا کر خوش ہوا کیونکہ میرے پاس والد کی جو ٹوٹی پھوٹی سائیکل تھی وہ ناکارہ ہو گئی تھی۔ نئی سائیکل پر دفتر جاتے ہوئے میں یقیناً ہوائی گھوڑوں پر سوار ہوا کرتا تھا۔ ایک سال کے بعد میرے انکار پر یہ منگنی ٹوٹ گئی۔



(مسز شبنم قیوم)

میرے ایک قریبی دوست علی محمد گلکار کی بڑی بہن نے میرے کانوں میں یہ بات ڈال دی کہ تمہاری منگیتر قد کی چھوٹی ہے۔ اس انکشاف نے سخت بددل کر دیا، چنانچہ معاملہ اُلجھ گیا اور نوبت علیحدگی تک آگئی۔

١٩٦٥ء میں میری شادی بربرشاہ کے حبیب اللہ بٹ کی بیٹی سے ہوئی اس شادی میں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہو گیا۔ شادی کے صرف چند روز قبل جب میں دعوتی کارڈ تقسیم کر رہا تھا کہ جواہر نگر میں پروفیسر عبدالقادر سروری کے گھر سے نکل کر راستے میں ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا۔

اس ایکسیڈنٹ کا زیادہ ذمہ دار میں ہی تھا۔ یا یوں کہیے کہ اس کا خالق میں ہی تھا۔ کیچڑ اور خون میں لت پت نیم بیہوشی کے عالم میں جب ڈلگیٹ پر اپنے قریبی دوست کی فرم "وائی آرٹ" پر آیا تو انہوں نے مجھے دوسروں کی مدد سے گھر پہنچا دیا۔

میری حالت دیکھ کر جہاں شہنائیاں بج رہی تھیں وہاں صفِ ماتم بچھ گئی۔ میری مرضی کے خلاف صرف چند روز کے لیے شادی رکوائی گئی۔

شادی کے ڈیڑھ برس بعد میری بیٹی ہوئی۔ اگلے برس ایک اور بیٹی ہوئی، ابھی یہ سات آٹھ ماہ کی تھی کہ مجھے پہلی بار دہلی جانے کا موقعہ ملا۔

اس دوران میرے کئی آرٹیکل اور افسانے میگزینوں میں آ چکے تھے "نگارش" امرتسر کے ایڈیٹر نے اپنے میگزین کا "کشمیر نمبر" نکالنے کا فیصلہ کیا اور مجھے اس کا انچارج بنا دیا۔ میرے ذریعے اس کا مواد حاصل کرنے کا اشتہار دے کر ایک طرح سے انہوں نے مجھے بہت بڑا اعزاز بخشا۔

میں بڑی لگن سے اس بارے میں کام کرنے لگا۔ اور کشمیر کے بارے میں ایسا مواد حاصل کیا کہ اگر یہ نمبر منظرِ عام پر آتا تو مجھے بہت پہلے عزّت و شہرت مل گئی ہوتی۔ اس نمبر کے منظرِ عام نہ آنے میں میری اپنی غلطی کا بھی دخل ہے۔

جب میں "کشمیر نمبر" کے لیے بیشتر مواد حاصل کر چکا تو اسی دوران "عارض" ڈائجسٹ دہلی کے ایڈیٹر اور مالک عبدالمنّان سرینگر تشریف لائے انہوں نے سرینگر کے اوڈین ہوٹل میں میری دعوت کی اور میرے سامنے "عارض ڈائجسٹ" کے "کشمیر نمبر" کا پلان رکھ دیا۔ انہوں نے "عارض" ڈائجسٹ کا پرچہ میرے سامنے رکھا تو میں چونک پڑا۔ کئی رنگوں میں فوٹو آفسٹ پر چھپا پا گیا یہ پرچہ یقیناً دیدہ زیب تھا اور میرا دل چاہا کہ میں کشمیر نمبر کا سارا مواد اسی پرچہ کے ذریعہ منظرِ عام



بیٹا : شاہنواز قیوم



بیٹی
شگفتہ
قیوم

پر لاؤں۔ چنانچہ "نگارش" کے لئے حاصل کیا گیا سارا مواد جب میں نے اگلی بیٹھک میں ان کے سامنے رکھ دیا تو منان صاحب کے گویا رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے مجھے اس کا معقول معاوضہ دینے اور آج سے ہی "عارض" ڈائجسٹ کا مدیرِ اعزازی بنانے کا اظہار کیا اور میں نے "کشمیر نمبر" کی فائل ان کے حوالے کر دی۔

انھوں نے اگلے پرچوں میں مجھے مدیرِ اعزازی کے طور پر پیش تو کیا لیکن کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا، معاوضہ کی مجھے اتنی غرض نہیں تھی جتنا کہ یہ سارا مواد منظرِ عام پر آنے کی چاہت تھی لیکن جب میرے متواتر تقاضوں کے باوجود بھی "عارض" ڈائجسٹ کا کشمیر نمبر نہیں نکل سکا تو ان سے یہ مواد واپس لینے کی غرض سے میں دہلی روانہ ہو گیا۔ چونکہ یہ میرا دہلی کا پہلا دورہ تھا۔ لہٰذا اجنبی ماحول میں جانے میں تذبذب کا شکار ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے میں سرکاری طور پر جموں پراونس کا دورہ کر چکا تھا۔ لیکن دہلی کو دیکھنے کا جو ارمان تھا وہ پورا ہو رہا تھا۔

پٹھان کوٹ سے ریل میں بیٹھ کر جب میں دہلی کی طرف روانہ ہوا تو میری عجیب حالت تھی اس سفر کے دوران خدشات اور وسوسے شاملِ حال نہ ہوتے تو نئی دنیا دیکھنے کی خوشیوں میں ڈوب ہی جاتا۔ ریل کا ماحول میرے لئے ایک بالکل انوکھا ماحول تھا۔ یہاں میرے ڈبے میں میرے ساتھ ایک کشمیری تھے جو بزنس کے سلسلے میں اکثر دہلی آیا جایا کرتے تھے میں نے دہلی کے بارے میں ان سے بہت ساری معلومات حاصل کر لیں۔ ہم صبح سویرے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اترے تو انھوں نے مجھے ساتھ رکشے میں بٹھا کر بلی ماران کے ایک ہوٹل میں لیا۔ یہاں ہم دونوں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ لیا۔ دہلی میں، میں کوئی دس بارہ دنوں تک رہا۔ اس دوران میں نے دہلی کے علاوہ آگرہ اور فتح پور سیکری بھی دیکھی اور سکندریہ جا کر اکبرِ اعظم کا مزار بھی دیکھا۔ تاج محل کو پہلی بار قریب سے دیکھ کر مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ میں یہاں اس محل کے پہلو میں موجود ہوں۔

عبدالمنان صاحب ہادی پور دہلی میں رہتے تھے۔ ان سے کئی ملاقاتیں ہوئی انھوں نے "عارض" کا کشمیری نمبر" نکالنے کی یقین دہانی کرائی تو میں نئی دنیا دیکھ کر واپس سرینگر آ گیا۔ میری حالت ایسی تھی گویا میں سکندر بن کر کوئی ملک فتح کر کے آیا تھا۔

دہلی میں، میں نے اپنی دونوں بیٹیوں کے لئے نئے ڈیزائن کے کپڑے اور قسم قسم کے کھلونے خریدے تھے۔ گھر واپس آیا تو یہاں کا ماحول بالکل عجیب اور مختلف لگا۔ میری بیوی

اور بچے یہاں نہیں تھے، پتہ چلا میری بیوی میکے گئی ہوتی ہے شام کا کھانا کھا کر جب میں ٹرنگ کھول کر شبو اور ننھی (میری دو بیٹیاں) کے کپڑے اور کھلونے نکالنے لگا تو میرا ہاتھ رک دیا گیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو میں نے دیکھا میرے والدین اور بہن بھائیوں کی آنکھوں میں آنسو ناچ رہے تھے۔ قبل اس کے کہ میں ان سے ان کے آنسوؤں کے بارے میں پوچھ لیتا۔ میری چھوٹی بہن پھوٹ پڑی وہ روتے روتے بولی "بھیا! ان کپڑوں اور کھلونوں کو بند رکھو تمہاری ننھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ ایسا سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ مجھ پر سکتہ سا طاری ہوا مجھ پر واقعی غم والم کا ایک پہاڑ سا ٹوٹ پڑا، اس وقت میری اور گھر کے دیگر افراد کی جو حالت ہوتی اس کو بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر ننھی سی جان کی جدائی کا صدمہ جو برداشت سے باہر تھا اور جو ایک گہرے زخم سے کچھ کم نہیں تھا۔ اس پر وقت نے مرہم رکھ دیا۔

دو برس کے بعد میرا بیٹا ہوا۔ اس طرح ہم نے ہم دو اور ہمارے دو پر بس کیا۔ میری بیوی کا نام یہاں سسرال میں شہزادہ رکھ دیا گیا۔ میں نے اس کو شہزادہ قیوم بنا دیا میری بیٹی شگفتہ قیوم اور شہنواز قیوم کہلاتا ہے۔

میرے تین بھائی عبدالمجید جو مجیدار جمند کہلاتے ہیں۔ نذیر احمد اور مسعود احمد ہیں۔ تین بھائیوں کے ساتھ میری پانچ بہنیں ہیں۔ سب کے سب شادی شدہ ہیں۔ مجھے پرگام پورہ فارم میں تبدیل کیا گیا۔ جب میں سرینگر سے پرگام پورہ کے لئے روانہ ہو گیا تو میں نے اپنے ساتھ بستر کپڑے اور کچھ ضروری سامان کے ساتھ مطالعے کے لئے کئی کتابیں بھی لیں۔

جب میں نے اپنے ہٹ میں کپڑے بستر اور دیگر سامان رکھ دیا اور کتابیں سجا دیں تو فارم کے مینیجر غلام رسول بقال جو اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انھوں نے میری ساری کتابیں ضبط کر لیں۔ ان کا عذر یہ تھا کہ یہاں فارم میں، میں کام کرنے آیا ہوں کتابیں پڑھنے نہیں۔ کتابیں چھن جانے سے مجھے ایسا لگا گویا میرا سارا اثاثہ چھین لیا گیا ہو، میں اس صدمہ کو بڑی مشکل سے برداشت کر سکا۔ یہاں فارم میں بود و باش کئے ہوئے ابھی مجھے ایک ڈیڑھ ماہ ہی ہوا تھا کہ میری بیوی ساس سے لڑ کر اپنے بچوں کو لے کر میرے پاس آئی۔ میری بیوی کی حالت کچھ ایسی تھی کہ مجھے اس پر رحم اور اپنی ماں کی حرکت پر غصہ آیا بجائے اس کے کہ میں ساس بہو کے جھگڑے کے محرکات دیکھ لیتا۔ میں گھر والوں سے ناراض ہوا اور اونتی پورہ میں کمرہ کرایہ پر لے کر اپنی بیوی، بچوں کے ساتھ رہنے لگا۔ اونتی پورہ میں جہدہ والی نامی ایک مقامی شخص نے اپنا پرانا اور

کا مکان میرے لئے وقف کر دیا اور وہ بھی بغیر کسی معاوضہ کے، جہدہ والی ہمارے سسرال والوں کو جانتے پہچانتے تھے لیکن اس سے بڑھ کر وہ بڑے دل والے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے مجید والی نے میرا پورا پورا ساتھ دیا۔ ان کے چھوٹے بھائی بشیر احمد جو آج کل ہارٹیکلچر میں ایک ... ہیں کبھی میری سسرال میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مجید والی کا ساتھ میرا حوصلہ بحال ... میں ممد و معاون ہوا۔ شادی کے بعد پہلی بار اپنی بیوی بچوں کو لے کر علیحدہ گھر بسانا میرے ... ین کے لئے ایک چیلنج تھا۔ میرے والدین نے اپنی کوتاہی تسلیم کر لی لیکن میں ان سے ... ناراض رہا ان ایام میں سرینگر سے قاضی نصیر الدین فرخ کی ادارت میں ماہنامہ "جھرنا" ... ہوا اپنی تخلیق اس میگزین میں چھاپنے کے لئے میں نے بھیج دی تو ایڈیٹر نے مجھے بلوا بھیجا، ... دفتر لیذیڈنسی روڈ پر واقع شیرین منشن میں تھا۔ سرینگر میں جب نصیر الدین سے ملاقات ... تو انھوں نے مجھے "جھرنا" کی ادارت میں شامل ہونے کی پیش کش کی، میں نے یہ پیش کش قبول ... لی لیکن یہ عذر بھی پیش کر دیا کہ میری ڈیوٹی چونکہ پرگام پورہ میں ہے لہذا میں ہفتے میں ایک بار سرینگر آ سکوں گا۔ نصیر صاحب نے میری تبدیلی سرینگر کرانے کا ذمہ لیا چنانچہ انھوں ... مجھے اپنے ساتھ پیر غیاث الدین کے پاس لیا جو کیبنٹ منسٹر تھے۔ پیر غیاث الدین مجھے ... پہلے سے کچھ جانتے تھے انھوں نے تبدیل کرانے کی سفارش قبول کر لی لیکن یہ تجویز بھی ... دی کہ میں ان کے ذاتی اخبار "چنار" کے لئے بھی کالم لکھوں۔ میں نے ان کی تجویز قبول کر لی ... سرینگر آ کر میں "جھرنا" کے ساتھ ساتھ "چنار" میں بھی کام کرنے لگا چونکہ گھر والوں کے ساتھ ... تھی۔ لہذا اونتی پورہ سے آ کر میں صوفی منزل میں رہنے لگا۔ یہاں جو کمرہ مجھے رہنے کے لئے ... وہ ایک کوٹھری تھی، میری پسند کا کمرہ کرایہ پہ اٹھایا گیا۔ اس طرح ایک غیر ... کے رہنے پر فوقیت دی گئی، مجھے یہ بات سخت ناگوار گزری

... کسی پرانے گھر میں کرایہ کے کمرے کی تلاش میں رہا۔ اس کا ذکر میں نے نصیر الدین کے ... کیا تو انھوں نے مجھے بٹہ مالنہ میں اپنے واقع مکان کی آفر کی، اور وہ بھی بغیر کسی معاوضہ کے چونکہ نصیر الدین کے والدین اور بھائی بہن جموں میں رہتے تھے۔ لہذا ان کا سرینگر کا مکان ... رہتا، میں نے اس مکان میں شفٹ کیا تو ایک بڑی جھنجھٹ سے گویا مجھے چھٹکارا مل ... نصیر الدین نے نہ صرف اپنا مکان میرے لئے وقف رکھ دیا بلکہ برتن اور دوسرا سامان ... استعمال کرنے کے لئے دے کر مجھے زیر بار احسان کیا

اسی دوران میں دوبارہ اپنی بیوی بچوں کو لے کر دہلی روانہ ہوا' یہاں نظام الدین کے پاس مشائخ منزل میں ہمارا قیام ہوا' دہلی کے قیام کے دوران ہم آگرہ اجمیر اور دوسرے اہم مقامات سیر کو بھی گئے۔ اجمیر سے جب ہم دہلی کی طرف آرہے تھے تو ریل میں اچانک میرے آٹھ ماہ کے بیٹے شہنواز قیوم کی حالت خراب ہوئی اُسے نمونیہ ہوگیا۔ ہم جلدی جلدی دہلی پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ ہم کو بتایا گیا کہ یہ ریل نظام الدین اسٹیشن پر تھوڑی دیر کے لئے رکے گی اس کے بعد نئی دہلی کے لئے روانہ ہوگی ہم نے نظام الدین کے اسٹیشن پر اترنے کی تیاری کی اور اپنا سارا سامان کے پاس لاکر رکھ دیا۔ شام کے سات بجے کے قریب ریل اچانک رک گئی تو ہم سے کہا گیا کہ نظام الدین اسٹیشن قریب ہی ہے لہذا تم فوراً اتر جاؤ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گاڑی سے اترنا شروع کیا پہلے بیوی بچوں کو اتارا پھر سامان اتارنے لگے کہ ریل نکل پڑی' میرا بستر ابھی ریل میں ہی تھا جب میں بستر اتارنے ڈبے میں گیا تو ریل فراٹے بھر کر چل دی اس نے کھڑے دیکھا تو ریل ایک سنسان جگہ رک کر اب بڑی تیزی سے مجھے بیوی بچوں سے جدا کر کے جا رہی تھی۔ ریل سے کودنا خودکشی کے مترادف تھا میں اتنا حواس باختہ ہوا کہ زنجیر کھینچ کر ریل گاڑی کو رکوا نہ سکا۔ ریل نظام الدین اسٹیشن پر ہی جاکر رک گئی۔ میں نے بستر اتار کر کلاک روم میں جمع کر دیا اور اسٹیشن ماسٹر سے دریافت کیا کہ یہ ریل ابھی کس جگہ پر رک گئی تھی۔ انھوں نے جو مجھے نام بتادیا یہی نام میں نے تھری ویلر کے ڈرائیور کو بتا دیا تاکہ وہ مجھے اس جگہ پر پہنچا دے' تھری ویلر میں کوئی ایک گھنٹہ تک سفر کرنے کے بعد جب اس جگہ کا نام و نشان نہیں ملا تو میں نے ڈرائیور سے پوچھا میں اتنی دور اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ نہیں آیا ہوں آپ جا کہاں رہے ہیں؟

"آپ نے جو نام بتادیا وہیں جا رہا ہوں اور وہ ابھی بہت دور ہے۔"

"جہاں پر ریل گاڑی رک گئی تھی وہاں سے نظام الدین اسٹیشن تک تو صرف دس منٹ کا فاصلہ تھا۔"

"کچھ بھی ہو آپ اپنی بیوی بچوں کو ایک ایسی ویران جگہ چھوڑ آئے ہیں جہاں سے کوئی بھی ان کو آسانی سے اٹھالے جا سکتا ہے۔ مار بھی سکتا ہے۔"

ڈرائیور کی زبانی ایسا سن کر میں حواس باختہ ہوا میں دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر ایسے آثار دیکھنے لگا جو ہماری تباہی اور بربادی کی بشارت دے رہے تھے۔ ڈرائیور نے تھری ویلر روک دیا تو مجھے اپنی بیوی بچوں کو دیکھنے بھیج دیا۔ میں ریل کی پٹری پر چلتے چلتے چیخنے

چلانے لگا اور تھری ویلر سڑک کے ذریعہ سے میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ آگے بڑھتے بڑھتے جب میں نے اپنے آگے پیچھے صرف ویرانہ ہی ویرانہ دیکھا تو ہر قدم پر نا امیدی نے مجھے گھیر لیا۔ میں اپنی بچوں کو دیوانہ وار پکارتا جا رہا تھا اور اندھیرا اپنے پر تو مجھ پر ڈال رہا تھا۔ اندھیرے میں روتے پکارتے میں ایک پل پر سے گزر گیا اس پر ٹین کی چادریں بچھی تھیں جو بالکل کھلی تھیں۔ میرا پاؤں پھسل گیا اور میں نیچے نالے میں گرتے گرتے بچ گیا۔ اگر میں اس وقت معجزاتی طور پر ڈوبنے سے بچ نہ جاتا تو اپنے بیوی بچوں کا منہ بھی نہیں دیکھ پاتا اس طرح چیختے چلاتے جب میں اس جگہ کو پہچان گیا جہاں پر میں اپنی بیوی بچوں کو رکھ چھوڑا تھا تو یہاں میں زور زور سے پکارنے لگا لیکن انسانی صورت کے کوئی آثار یہاں دکھائی نہیں دیئے۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا تو جگہ ایسی ویران تھی جو کسی بھی جاندار کو نگل سکتی' میں آگے بڑھا تو دور سے ایک کھولی دکھائی دی جہاں پر چراغ جل رہا تھا میں اس کھولی کے پاس گیا تو یہاں ایک میلی کچیلی عورت اپنی چھوٹی بیٹی کو لے کر روٹی کھا رہی تھی میں نے ان سے دریافت کیا تو وہ بولی ـــ ہاں! ایک لڑکی دو چھوٹے بچوں کے ساتھ ادھر کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ جب اندھیرا ہوگیا تو وہ میرے پاس یہاں آگئی' وہ کسی کے لئے سخت رو رہی تھی۔ اس کا چھوٹا بچہ بھی سخت بیمار تھا۔ وہ ابھی ابھی میرے بچوں کے ساتھ کہیں چلی گئی۔ لیکن کہاں گئی یہ مجھے معلوم نہیں۔

میں امید اور نا امید کی پٹری پر پھر چلنے لگا۔ چلتے چلتے میں نظام الدین اسٹیشن پر پہنچا۔ یہاں بستر لے کر پھر اپنے تھری ویلر میں بیٹھ گیا جو مجھ سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا رات کے ساڑھے دس بجے کے قریب میں اپنے ڈیرے کی طرف روانہ ہوا یہ سوچ کر کہ میں پولیس اسٹیشن جاکر رپورٹ کروں اور ان سے بیوی بچوں کی تلاش میں مدد لے سکوں' میں بستر چھوڑنے کے لئے مشائخ منزل آیا تو تھری ویلر سے اترتے ہی دو لڑکے میرے سامنے حائل ہوگئے اور ٹوٹی پھوٹی زبان میں بولے آپ ہی وہ شخص تو نہیں جس کی بیوی اور بچے چھوٹ گئے تھے۔

"ہاں ـــ ہاں میں ہی ہوں۔"

"ان کو ہم نے یہاں پہنچا دیا۔"

ایسا سن کر میں نے دیوانہ وار ان کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا ان کا بوسہ لیا اور دوڑتے بھاگتے مشائخ منزل پہنچا یہاں اپنی بیوی بچوں کو دیکھ کر مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ چند گھنٹوں کی جدائی جس نے میری بیوی کے ساتھ مجھے بھی نا امید کر دیا تھا۔ ایسا یادگار واقعہ ہے کہ جب

بھی مجھے یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں سرینگر واپس آیا تو چوروں نے میرے ساتھ نصیر الدین کا اثاثہ بھی لوٹ لیا تھا کچھ دنوں تک پولیس کے چکرّ میں پڑنے کے بعد اپنے معمولات میں کھو گیا۔

ماہ نامہ "جھرنا" جس ادارت میں قاضی نصیر الدین کے ساتھ وابستہ تھا چند شماروں کے بعد بند ہو گیا قاضی صاحب نے اپنے "جھرنا" کے دفتر کو ڈرامہ کلب میں تبدیل کیا۔ یہاں کئی ممبران بھرتی ہوئے جن میں لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل تھیں میں کلب کے ساتھ زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا البتہ یہاں میرا ایک پنڈت لڑکی سے معاشقہ ہوا جو برسوں تک جاری رہا اس نے میری منگنی کی سونے کی انگوٹھی لے کر اپنے ہاتھ میں پہن لی ایک روز اتفاق سے یہ لڑکی مجھے ریگل چوک میں اس وقت ملی جب میری بیوی ساتھ تھی ہم ایک دوسرے سے خیر و عافیت پوچھ رہے تھے کہ میری بیوی کی نظر اس انگوٹھی پر پڑی جو اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی میں پہن رکھی تھی اس لڑکی سے رخصت ہوتے ہی جب میری بیوی مجھ سے اس کی باز پُرس کرنے لگی تو میں نے اس کے سامنے سچ سچ سارا ماجرا بتا دیا۔

میں نے رفتہ رفتہ اپنی بیوی کو اپنے تمام معاشقوں سے واقفیت دلا دی اور اس وعدے کے ساتھ ان کو اعتماد میں لے لیا ــــ وہ کتاب میں اب بند کر چکا ہوں۔ میں گھر پر ہی انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی میں پڑھنے لکھنے لگا۔ میں متواتر ترقی کرتا گیا۔ آج جب کہ میں اگریکلچر اسسٹنٹ ہوں۔ ترقی کے ساتھ ساتھ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن بڑھتی ہوئی مہنگائی آمدنی پر اثر انداز ہوئی۔ جب میں ڈیڑھ سو روپے تنخواہ لیتا تھا تو ہر ماہ کئی کتابیں اور رسالے خرید لیا کرتا تھا کم از کم چھ سات رسالوں کو باقاعدگی سے منگواتا تھا جوں جوں ترقی کرتا گیا اور تنخواہ بڑھتی گئی توں توں کتابیں اور رسالے خریدنے کم کئے ایک کے بعد ایک رسالے کو منگوانا ترک کیا۔ تنخواہ پر ضروریات زندگی پوری کرنا مشکل ہو گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ جب سے شیخ صاحب نے دوبارہ اقتدار سنبھال کر سبسڈی کو کم کرنا شروع کیا ہماری مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا مہنگائی کے ساتھ ساتھ بچے بھی بڑے ہونے لگے۔ ان کو سکول میں درج کرانے کا مسئلہ پیش آیا تو سرکاری اور پرائیویٹ سکولوں کا موازنہ کرنا پڑا۔ سرکاری سکولوں میں پڑھانا نہ پڑھانا ایک ہی بات تھی۔ کیوں کہ اب یہ ہمارے زمانے کے وہ سرکاری سکول نہیں تھے جن میں طالب علموں کو بڑی لگن اور دلچسپی سے پڑھایا جاتا تھا۔ سرکاری سکولوں میں بچوں کو درج

کرنا واقعی ان کا مستقبل داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔ اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنے کے خیال سے پرائیویٹ سکولوں میں بچوں کو داخل کرانے میں ترجیح دینا پڑتی ہے۔ سو میں نے بھی ایسا ہی کیا۔

میری بیٹی کے جنم کے ساتھ ہی گھر میں ساس بہو کے جھگڑے شروع ہوئے یہ جھگڑے ایسے بھی بڑھ گئے کہ مجھے کتنی بار گھر بار کو خیر باد کہنا پڑا۔ لیکن والدین کا خیال کر کے پھر واپس لوٹ آنا پڑا۔ میں بیک وقت اپنی ماں اور بیوی کو راضی نہیں رکھ سکتا، بیوی کو راضی رکھتا تو ماں ناراض ہو جاتیں اور ماں کو اپناتا تو بیوی ناک منہ چڑھاتی اس کشمکش میں میرے کئی برس ضائع ہو گئے آخر کار بعض رشتہ داروں کے مشورہ پر میں نے علیحدہ طور پر اپنا گھر بسایا۔ مئی ۱۹۷۷ء میں میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔

میرے رشتے یا خاندان میں ایسے لوگ ہیں جو صاحب ثروت ہیں۔ اور بعض ہمارے ہم پلہ اور دو ایک ہم سے آمدنی کے لحاظ سے کم پایہ ہیں۔

میرا ننھیال جو کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا ایک حصہ خدا کے فضل و کرم سے بڑے امراء میں شامل ہوتا ہے۔ جب سے ان کا ذاتی اخبار "سرینگر ٹائمز" چل نکلا اور قبول عام حاصل کر گیا ان کی آمدنی میں زبردست اضافہ ہوا۔ اور آج ان کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی ایک آدمی تمنا کر سکتا ہے۔ میرے بڑے خالو جان حاجی غلام احمد وانی اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے دوسرے خالو محمد اسمٰعیل جواب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ہمارے ہم پلہ تھے البتہ تیسرے خالو محمد صدیق شیخ اپنی محنت مشقت سے بڑے ٹھیکہ داروں میں شمار ہوتے ہیں۔ پرائیویٹ ہوٹل کے ساتھ ان کی کئی گاڑیاں بھی ہیں۔ اپنا کاروبار خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔ شہر کے بعض امراء میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔

صوفی غلام محمد کے بغیر میرے دوسرے ماموں میڈل کلاس میں شامل ہیں۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے میرے بعض رشتہ دار صاحب ثروت ہیں، لاکھوں میں کھیلتے ہیں بڑی بڑی جائداد کے مالک ہیں لیکن میں نے کچھ ایسی طبیعت پائی ہے کہ میں کسی ضرورت مجبوری کی حالت میں کبھی ان سے ادھار مانگنے نہیں گیا۔ اگر کبھی کچھ مانگا تو غیروں سے اپنوں سے نہیں۔ ایک بار سخت لاچار اور مجبور ہو کر۔

اپنے ایک لکھ پتی رشتہ دار سے چار ہزار روپے ادھار مانگے لیکن انھوں نے خالی

جیب کا ایسا رونا رویا کہ اگر میرے پاس اس وقت کچھ روپے ہوتے تو میں انہیں دیدیتا اگلے روز یہ صاحب اپنی تمام فیملی کو لے کر اپنی کاروں میں اجمیر شریف کی زیارت کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ صاحب غریبوں کی بڑی مدد کرتے ہیں۔ آستانوں پر نذر نیاز دینے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بڑے نیک اور پارسا ہیں۔ البتہ مجھ جیسے اپنوں کی مشکل آسان کرنے میں دور ہی رہتے ہیں صوفی غلام محمد جو میرے دوسرے ماموں ہیں طبیعت کے جتنے نرم اتنے ہی تیز ہیں پل میں ماشہ اور پل میں تولہ ہیں۔ چوری چھپے غریبوں اور ناداروں کی مدد کرتے ہیں۔ لاچار افراد کی لڑکیوں کی شادی بیاہ کے موقع پر امداد کرتے ہیں۔ عید قربان پر درجن بھر بھیڑیں ذبح کراتے ہیں ایک عید پر میں نے ایک بھیڑ کی کھال اپنے لئے اٹھائی تھی جو میرے ہاتھ سے ایسے چھین لی گئی۔ گویا میری کھال اتار دی گئی ہو میرے دل کو چوٹ لگی اور اس چوٹ کی ٹیس برسوں تک رہی۔ پھر صلح صفائی ہوئی۔ ۱۹۷۵ء میں جب گورنمنٹ نے میری کتاب "یہ کس کا لہو ہے کون مرا" ضبط کر لی اور پولیس مجھے پکڑنے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھی تو سب سے پہلے میں ان کے پاس گیا تاکہ یہ مجھے حوصلہ دیں لیکن وہ مجھ پر برس پڑے، اور ایسی متنازعہ کتاب لکھنے پر میری اس لئے درگت بنادی کیوں کہ اس میں ان کے اخبار کا ایک کاتب ملوث ہو رہا تھا۔ کہیں ان کے کاتب کو اس کتاب کی کتابت کرنے پر پولیس پکڑ نہ لے جائے وہ مجھ پر قہر نازل کرنے لگے۔ میں فوراً وہاں سے بھاگ نکلا اور اس سلوک پر برسوں ان سے روٹھا رہا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے بلوا کر اپنے دفتر میں پارٹ ٹائم کام کرنے پر معمور کیا۔ میں نے آمدنی اور گزارہ مد نظر رکھ کر ان کی یہ آفر قبول کر لی لیکن صرف چھ مہینوں کے بعد میں اس ادارے سے کنارہ کش ہو گیا۔ میری اس کنارہ کشی میں ان کی تیز اور سیمابی طبیعت کا بڑا دخل تھا۔ صوفی صاحب جن کے ساتھ دوستی کرتے ہیں ان پر مر مٹتے ہیں چاہے وہ اپنے سے کم درجہ کے کیوں نہ ہوں البتہ جن سے انہیں نفرت ہو جاتی ہے انہیں کبھی معاف نہیں کرتے جب سے صاحب ثروت بن گئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، اپنے آپ کو بڑا عالم اور فاضل سمجھتے ہیں۔ میری کسی بھی تخلیق میں خوبیوں کو نظر انداز کر کے صرف خامیوں کو چن چن کر نکالتے ہیں۔ میرے بارے میں اس حد تک حوصلہ شکن ہیں لگتا ہے انہیں جلن ہو رہی ہے، لیکن ایسی بات نہیں، دراصل وہ میری تحریروں سے گھبراتے ہیں تاکہ مجھے گزند نہ پہنچے۔

صوفی صاحب بچوں کو بہت پسند کرتے ہیں ان کے ساتھ کھیلتے ہیں اور جی بہلاتے ہیں

ں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ خود بھی بچہ بن جاتے ہیں ان کے بڑے بھائی محی الدین نرم طبیعت کے مالک ہیں۔ مگر ان میں ذرا بھی دور اندیشی نہیں۔ وہ نذ ت کے ایسے قیدی ہیں جوان کی رقی میں رکاوٹ بن رہے ہیں صوفی غلام محمد کے مقابلے میں صوفی محی الدین بڑا وسیع مطالبہ مشاہدہ ور نظریہ رکھتے ہیں مگر انھوں نے اپنے آپ کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر اپنی قابلیت پر نگ سا لگا دیا ہے۔

صوفی محی الدین کے دوسرے بھائی صوفی عبدالرشید، صوفی غلام رسول صوفی بشیر احمد (جو کارٹونسٹ بشیر احمد بشیر کہلائے ہیں مختلف طبیعتوں کے مالک ہیں۔ ان میں اپنا پن موجود ہے۔

جب میں ایس۔ پی۔ سکول میں ساتویں اور آٹھویں میں پڑھتا تھا تو اردو نثر و نظم کی تابوں پر شاعروں اور ادیبوں کا نام دیکھ کر کبھی کبھار یہ خیال آتا کہ اگر یہاں پر میرا نام ہوتا یسا بھی کتنی بار ہوا کہ میں نے ادیب اور شاعر کے ساتھ اپنا بھی نام لکھ دیا۔ دل میں یہ ہوک سی ٹھتی تھی کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرا بھی نام کسی کتاب کے ورق پر ہو؟۔

جن دنوں میں کتابوں کے بغیر گھر سے سکول کے لئے نکلتا اور دن بھر دربدر پھرا کرتا مجھے خبار اور میگزین دیکھنے اور پڑھنے کا بھی موقع ملتا، صوفی غلام محی الدین اور صوفی غلام محمد جو ے ماموں ہیں ان کے ہاں ادبی کتابیں اور رسالے حاصل کر کے پڑھنے کا خوب موقع ملا۔ اسی وران اپنے ایک پڑوسی عبدالعزیز بٹ سے جو ملٹری میں صوبیدار تھے ایک کتاب پڑھنے کے لئے لی۔ اس کتاب کا نام "بہن کسی سے نہ کہنا" تھا۔ بیگم حسین سہراجی کی یہ کتاب تقسیم کے دوران ین کے ساتھ کئے گئے اتیا چار، زور زبردستی اور زنا بالجبر کے واقعات پر مشتمل ایک دستاویز ی۔ اس کتاب کو میں نے ایک بار نہیں بلکہ بار بار پڑھا۔ جب اس طرح بھی میرا جی نہیں بھرا تو نے اس ساری کتاب کو نقل کیا۔ اور اسے اپنے پاس محفوظ رکھ لیا۔ تقسیم کے دوران مظلوم ین کے ساتھ اس قسم کا اتیا چار اور زور زبردستی کے واقعات سے میرے واقعی رونگٹے کھڑے گئے اور میں اس کے خلاف احتجاج کرنے لگا زبانی نہیں بلکہ تحریری، میں نے ان ظالموں، روں اور کمینوں کے خلاف قلم اٹھایا جنھوں نے عورت ذات کو کمزور سمجھ کر اس کے ساتھ چاہا برتاؤ کیا اور اسے اپنی چاہت کے لئے ہوس کا شکار بنا دیا۔

یں نے خواتین کے ساتھ کی گئی اس زور و زبردستی کے خلاف جو کچھ بھی لکھا اس لنا دم تھا۔ تھا بھی یا نہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اسی جذبہ نے مجھے قلم کار بنا دیا۔

ابتدا میں، میں نے اسی موضوع کے مضامین لکھے۔ اس کے بعد افسانوں میں طبع آزمائی کی چند مضامین اور افسانے لکھنے کے بعد میں نے ناول لکھنا شروع کیا۔ "زندگی اور موت" کے نام سے میں نے ایک ضخیم ناول لکھا۔ اس کے بعد جب میں بخشی غلام محمد کے ہاں ملازم ہوا تو یہاں کے ماحول سے متاثر ہو کر میں نے ایک اور ناول "پرانی ڈگر نئے قدم" کے نام سے لکھا،

ان دنوں یہاں ایک مضمون یا افسانہ چھاپنا جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہ تھا۔ چنانچہ میں جو کچھ بھی لکھتا گیا۔ ان کا ذخیرہ کرتا گیا۔

اسی دوران میں نے ایک افسانہ لکھا جو میری نظر میں معیاری تھا۔ اسے میں نے دہلی یو۔پی بمبئی کے کئی رسالوں کو اشاعت کے لئے بھیج دیا لیکن ہر جگہ سے یہ واپس آیا مجھے لگا شاید ابھی مجھے افسانے کے بارے میں صحیح واقفیت نہیں، میں افسانوں کا مطالعہ کرنے لگا تو اپنے افسانے میں مجھے کوئی کمی دکھائی نہیں دی میں نے ایک بار اور کوشش کر کے اسے "نگارش" امرتسر کے لئے بھیج دیا۔ وہاں سے جب مجھے اس افسانے کے پسند کئے جانے اور قریبی شمارے میں اشاعت کا سندیسہ مل گیا تو میں خوشیوں سے پھولے نہیں سمایا۔ یہ افسانہ ابھی چھپنے بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے ایک اور افسانہ دت بھارتی کے رسالہ "تخلیق" کو بھیج دیا۔ اگلے مہینے جب یہ افسانہ "تخلیق" میں چھپ گیا تو اس کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کے اجازت نامے حاصل کرنے کے لئے کئی خطوط۔ پنجابی بنگالی، اور ملیالم کے ساتھ جب انگریزی، چینی فرانسیسی اور روسی زبان میں ترجمہ کی اجازت ناموں کے لئے خطوط آئے تو میں واقعی ہوائی گھوڑوں پر اڑنے لگا۔ میرا پہلا افسانہ چھپ کر اتنی مقبولیت حاصل کر گیا تو اس سے مجھے یقیناً حوصلہ ملا اس کے بعد افسانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہند و پاک کے مختلف رسائل اور اخبارات میں میرے کوئی سو کے قریب افسانے شائع ہوئے۔

میرا ادبی سفر جاری رہا۔ ناول اور افسانے لکھنے کے دوران مجھے میرے دوست سجود سیلانی نے ڈرامے لکھنے کی طرف راغب کیا۔ میں نے ان کا مشورہ قبول کر کے ڈرامہ لکھا۔ "یادگار" نامی ڈرامہ لکھ کر میں نے اُسے ریڈیو کشمیر کے ڈرامہ پروڈیوسر مسٹر پران کشور کو پیش کیا۔ تو انھوں نے اُسے پسند کر کے ڈرامہ "فسٹول" میں شامل کر لیا۔ اس طرح میرے پہلے افسانے کی طرح میرے پہلے ڈرامے کو جو قدر و منزلت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے اس کے بعد ریڈیو ڈراموں کا ایک سلسلہ شروع ہوا، آل انڈیا ریڈیو کے "ہوا محل" کے لئے بھی کئی جھلکیاں لکھیں

ڈراموں کے کئی انعامات بھی حاصل کر لئے سرینگر میں ٹی۔ وی۔ اسٹیشن چالو ہوا تو یہاں سے بھی میرے کئی ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہوئے ریڈیو اور ٹی وی کے بعض پروڈیوسر جب ریٹائر یا تبدیل ہوئے اور بعض نئے پروڈیوسروں میں رشوت اور فرقہ پرستی کے جراثیم داخل ہوئے تو ہم ان جراثیم سے دور ہی رہے۔ بعض پروڈیوسر جو رشوت اور فرقہ پرستی کے جراثیم سے پاک ہیں لیکن ن ڈرامہ نگاری سے کسی حد تک ناواقف ہیں وہ ڈرامہ نگار کو جاننے پہچاننے میں فرور لغزش کھاتے رہے اور ہم اس بزم سے دور ہوتے گئے۔ سرینگر دوردرشن میں اب بھی بعض پروڈیوسر ایسے ہیں جو قابلیت بھی رکھتے ہیں اور رشوت سے بھی نفرت کرتے ہیں۔ مگر ہم ہی کچھ ایسا مزاج رکھتے ہیں جو ان کے پاس بار بار جا ناپسند نہیں کرتے، جب کہ وہ اپنے در پر بار بار حاضری دلوانے میں اپنی بڑائی محسوس کرتے ہیں۔

میں نے جب بھی کسی کے ساتھ دوستی کی تو ٹوٹ کر کی، کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ علی محمد گلسکار کے ساتھ دوستی کی تو ان کے اور ہمارے گھریلو تعلقات بڑھ گئے۔ سجود سیلانی اور غیور حسن کے ساتھ دوستی ہوئی تو ہمارے گھریلو تعلقات قائم ہو گئے۔ ڈی۔ کے۔ کنول کے ساتھ دوستی ہوئی تو دونوں گھرانے قریب آ گئے۔ دیپک کنول بمبئی میں جا کر فلمی دنیا کے ساتھ وابستہ ہو گئے تو انھوں نے میری ایک کہانی پر ٹیلی فلم بنائی جو میرے سوا دوسروں کو پسند آئی۔ بحثیت ایک ادیب اور ڈرامہ نگار کے میں کلچرل اکیڈیمی کے ساتھ وابستہ رہا یہاں سے نکلنے والے "میگزین" اور دوسرے ادب و فن کے مطالعہ سے میں محمد یوسف ٹینگ کا گرویدہ ہو گیا۔ ہماری دوستی بھی گھریلو تعلقات میں بدل گئی۔

میں ناول لکھتا یا افسانہ ڈرامہ علم طور پر اس کا موضوع ہمارے سماج کا وہ تضاد ہوتا جس میں امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب بن رہا تھا۔ اقتصادی بدحالی، جور و ظلم اور جہالت کے خلاف قلم اٹھانے پر مجھے ایسا لگتا گویا میں اپنے ملک سے ان کا خاتمہ کر رہا تھا۔

ان موضوعات پر طبع آزمائی کے باوجود بھی جب اس قسم کے بدعات میں کمی آنے کے بجائے روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ تو میں اس کے لئے ان اشخاص کو مورد الزام ٹھہرانے لگا۔ جو ہمارے حکمران ہوتے ہیں جو ہم لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے بڑے بلند بانگ دعوے کرتے تو تھے مگر کرتے اس کے بالکل برعکس تھے۔ حکمرانوں کی طرف سے عوام کا استحصال لوٹ کھسوٹ اقربا پروری کو دیکھ کر میں ان کے خلاف قلم اٹھانے لگا۔

ابتدا میں وقت کے حکمرانوں کو افسانوں یا ڈراموں کے ذریعہ للکارتا رہا۔ اس کے بعد کئی مضامین میں ان کی خامیاں اور غلطیاں اُجاگر کیں۔ حکمرانوں کی طرف سے عوام کا استحصال روز بروز بڑھنے لگا۔ تو میں ان کے خلاف ایک طرح سے صف آرا ہوگیا۔ میں سیاسی موضوعات پر آرٹیکل لکھنے لگا تو اس طرح وقت کے حکمرانوں کے ساتھ میری ڈائریکٹ مقابلہ آرائی ہوئی۔

۱۹۷۵ء کے "کشمیر ایکارڈ" تک میں انتظار میں رہا کہ کبھی صالح گورنمنٹ آئے گی تو وہ ریاست سے بدعنوانی، بدنظمی، کنبہ پروری اور لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ کرے گی۔ لیکن ایکارڈ کے ساتھ صالح گورنمنٹ کے نام پر ہمیں جو کچھ دیکھنے کو ملا اور جس حکومت سے ہمارا واسطہ پڑا اس نے بے شمار برائیوں کے ریکارڈ توڑ کر ہر طرح سے ہمیں مایوس کیا۔

میرے اندر مساوات کا مادّہ بھرا پڑا ہے اور مساوات کا میں کچھ زیادہ دلدادہ رہا ہوں کسی کو زیادہ امیر اور کسی کو زیادہ غریب دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔

میں ہرگز فرشتہ نہیں بلکہ ایک انسان ہوں، ایک انسان کی جتنی بھی کمزوریاں ہیں وہ مجھ میں بھی ہیں اگر یہ کہا جائے کہ یہ کمزوریاں مجھ میں کچھ زیادہ ہی ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ اگر وہ جھونپڑی میں رہتا ہے تو مکان کے خواب دیکھتا ہے اور جو مکانوں میں رہتے ہیں وہ کوٹھیوں کی چاہت کرتے ہیں۔ جس کے پاس سواری کے لئے کچھ بھی نہیں وہ سائیکل کی تمنا کرتا ہے اور جو سائیکل رکھتا ہے وہ سکوٹر کے خواب دیکھتا ہے اور سکوٹر رکھنے والا کار کی خواہش رکھتا ہے۔ چیتھڑے لٹکانے والا اچھے کپڑے پہننے کی تمنا کرتا ہے اور جس کے پاس اچھے کپڑے ہوں وہ قیمتی کپڑے پہننے کا متمنی ہوتا ہے ــ انہی تمناؤں کا میں بھی دلدادہ ہوں ــ آخر میں بھی خود ایک انسان ہوں۔ مگر ہمارا نظام حیات اس قسم کے خواب دیکھنے کی مناہی نے کی تمنائیں رکھنے کی اجازت نہیں دیتا ان کے اس بغیر اجازت سوچنے، تمنا کرنے اور خواب دیکھنے کی مناہی نے مجھے واقعی ایک طرح کا باغی بنا دیا۔ چونکہ میں کوئی لیڈر نہیں اور نہ ہی مقرر ہوں لہذا میں اپنی بغاوت کا اظہار صرف قلم سے کرتا ہوں۔ بحیثیت ایک انسان کے مجھ میں بہت ساری کمزوریاں ہیں، جب میرے پاس پیسے کم ہوتے ہیں یا نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں تو کنجوس بن جاتا ہوں۔ خرید و فروخت کی ادائیگیوں میں کنجوسی سے کام لیتا ہوں لیکن جب جیب بھاری ہوتا ہے تو حاتم طائی بن جاتا ہوں جوا کھیلنا میری سرشت میں ہے ہی نہیں زندگی میں کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سگریٹ کبھی پیتا تھا لیکن چھوڑ دیا۔ شراب سے بے حد نفرت

کرتا ہوں۔ دوستوں کی صحبت میں اسے دو ایک بار ضرور چکھا ہے لیکن اس کی تاثیر دیکھ کر فیصلہ کرنا پڑا کہ اس شئے کو پینے والے سے بڑھ کر اور کوئی بے وقوف ہو ہی نہیں سکتا۔

میں باتونی بھی نہیں ہوں۔ لیکن قلم چلانا خوب جانتا ہوں۔ عام طور سے دل کی بھڑاس قلم سے ہی نکالتا ہوں۔ ظلم و جبر ناانصافی اور بے دردی کے خلاف میرا قلم اکثر سخت بے چین رہا کرتا تھا ڈر اور خوف کی میری سامنے کوئی وقعت نہیں۔ بزدلی میری ڈکشنری میں ہے ہی نہیں، میں ہمیشہ سچ بولنے کا دعویدار بھی نہیں۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی جھوٹ بھی بولنا پڑے تو کوئی دریغ نہیں۔ میں خواہ مخواہ سچائی اور پارسائی کا دعویٰ کر کے فرشتہ بننے کا دلدادہ نہیں بلکہ انسان ہی رہنا چاہتا ہوں۔ اور تمام کمزوریوں کے ساتھ انسان ہونے پر مجھے یقیناً فخر ہے۔ البتہ میں ان انسانوں میں ہرگز نہیں ہوں جو کسی مفاد یا مصلحت کے لئے اپنا ذہن، ضمیر سوچ اور اپروچ کسی کے پاس گروی رکھ دے۔ میں اپنے آپ کو ایماندار بھی نہیں مانتا مگر میرے پاس جتنا بھی ایمان ہے اُسے دنیا کی کوئی دولت خرید نہیں سکتی۔

میں کبھی بھی کوئی بات کہنے سے ہرگز نہیں ہچکچاتا چاہے اس کے کہنے سے مجھے گزند پہنچنے کا امکان کیوں نہ ہو، میں کوئی بات لکھنے سے اس لئے نہیں رک سکتا کہ اس کا اظہار مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔

میری کوئی بھی تحریر کبھی نفع یا نقصان کے ترازو میں نہیں تل سکے گی۔ میں اس زمرے میں شامل ہوں جسے صبح و شام آٹے دال کا بھاؤ معلوم کرنا پڑتا ہے ضروریات زندگی پورا کرنے کے لئے لوہے کے چنے چبانے پڑ رہے ہیں۔ بیوی بچوں کی بیشتر فرمائشوں کا قتل کر کے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ غریبی اور امیری کی تفاوت مجھے اکثر کچوکے دیتی رہتی ہے اصل میں یہی تفاوت مجھے میں تمام برائیوں کی جڑ مانتا ہوں۔ اس کو دور کرنے کے خواب دیکھا کرتا ہوں۔ چونکہ خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں اس لئے اکثر انہیں بغیر روک ٹوک کے دیکھتا ہوں۔

منڈوں پر جادۂ شب کے مسافر خوش رہیں
سرفروشوں کی خونیں قبا واپس کریں

ضمیمہ

خدا کی مخلوقات میں یہ قوت صرف انسان کو حاصل ہے کہ وہ اپنے ماحول کے رحم وکرم پر نہیں رہتا بلکہ اس کو بدلنے کی کوشش میں برابر لگا رہتا ہے اور بسا اوقات بدل بھی دیتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان اس زمین پر اپنے ارادے، قوت عمل اور جدوجہد سے ہی تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے۔
"سقراط"

اپنی مختصر داستان سنانے کا مقصد محض یہ ہے کہ آپ کو میرے بارے میں پتہ چل سکے کہ میں کس سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہوں، میں کس حیثیت کا مالک ہوں اور میری اقتصادی و مالی حالت کیا ہے، میں اپنے آپ کو پڑھا لکھا شخص بھی نہیں مانتا لیکن بعض ایسے جانے پہچانے ان پڑھوں جیسا بھی نہیں ہوں جو مجھ سے ہزار درجہ بہتر زندگی گذار رہے ہیں۔ لاکھوں میں کھیلتے ہیں میرے بعض جانے پہچانے مجھ سے کمتر سمجھ بوجھ رکھنے والے لکھ پتی بھی ہیں اور کروڑ پتی بھی۔ ان کی اور میری اس تفاوت کے درمیان قسمت کا ضرور دخل ہے لیکن قسمت کے ساتھ ہمارے اس نظام حکومت کا جو سرتاپا راشی ہے۔ لہٰذا وہ راشیوں کے ساتھ ذرہ بھر بھی چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہمارے یہاں جو امیر ہیں وہ زیادہ امیر ہیں۔ اور جو غریب ہیں وہ زیادہ غریب ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ ہمارے حصہ میں کبھی بھی ایسی حکومت نہ آئی جو حب الوطنی رکھتی ہو، جسے یہاں کے عوام کی درد ہو، جسے عام لوگوں کی فلاح و بہبود کی فکر ہو، اس کے برعکس جس کسی حکومت کے ساتھ ہمارا واسطہ پڑا وہ اول اور آخر دھاندلی اور لوٹ کھسوٹ، فتنہ پروری اور جائز و ناجائز طریقے سے دولت کمانے میں یقین رکھتی دکھائی دی نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے چالیس سالوں میں کوئی بھی کام

ڈھنگ کا نہیں ہوا، ۱۹۵۰ء میں جو کام ہاتھ میں لئے جاتے تھے وہ اب لئے جانے لگے۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد اگر ہمارے حصے میں صالح گورنمنٹ آئی ہوتی تو آج اتنے برس گذرنے کے باوجود بھی ہم ضروریات زندگی سے محروم نہیں ہوتے۔

میں کبھی کبھار سوچا کرتا ہوں کہ شاید ہمارے مقدر میں صالح حکومت کبھی نہیں لکھی ہے۔ لہٰذا جو بھی آکر ہم پر حکومت کرے ہمیں آمنا و صدقنا کرنا چاہئے لیکن میں زیادہ دیر تک اس خیال پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر میں اپنے دل کو یہ تسلی نہ دوں کہ کبھی نہ کبھی ضرور کوئی صالح گورنمنٹ ہمیں دیکھنے کو ملے گی تو میں ضرور پاگل ہو سکتا ہوں کیونکہ میں نے کچھ ایسی طبیعت پائی ہے کہ مجھ سے کھلے عام لوگوں کا یہ استحصال دیکھا نہیں جاتا۔ حکومت وقت کے طفیل ریاست کے ڈیڑھ دو ہزار گھرانے جو دولت کا بیشتر حصہ اپنی طرف سمیٹ رہے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے عام لوگوں کی ترقی میں جو رکاوٹ آرہی ہے اس کو محض میں اس لئے برداشت کرتا جاتا ہوں کہ کبھی نہ کبھی ان کے دل پھر جائیں گے

بے شک ہماری ریاست میں لوگ کاروں اور جیپوں میں دوڑتے رہتے ہیں بیشک ہماری شاہراہوں پر دوسرے بڑے شہروں کی طرح ٹریفک بھی جام ہو جاتا ہے۔ لیکن ساٹھ لاکھ لوگوں کی آبادی میں ایک لاکھ لوگ اگر کاریں یا جیپیں رکھتے ہوں تو یہ کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ مجھے اس بات سے ہرگز انکار نہیں کہ ہمارا معیار زندگی بڑھا ہے اور کافی بڑھا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہماری آبادی کا بیشتر حصہ اب بھی غربت میں ہے۔ بعض لوگ میرے اس انکشاف سے ضرور حیران ہوں گے۔ ہمارے شوپیان کے کچھ علاقوں میں آج بھی لوگ چاول کے بدلے آلو کھاتے ہیں۔ آزادی کے چالیس سال گذرنے کے باوجود ہماری ریاست کے کنڈی علاقوں میں رہنے والے جو زندگی گزارتے ہیں ماروتی کاروں میں گھومنے والے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ غربت تنگ دستی اور مفلسی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو لوگ اقتدار سے وابستہ ہو کر، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو کر چرس بیچ کر، جنگلات کو لوٹ کر، ٹھیکیداری میں بے ایمانی کر کے کارخانوں میں مزدوروں کا خون چوس کر، تجارت میں بے انتہا منافع کما کر اور کاروبار میں ناجائز طریقہ اپنا کر بغیر کسی محنت کے آسانی سے بے شمار دولت کماتے ہیں۔ وہ غربت اور بھوک کا تصور بھی

بھی نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی ہیں جو کھلم کھلا لوٹ مچا رہے ہیں۔ میری نظر میں ایک پٹواری ہے جس نے سرکاری اور مہاجرین کی زمین فروخت کر کے اپنے لئے لاکھوں کی پراپرٹی بنائی، جنگلات کا ایک فارسٹر جو پہلے زنجیرا ورڈی۔ ایف۔ او بنا اور صرف سات سال کے عرصے میں کروڑ کی پراپرٹی کا مالک بنا، ایسی سیکڑوں ہی نہیں ہزاروں مثالوں سے میرا خون کھول اٹھتا ہے اور میں بھی ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہوں بغیر محنت کے جائز اور ناجائز طریقوں سے دولت کمانے والوں کے ہاں شادی بیاہ کے موقعوں پر کوئنٹلوں کے حساب سے گوشت اور سینکڑوں کی تعداد میں مرغے پکائے جاتے ہیں جس کا ایک چوتھائی حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اتنے (نقصان دہ) سالن پکائے جاتے ہیں جتنے جانور بھی نہیں کھا سکتا۔ نتیجہ کے طور پر پکے ہوئے چاول گوشت وغیرہ ضائع ہو کر سڑکوں اور گلی کوچوں میں ڈالنا پڑتا ہے اور جس کو گائے بیل بھیڑ اور بکریاں کھا کر اکثر حالات میں لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

میں کشمیری ہونے کے ناطے کشمیر میں ایسی دعوتوں میں شریک ہو چکا ہوں۔ جہاں پکے ہوئے چاول، گوشت، سبزی، پلاؤ اور مختلف قسم کی چٹنیاں اسقدر ضائع ہوتے دیکھ چکا ہوں جس کا تخمینہ میں نے دس ہزار سے لیکر پچیس ہزار تک لگایا ہے۔

کشمیری قوم وازہ وان کے مایا جال میں ایسی پھنس گئی ہے۔ جہاں سے اس کے بچ نکلنے میں کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ ستم تو یہ ہے کہ مختلف قسم کے پکوانوں میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ذمہ دار اوّل اور آخر ناجائز طریقوں سے دولت کمانے والے لوگ ہیں۔

ریاستی عوام کے مقدر میں لکھی گئی دیگر بدقسمتوں میں سے ایک بجلی کی کمی اور دوسری پانی کی نایابی ہے۔ آزادی کے چالیس سال گذارنے کے باوجود ہماری ریاست آج بھی بجلی اور پانی کی دو اہم ضرورتوں سے محروم ہے۔

چالیس سال کا عرصہ آج کے اس مشینی دور میں ایک آدمی کی ساری زندگی پر محیط ہے۔ اس طرح آزادی کے دوران جنم لینے والے جو آج تک مر چکے ہیں وہ بجلی اور پانی کی محرومی کے حکومت کے اعمال نامے لیکر گئے اور جا رہے ہیں۔ اندازہ کیجئے ۱۹۴۷ء میں مرے ہوئے لوگ جب ۱۹۸۷ء کے مردوں سے پوچھ رہے ہوں گے۔ کیا وہاں بجلی اور پانی

کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اور یہ ان سے کہتے ہوں گے نہیں — وہ مسئلہ کچھ زیادہ ہی الجھ گیا ہے تو انہیں کتنی حیرت ہوتی ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی جب انھیں یہ بھی سننے کو ملتا ہو گا کہ اب کشمیر کی ساری پیداوار آہستہ آہستہ نایاب ہوتی جا رہی ہے اور ہم ایک انڈے کے لئے بھی پڑوسی ریاستوں کے محتاج ہیں۔ انہیں شخصی راج اور عوامی راج کا موازنہ کرتے ہوئے یقیناً افسوس کا اظہار کرنا پڑ رہا ہو گا۔

جب ہمارا ملک آزاد ہوا اور ہمارے رہنماؤں نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا تب ہمارے ایک پڑوسی ملک نیپال کے پاس میونسپلٹی بھی نہ تھی۔ آج نیپال کی طرف دیکھ کر ہماری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں جبکہ ہماری سڑکیں اور گلی کوچے ہماری کم ظرفی کا رونا رو رہے ہیں۔ وادی کشمیر میں سورنج اور ڈرینج کا ناقص انتظام ہماری ناقص کارکردگی کا کھلا ثبوت ہے — ہمارے حاکموں اور انجینئروں نے نالہ مار کو پاک و صاف کرنے کے بجائے اس کا نشان مٹا کر سرینگر کی انفرادیت اور اس کی خوبصورتی مٹا کر بنجر دماغ ہونے کا جو مظاہرہ کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

جھیل ڈل کو خشکی میں تبدیل ہوتے دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا گیا تو اس کے بچاؤ کے لئے ایک پلان بنا کر یقیناً قابل داد کام کیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی جھیل ڈل کے بیچ میں سڑک نکالنے کی منظوری دیکر ایک ایسا گناہ کیا گیا جس کا کفارہ نہیں ہو سکے گا۔ ایک انگریز ڈاکٹر مسٹر پیٹرسن کا کہنا ہے نالہ مار کو دفنانا اور جھیل ڈل کے بیچ میں سے سڑک نکالنا ایک ایسا قصور ہے جس کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا، ہمارے ملک میں کوئی اس قسم کا قصور کرتا تو اس کے خلاف قتل کے الزام میں سزا ہو جاتی۔

کشمیر جیسی خوبصورت وادی جو ساری دنیا میں مشہور ہے اس کے شہر اور دیہات میں جو چیز عام ہے وہ ہے کیچڑ — کیچڑ بدبو اور سڑاند۔

کشمیر میں اندھا دھند طریقے پر میوہ باغات بنائے گئے۔ خشک زمین پر باغ لگوانے کا کوئی جواز تھا لیکن آبی زمین کا جو ستیاناس ہوا وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ جن باغوں میں آج ہم ٹنوں کے حساب سے میوا سڑتے گلتے دیکھ رہے ہیں۔ کبھی یہ باغ ہمارے لئے خوشبودار چاول اگاتے تھے۔

کشمیری عوام نے اپنے لیڈروں اپنے حکمرانوں کے طفیل کشمیر کی انفرادیت ختم

کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی پیداوار کو ناپید کر کے گویا ایک کارنامہ انجام دیا۔ آج حالت یہ ہے کہ کشمیر میں رہنے والوں کے لئے ضروریات زندگی کی تمام چیزیں باہر سے منگوانی پڑ رہی ہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ کشمیر جو ساری دنیا میں میٹھے پانی کے لئے مشہور ہے وہاں آج چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں باہر کا بند بوتلوں میں BISLIRY پانی استعمال ہوتا ہے کوئی تقریب ہو یا فنکشن باہر سے لایا گیا یہی پانی پیش کیا جاتا ہے۔

ہمارے لئے سب سے شرمناک بات یہ ہے کہ کشمیر جیسے سبزہ زار کو راجستھان کی ریت گوشت کے لئے بھیڑ بکریاں فراہم کرتی ہے۔

چاول، سبزی، دودھ، گوشت، دالیں، چارہ حتیٰ کہ انڈا تک اپنا یہاں دستیاب نہیں ہے۔

ہماری پیداوار ناپید ہونے کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ہمارے حصہ میں جو بھی حکمران آیا اس نے غیر پیداواری اسکیموں پر آمدنی کا بیشتر حصہ صرف کیا بغیر کسی پلاننگ کے اندھا دھند طریقے پر ایسے کام ہاتھ میں لئے جن کو کچھ مدت کے لئے ملتوی رکھا جا سکتا، پچھلے چالیس سال میں زیادہ دھیان بلڈنگیں بنانے پر دیا گیا اور یہ بلڈنگیں بنانے کے لئے ان سے ایسی خطائیں سرزد ہوئیں جن کی تلافی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ میں یہاں پر تین ایسی جگہوں کی نشاندہی کر رہا ہوں جن سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ہمارے حکمرانوں کے ساتھ ہمارے انجینئر عجائب گھروں میں رکھنے کے قابل ہیں۔

آپ جا کر لال منڈی، راج باغ اور نشالیمار فارم کے وہ سرکاری رقبہ جات دیکھئے جہاں کبھی پھل اور پھول کھلتے تھے، سبزیاں پیدا ہوتی تھیں لیکن آج پتھر لوہا اور سیمنٹ دکھائی دے رہا ہے۔

بجائے اس کے کہ ان سرکاری فارموں میں جہاں ہر سال دو دو چار چار بلڈنگیں بنائی جاتی ہیں سکریٹریٹ کے طرز کی ایک ہی بلڈنگ بنائی جاتی تو اکوموڈیشن کی ضرورت پوری ہونے کے ساتھ بیشتر زمین ضائع ہونے سے بچ جاتی، ان کا عذر یقیناً مسترد کرنے کے قابل ہے کہ ہمارے پاس اتنے فنڈس نہیں ہوتے کہ ہم سرکاری فارموں میں سکریٹریٹ طرز کی بلڈنگ بنا سکیں۔ اس لئے کہ کسی فارم میں ایک کے بعد ایک بلڈنگ بنانے کے بجائے وہ سکریٹریٹ طرز کی ایک بلڈنگ کی پہلے سال ایک سٹوری بنا سکتے تھے اور

اس کے بعد فنڈس کے حساب سے ہر سال اس میں ایک ایک سٹوری کا اضافہ کر سکتے تھے سکریٹریٹ طرز کی تین چار اسٹوری کی بلڈنگ میں نہ صرف لاگت کم آجاتی بلکہ زمین کا بیشتر حصہ مختلف کوارٹروں اور بلڈنگوں کے نیچے قبرستان جیسا نہ بن جاتا۔ اس کے لئے میں وہ دماغ کہاں سے لاؤں جو یہاں کے حکمرانوں کے ساتھ ارباب اختیار کے سر میں فٹ کر دوں۔ ریاست میں اندھا دھند طریقے پر فنڈس کا استعمال یہاں کی ترقی میں واقعی ایک رکاوٹ ہے لیکن سب سے بڑی رکاوٹ مرکزی سرکار کی وہ معاندانہ پالیسی ہے جو اس نے ریاست کے لئے اپنا رکھی ہے۔

برصغیر کی تقسیم کے دوران جب کشمیر کا کسی ڈومینین کے ساتھ ابھی پورا الحاق نہیں ہوا تھا، اسی وقت شیخ محمد عبداللہ نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا "ہندوستان میں رہ کر کشمیر ترقی نہیں کر سکے گا۔ ہندوستان کے حکمران کشمیر کی ترقی میں زیادہ دلچسپی نہیں لیں گے۔ ان کے پاس کئی ایسی ریاستیں اور صوبے ہیں جو کمزور اور محتاج ہیں لہٰذا یہ ہماری طرف کم ہی توجہ دیں گے۔"

شیخ صاحب کا یہ نظریہ غلط بھی نہیں تھا کیونکہ آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ مرکزی سرکار کی طرف سے ہمارے ساتھ امتیاز برتا جا رہا ہے۔ دوسری ریاستوں کے مقابلے میں ہمیں مرکز سے جو گرانٹ ملتی ہے وہ گرانٹ کم اور قرضہ زیادہ ہوتا ہے بعض ریاستوں کو ستر فیصد سے ۹۰ فیصد گرانٹ اور دس فیصد سے تیس فیصد تک قرضہ ملتا ہے جبکہ ہمیں ستر فیصد قرضہ اور تیس فیصد گرانٹ ملتی ہے۔ اس طرح گرانٹ کا بیشتر حصہ قرضہ اور اس کی سود کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے۔

پاور کے بارے میں بھی مرکزی سرکار ہمیں انسانوں میں شمار نہیں کرتی، ہماری ریاست کا پاور وہ اپنے استعمال میں لاتی ہے اور ہمیں اندھیرے میں ڈبو دیتی ہے۔

انسان کی یہ ایک کمزوری ہے اور فطرت انسانی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ وہ جھونپڑی میں رہ کر گھر کا خواب دیکھتا ہے اور گھروں میں رہنے والے کوٹھیوں کا خواب دیکھتے ہیں جتنا ملے اور جیسا ملے اس پر قناعت کرنے والے بہت ہی کم یعنی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگرچہ ان قناعت کرنے والوں میں، میں بھی شامل ہوں لیکن میری یہ تمنا ضرور ہے کہ میں آج جو کچھ ہوں اس سے کچھ بڑا ہو جاؤں لیکن میری طرح مجھ جیسی حیثیت رکھنے والوں اور

پھر غریبی کی سطح سے بھی نیچے زندگی گزارنے والوں کی تمنائیں اور آرزوئیں وہ لوگ ملیا میٹ کر رہے ہیں جو کار، کوٹھی، لان رکھ کر ضروریات زندگی اور عیش و عشرت کے سامان میں خود کفیل ہیں لیکن اس کے باوجود بھی دولت کمانے میں ہر جائز و ناجائز طریقے استعمال میں لا رہے ہیں۔ اس طرح وہ غریبوں اور مفلسوں کی ترقی میں زبردست رکاوٹ بن رہے ہیں۔ ایک انسان کو جس چیز کی جتنی ضرورت ہو اگر اس سے کہیں زیادہ دستیاب ہو پھر بھی وہ اور زیادہ کی جستجو کرے، اس جستجو میں وہ دوسروں کا حق مارے یہ میرے لیے ناقابل برداشت بات ہے چونکہ میرے پاس مارشل لاء جیسے اختیارات نہیں کہ ان اختیارات کا استعمال کر کے میں ان سے باز پرس کروں، لہٰذا میں قلم اٹھانے پر ہی اکتفا کر رہا ہوں۔

ہمارے حاکم ان کے رشتے دار اور حواری، سرمایہ دار، کارخانہ دار، مل مالک، بھٹہ مالک، چرس کے بیوپاری اور ایسے ہی دوسرے احباب جو اپنی نسل در نسل کے لیے لاکھوں اور کروڑوں کی جائیداد رکھنے کے باوجود بس نہیں کرتے بلکہ ناجائز طریقوں اور حد سے زیادہ منافع کما کر دولت حاصل کرنے کی ایک دوڑ میں لگے ہوئے ہیں ان کی طرف دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے ـــ میں صالح اور ایماندار حکومت کے انتظار میں یہ آس لگائے بیٹھا ہوں کہ کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں ایک انقلاب ضرور آئے گا جب ان سے زائد دولت اور جائیداد چھین لی جائے گی اور ضرورت مندوں میں تقسیم کی جائے گی ـــ ایک انقلاب کے بعد ایسا صرف ایماندار اور صالح گورنمنٹ کر سکتی ہے اور میں اسی کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔

چونکہ مجھے ایک امید سی ہے کہ کبھی نہ کبھی ملکی سطح پر ایک انقلاب آئے گا جو ملکی اور ریاستی سطح پر صالح گورنمنٹ کو برسر اقتدار لائے گا لہٰذا میں اس صالح گورنمنٹ سے اپنی ریاست کی نمایاں تبدیلی کی توقع رکھ سکتا ہوں۔ بس اس کے لیے ایک لائحہ عمل چھوڑ جاتا ہوں جس سے یقیناً یہاں کرپشن کی جڑیں کٹ سکتی ہیں لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ کنبہ پروری کی بیخ کنی ہو سکتی ہے۔ اور بے شمار برائیوں کا اگر خاتمہ نہیں تو کمی ضرور آ سکتی ہے۔

میں صالح گورنمنٹ کے لیے ۲۵ نکات کا ایک چارٹر یا لائحہ عمل رکھ رہا ہوں

جس پر کام کر کے یہاں کایا پلٹ سکتی ہے۔

(۱) ۱۹۵۰ء کا نشانہ مقرر کر کے اس وقت سے اب تک (یعنی صالح گورنمنٹ کے برسر اقتدار آنے تک) جس کسی کی بھی حکمرانی یہاں رہی ہو اس کی اور اس کے ساتھ وابستہ وزیروں اور ان کے رشتے داروں کی ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی دولت اور پراپرٹی (زمین جائیداد) قومی ملکیت میں لی جائے۔

(۲) ایسی حکومتوں کے ساتھ وابستہ وہ عہدیدار جو لوٹ کھسوٹ کے مرتکب ہوئے ہوں اپنی اپنی حکومت سے ناجائز مراعات حاصل کر چکے ہوں ان سے یہ سبھی مراعات چھین لی جائیں اور ان کی ناجائز مراعات سے حاصل کی گئی جائیداد ضبط کر کے قوم کے لیے وقف کی جائے۔

(۳) ریاست میں ہر ایک پشتینی باشندے کے لیے دولت، زمین اور جائیداد کی حد مقرر کی جانی چاہیئے۔ ایسے لوگوں کی دولت، زمین جائیداد قومی ملکیت میں لی جائے جو حد کو پار کر گئے ہوں۔

(۴) محکمہ نزول، محکمہ مال اور محکمہ جنگلات کے ۱۹۵۰ء کے ریکارڈ کے مطابق (حالانکہ اس ریکارڈ میں زبردست قلم زنی کی گئی ہے) وہ ساری زمین جو نصف صدی سے حکمرانوں نے ان کے رشتہ داروں اور حواریوں نے لیز اور ہیر پھیر سے لے کر اس میں بندربانٹ کی ہے واپس کی جائے۔ اس قسم کی ساری زمین پر جو بھی تعمیرات ہوٹل، کوٹھیاں، بنگلے اور باغات ہوں وہ سب کی سب بغیر کسی معاوضہ کے حاصل کر کے قومی ملکیت میں لی جائیں۔

(۵) جائیداد مہاجرین پر جو بندربانٹ کی گئی ہے اور اسے اپنی ملکیت بنا کر اس کی خرید و فروخت کی گئی ہے اس کو اپنی اصلی صورت میں واگزار کیا جائے۔

(۶) ۱۹۵۰ء کے ریکارڈ کے مطابق تمام دیہات میں کاہچرائی کی زمین قابض داروں سے چھین کر اس پر جو بھی تعمیرات یا درخت وغیرہ ہوں ان کو بغیر کسی معاوضہ کے چھڑا لیا جائے۔

(۷) انجمن نصرۃ الاسلام اور اوقاف اسلامیہ کو ایک ادارہ بنا کر اس کی آمدن خرچ کو سال کے اختتام پر منظر عام پر لایا جائے اور اس پر باضابطہ آڈٹ کا

اطلاق ہو، ان دونوں اداروں پر نیشنل کانفرنس اور مجلس عمل کا کنٹرول ختم کر کے اسے ایک بورڈ کے سپرد کیا جائے تاکہ ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔

(۸) وادی میں ایک مسافر خانہ بنایا جائے جہاں بغیر کسی بھید بھاؤ اور فرقہ کے کمزور طبقے اور کم آمدنی والے اندرونی اور بیرونی مسافر تین دنوں تک نہ صرف قیام کر سکیں بلکہ ان کے کھانے پینے کا انتظام ایک ٹرسٹ کے منتظمین کی طرف سے ہو، ٹرسٹ کے لیے "نوائے صبح" کمپلکس اور رہبر واعظ منزل کے پاس دوکانوں کی آمدنی بغیر کسی امتیاز کے وقف رکھ دی جائے۔ نیز اس آمدنی سے ایسے مریضوں کا علاج کیا جائے جن کو ملک اور ملک سے باہر جانے کے لیے بھیک مانگنے کے لیے مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔

(۹) ریاست میں تعلیمی نظام تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ اس کو سدھارنے کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس پر مستقبل کا دارومدار ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں تعلیمی معیار کو مدنظر رکھ کر ہی ٹیچروں کی اپوائنٹمنٹ اور ترقی واگزار کی جائے۔ ایسے استادوں کو نوکری سے برخاست کرنے یا انہیں کسی دوسرے محکمہ میں تعینات کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کیا جائے جو طلبا اور طالبات کو تعلیم دلانے میں لاپرواہی کے مرتکب ہوں۔ گرما اور ہارویسٹنگ کی چھٹیاں منسوخ کی جائیں۔ سرما کی چھٹیاں صرف پرائمری کلاسوں تک محدود ہوں۔ باقی کلاسوں کے لیے طلباء اور طالبات کے لیے گرمی کا اسی طرح انتظام ہو جس طرح عام ملازموں کے لیے ہوتا ہے۔

(۱۰) تمام پرائیوٹ سکولوں کے لیے بچوں کی فیس جو مناسب ہو مقرر کر کے یہاں کے ٹیچروں کو معقول معاوضہ ادا کرنے کا انتظام کیا جائے۔ ان سکولوں کی آمدنی وخرچ جانچ پڑتال کیا جائے اور کھلے بندوں لوٹنے سے ان کی روک لگا دی جانی چاہیے۔ اسی طرح پرائیوٹ ہسپتالوں اور نرسنگ ہوموں کی فیس، رہائش اور وغیرہ کی آمدنی کی جانچ پڑتال ہوا اور ان پر آمدنی ٹیکس کا اطلاق ہو۔

(۱۱) سرکاری اور نیم سرکاری ملازموں کو مرکزی سطح پر تنخواہ اور مراعات دیے جائیں۔ سرکاری نوکریوں کے لیے رشوت اور سفارش کے بجائے مستحق اور غیر مستحق کا خیال رکھا جائے۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو مدنظر رکھ کر ملازم کی عمر کی حد ۵۰ سال

مقرر کی جائے اور اس کے بعد معقول پنشن اور مراعات دے کر اسے رخصت کیا جائے۔ ملازمت کی معقول اور آسان گنجائش ہونے تک ایسے افراد کو ملازمت دلانے سے انحراف کریں جن کے گھر کے بیشتر افراد ملازم رکھنے میں ترجیح دی جائے جن کے گھر کے بیشتر افراد بے کار اور بے روزگار ہوں۔ ذات پات دھرم اور مذہب کے لحاظ کے بغیر ریاستی اور مرکزی دفاتر میں مستحق امیدواروں کو جگہ دی جائے۔

(۱۲) پیشہ ورانہ تعلیم اور ٹیکنیکل ایجوکیشن میں شامل کرنے کے لیے مستحق اور غیر مستحق کا خیال رکھا جائے۔ میڈیکل انجینیرنگ اور ایسے دوسرے اداروں کے لیے ٹریننگ حاصل کرنے والوں کو لاکھوں روپیے کی ترازو میں تولنے کا سسٹم ختم کر دیا جائے۔

(۱۳) بجلی اور پانی جیسی دو اہم ضرورتوں کو پورا کرنے میں پہل کی جائے اور اس بارے میں نہ صرف ریاست کو خود کفیل بنایا جائے بلکہ بجلی کی فروخت کا بھی بندوبست کیا جائے۔

(۱۴) جنگلات کو بے دردی سے کاٹنے سے اجتناب کیا جائے۔ ٹمبر اور بالن کی فراہمی کا معقول انتظام کیا جائے۔ جنگلات کو بڑھاوا دینے کے لیے جہاں ایک درخت کو کاٹا جائے وہاں چار پودے لگائے جائیں۔

(۱۵) جھیل ڈل میں تمام مکانوں اور ہوٹلوں کو منہدم کیا جائے۔ جھیل میں ہاؤس بوٹوں، شکاروں اور ڈونگوں کے بغیر اور کوئی تعمیری شے رکھنے نہ دی جائے۔ جھیل کے اندر مکانوں میں رہنے والوں کو کہیں اور بسایا جائے۔

(۱۶) ریاست کے سبھی ضلعوں اور تحصیلوں میں سبزیوں کی کاشت کے فارم بنائے جائیں۔ وادی کے لوگوں کو سبزی کے بارے میں خود کفیل بنایا جائے۔ نیز اس بات کا بھی خاص خیال رکھا جائے کہ لوکل سبزی باہر کی سبزی سے مہنگی نہ ہوں کیونکہ عام طور پر لوکل سبزی باہر کی سبزی کی نسبت دو گنی سے چار گنی بیچی جاتی ہے۔

(۱۷) گوشت، دودھ، مرغ اور انڈوں کی پیداوار میں اس قدر اضافہ کیا جائے کہ ریاست ان کے بارے میں خود کفیل ہو

(۱۸) ریاست میں عموماً اور وادی کشمیر میں خصوصاً ڈرینج اور سورتیج کا جو ناقص انتظام ہے اس کو درست کیا جائے اور تمام سڑکوں اور گلی کوچوں کی حالت سدھارنے میں زبردست دلچسپی کا مظاہرہ کیا جائے۔

(۱۹) رہائشی بستیاں بسانے کے لیے باضابطہ پلاننگ کرکے مختلف سائز کے پلاٹ بنوا کر ان پر ایک ترتیب کے ساتھ ایک ہی طرز کے مکانات اور کوٹھیاں بنانے کا اطلاق ہو۔

(۲۰) زمین و جائداد کی خرید و فروخت میں ایک ٹریبونل کا دخل رکھا جائے تاکہ ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے والے سرمایہ دار غریبوں کا حق نہ ماریں غریبوں اور مڈل کلاس کے لوگوں کیلئے زمین جائیداد خریدنے کی گنجائش رکھی جا سکے۔ سرمایہ کے بل پر منہ مانگے داموں پر جس رفتار سے سرمایہ دار زمین و جائداد خرید رہے ہیں۔ با اختیار ٹریبونل کی طرف سے اس رفتار میں روک لگا دی جائے۔ ضروری نہ ہو کہ مالک جس شخص کو زمین جائداد بیچنا چاہتا ہو ٹریبونل اسی کو دے۔ اس طرح ایک لاکھ کے زمین کے ٹکڑے پر پانچ لاکھ کی آفر نہیں آسکے گی۔

(۲۱) ضروریات زندگی فراہم کرنے کا مناسب بندوبست کیا جائے۔ عوام کو مل مالکوں، کارخانہ داروں تعمیراتی میٹریل فراہم کرنے والوں کے چنگل سے چھٹکارا دلایا جائے، ضروریات زندگی اور تعمیراتی کاموں میں کام آنے والے چیزوں کی قیمتیں مقرر کی جانی چاہییں۔ چونکہ کورپٹ حکومت چیزوں کی قیمت مقرر کرنے اور پھر اس پر عمل کرانے میں اس لیے ناکام رہی کیونکہ وہ ان سے چندہ کے نام پر رشوت لیکر ان کے سامنے خود کو بے وقعت بناتی ہے لہذا اس کے فیصلہ بھی بے وقعت ہو جاتے ہیں اس کا خاص خیال رکھا جائے۔

(۲۲) سادہ شادی اور رکم پکوان کے لیے ایک لائحہ عمل بنایا جائے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف نہ صرف تادیبی کارروائی ہو بلکہ ان پر ٹیکس کا ایسا بوجھ ڈالا جائے جس کو وہ ساری عمر اتارتے رہیں۔ کونٹلوں کے حساب سے گوشت پکوانے والے لکھ پتی اور کروڑپتی ہو سکتے ہیں لہذا ان کے آگے پیچھے کی انکم کے بارے میں پوری چھان بین ہونی چاہیے۔

(۲۳) کشمیر میں کشمیری زبان کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے ایسا کوئی دشمن بھی دوسری زبان سے نہیں کر سکتا۔ مادری زبان کے ساتھ اردو کو اس کا حق دلانے میں خصوصی توجہ مبذول کریں۔ مادری زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے بارے میں آج تک جو لاپرواہی برتی گئی اس کا تصور کرکے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ جہاں مادری زبان سکڑتی جا رہی ہے وہاں اگلی جنریشن میں مشکل سے کوئی ایسا شخص ملے گا جو میری ان تاریخی کتابوں کو پڑھ سکے گا۔ لہذا اس کا ازالہ کیا جائے۔

(۲۴) ریاست کے کاریگروں، فن کاروں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور آرٹسٹوں کی حالت سدھارنے انہیں ان کا حق دلانے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں قابل قدر رول ادا کیا جائے

(۲۵) ڈوگرہ راجواڑوں نے ریاست کی حالت کو مدِ نظر رکھ کر یہاں سٹیٹ سبجکٹ قانون کا اطلاق کیا تھا۔ اس پر مکمل طور پر عمل کیا جائے اور ایمان داری سے اس بات کی جانچ پڑتال کی جائے کہ پچھلے پچاس سال سے کس نے ناجائز طور پر سٹیٹ سبجکٹ حاصل کی ہے جعلی سٹیٹ سبجکٹ حاصل کرنے والوں کو ریاست بدر کیا جائے اور ایسی سٹیٹ سبجکٹ اجرا کرنے والے اگر حیات ہیں تو انہیں سخت سے سخت سزا دی جائے ہاں اگر کوئی ان میں حیات نہیں ہے تو ان کی جائداد ضبط کرلی جائے۔ ایسا کرنے سے دوسرے عبرت لے سکیں۔

۲۵ نکات کا یہ چارٹر یا لائحہ عمل مرتب کرکے جو میں آپ کے سپرد کرکے صالح اور ایماندار حکومت کے لیے رکھ رہا ہوں۔ اگر میرے جیتے جی یہ تمنا پوری نہیں ہو سکی تو میرے بعد جب کبھی یہاں ایمان دار اور صالح حکومت کا وجود ہوگا تو میری طرف سے یہ امانت ان کو لوٹا دینا تاکہ جنم جنم کا استحصال ختم ہو سکے۔ یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے جب پاپ کی ناؤ بھر جائے تو وہ ڈوب جاتی ہے۔ ہر ابتدا کی ایک انتہا ہے اور عروج کے بعد زوال بھی آجاتا ہے۔

برصغیر کی آزادی کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر میں حکمرانوں کے ہاتھوں عوام کا جو استحصال شروع ہو چکا ہے وہ تب سے اب تک برابر جاری ہے اور انقلاب آنے

تک جاری رہے گا۔ مرکز میں جس کسی پارٹی کی حکومت رہی انھوں نے ہمیشہ یہاں کے عوام کے بجائے حکمرانوں کو اپنایا۔ عوام کے بارے میں لاپرواہ ہونے کا نتیجہ کبھی نہ کبھی وہ ضرور بھگتیں گے۔

اُن کے ہوش آنے تک اگر میں زندہ رہا تو میں خود ان سے ایسی صالح حکومت مانگوں گا جو یہاں میرے ۲۵ نکات پر عمل کرنے کا آغاز کرے گا اگر تب تک میں نہ رہا تو صالح حکومت کی جدوجہد آپ کے ذمہ ہوگا۔ میرے ان ۲۵ نکات پر عمل کر کے یہاں کے عوام کا اعتماد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان نکات کو روبہ عمل لانے میں جتنی دیر ہوگی اتنا ہی مرکز اور ریاست کے درمیان دوری رہے گی۔

حرفِ شیریں، سیدگل، کانٹوں کی ہلکی سی چبھن
جانِ من لایا ہوں میں یہ ارمغاں تیرے لیے

شبنم قیوم

نوٹ:۔ "کشمیر کا سیاسی انقلاب" اکتوبر ۱۹۸۲ء سے آگے پر کام جاری ہے۔ انشاء اللہ اس کو کتابی شکل میں وقتاً فوقتاً آپکی نظر کیا جائے گا۔